TIGHT BINDING

سلسلۂ مطبوعات نمبر ۱۴۲

آثارِ جمال الدین افغانی

از

قاضی محمد عبد الغفار

شایع کردہ

انجمن ترقیٔ اردو (ہند) دہلی

سنہ ۱۹۴۰ء

خانصاحب عبداللطیف نے "لطیفی پریس لمیٹڈ" دہلی میں چھاپا
اور
منیجر انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) نے دہلی سے شائع کیا

فہرست مضامین

آثارِ جمال الدین افغانی

عنوانات	صفحات

دورِ ثانی

دورِ ثالث و آخر



اِن اوراق کی ترتیب میں میرا ذوقِ عمل دو محترم اور محبوب دوستوں کی یاد سے منسوب ہے

مسیح الملک حکیم اجمل خاں

اور

ڈاکٹر مختار احمد انصاری

وہ دونوں اپنے پروردگار کی رحمتوں کے آغوش میں

محوِ خوابِ ابد ہیں!۔

افغانی می گوید

عالمے در سینۂ ماگم ہنوز
عالمے در انتظارِ قُم ہنوز

عالمے بے امتیازِ خون و رنگ
شامِ او روشن تر از شامِ فرنگ

لایزال و وارداتش نو بنو
برگ و بارِ محکماتش نو بنو

باطنِ او از تغیّر بے غمے
ظاہرِ او انقلابِ ہر دمے

اندرونِ تست آں عالم نگر
می دہم از محکماتِ او خبر!

(اقبال - جاوید نامہ)

"قوم ارادے سے بنتی ہے نہ کہ توہمات سے"

(اتاترک)

بیس سال سے زیادہ گزرے جب پہلی دفعہ میں نے جمال الدین افغانی کا نام حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب مرحوم و مغفور کی زبان سے سُنا تھا۔ ستمہائے روزگار نے عرصہ تک اجازت نہ دی کہ اِس مجاہد کی عجیب و غریب زندگی کے حالات کی جستجو کرتا۔ تاہم وہ ایک نقش دل میں محفوظ تھا اور عرصہ تک حالت یہ رہی کہ جہاں کہیں افغانی کے متعلق ایک حرف سُنا اُس کو لکھ لیا اور جہاں کہیں کچھ پڑھا اُس کو محفوظ کر لیا۔ غرضیکہ عمر کے اِس گزرے ہوئے زمانے میں افغانی کے نام کے ساتھ ایک عجیب روحانی واسطہ پیدا ہو گیا۔

۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۷ء تک میرا زیادہ وقت ممالک غیر میں گزرا۔ مسافرت میں بھی آثار جمال الدین کی تلاش کا سلسلہ اتنا ہی طویل رہا جتنا کہ سیر و سیاحت کا۔ دیارِ فرنگ سے اسلامی ممالک کی طرف آیا اور قاہرہ میں تو کچھ عرصہ صرف اسی کام میں گزرا کہ جہاں لوگ مٹی اور پتھروں کے آثارِ قدیمہ دیکھنے جایا کرتے ہیں وہاں میں نے ایک زندۂ جاوید کے آثار تلاش کیے۔ لیکن خود اپنے وطن میں سوائے چند کے تمام اسلامی آبادی کو "افغانی" کے نام سے نا آشنا پایا۔ مغرب و

مشرق سے جو کچھ میں لایا تھا وہ بھی بہت عرصہ تک پنسل سے لکھے ہوئے مسودوں کے پرزوں میں منتشر پڑا رہا اور نہ جانے کب تک یہی حال رہتا اگر ایک اور زندۂ جاوید کی محبت میرا حوصلہ نہ بڑھاتی "اجمل خاں اعظم" اب اِس دنیا میں نہیں ہیں۔ اُن کی یاد بھی ایک غافل اور ناحق شناس قوم کے دل سے محو ہو چکی ہو لیکن دلی میں قدیم تہذیب و شرافت کے اِس آخری یادگار نے اپنے نیازمندوں اور دوستوں کے قلوب میں ایک ایسا نقش چھوڑ دیا ہو جس کو دنیا کی غفلت اور بے پروائی مٹا نہیں سکتی۔ مسیح الملک مغفور کے پیہم تقاضوں نے مجھے آمادہ کیا کہ اِس تمام مواد کو جس کا ایک حصّہ خود مرحوم اسلامی ممالک سے میرے لیے جمع کرکے لائے تھے ایک مسودہ کی صورت میں مرتب کرلوں۔ وہ مسودہ بھی کم و بیش تیار ہو گیا لیکن اُسی زمانہ میں اجمل خاں کا بلاوا آگیا اور وہ اس دنیا میں اپنا کام ختم کرکے اپنے خالق کی طرف سدھار گئے۔ اُن ہی کے ساتھ میری زندگی کا ذوقِ عمل بھی ختم ہو گیا۔ شکستِ آرزو کی یہ داستان ہو جو بیان نہیں ہو سکتی۔

اجمل خاں کی رخصت کے بعد ردّی اخباروں کے تختوں میں لپٹا ہوا یہ مسودہ میرے ساتھ ساتھ خدا جانے کہاں کہاں پھرتا رہا تا آنکہ حیدرآباد میں ایک نیک بندے کے فیض روحانی نے اِس بجھتی ہوئی چنگاری کو پھر چمکا دیا اور ان کی طرف سے کچھ ایسی تحریک ہوئی کہ جس نے ان پریشان اوراق کی شیرازہ بندی کر دی۔ اِن بزرگ کے حصّہ کا اجر یقیناً خدا کے پاس ہو۔ یہ تائید غیبی نہ ہوتی تو کیا معلوم کہ یہ مسودہ کس پنساری کی دُکان پر پُڑیاں باندھنے کے کام آتا۔ بہر حال مقصد یہ تھا کہ شیخ کی زندگی کی یہ داستان اُسی جگہ مرتب ہو اور تکمیل پائے جہاں شیخ نے اپنی زندگی کے کم و بیش دو سال گزارے تھے۔ شاید اُن ہی کا یہ فیض جاریہ تھا جس نے مجھے باوجود اپنی آشفتہ خاطری کے اس کام کو انجام دینے کے لیے ایک قلبِ مطمئنہ عطا فرمایا۔

مقدّمہ

سید جمال الدین افغانی کی زندگی کا تعلق یورپ اور ایشیا کی تاریخ کی دو گزشتہ صدیوں سے اتنا گہرا ہے کہ شیخ کے اذکار کے بغیر اُن دونوں کی تاریخ یقیناً نامکمل رہے گی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اس کمی کو پورا نہیں کرسکا۔ اِس مقصد کی تکمیل کے لیے میرے مطالعہ سے بہت زیادہ گہرے اور وسیع مطالعہ کی ضرورت ہے اور کیا عجب ہے کہ کوئی صاحبِ نظر اِس موضوع پر اپنے لیے ایک وسیع تر میدان پیدا کرلے۔

سید جمال الدین افغانی کی روئداد زندگی اُس زمانہ کی سیاست کے ایک اہم گوشہ پر حاوی ہے جب ایشیا پر یوروپین استعمار پھیلتا جارہا تھا اور اُس کی گرفت کے اندر ایشیا کی سوتی ہوئی قومیں کہیں کہیں کروٹیں بدلنے لگی تھیں۔ شیخ کی زندگی کا گہرا تعلق اسلامی قوم کی بیداری سے ہے۔ لیکن اِس کے یہ معنی نہیں کہ ایشیا کی عام بیداری سے اُن کی جدوجہد بے تعلق رہی ہو۔

اسلام کے سیاسی اقتدار کا انحطاط ۱۰۰۰ عیسوی کے بعد ہی سے شروع ہوگیا تھا لیکن تیرھویں صدی میں چنگیز کے پوتے ہلاکو نے بغداد پر

ایک ایسی ضرب لگائی جس سے پھر کئی صدی تک ایشیا مین اسلامی اقتدار پنپ نہ سکا۔ یہی زمانہ تھا کہ اسپین میں بھی اسلامی قوت کے زوال نے یورپ کی سرزمین پر اسلامی اقتدار کو بہت کمزور کر دیا تاہم تُرکوں کی قدیم روایات قسطنطنیہ کے مرکز پر باقی تھیں اور عثمانیوں کی تلوار سے یورپ کی قومیں بہت عرصہ تک ڈرتی رہیں، مگر اِس اقتدار کو پہلا صدمہ ۱۷ ویں صدی کے شروع میں پہنچا جب سنہ ۱۶۰۳ء میں وینیا کی شہر پناہ کے سامنے تُرکوں کو پسپا ہونا پڑا۔ اسی نقطہ سے یورپ میں ترکیہ کے سیاسی اقتدار کا اضمحلال شروع ہوتا ہے۔

اسلامی اقتدار کے اِن دو مرکزوں کی کمزوری اور خصوصاً ترکوں کی گھٹتی ہوئی قوت کا ردِ عمل یورپ میں شروع ہوا۔ اس ردِ عمل میں استعماری رجحانات کا آغاز ۱۵ ویں صدی کے آخری چند سالوں کے دو تاریخی واقعات سے ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ راس امید کی طرف سے ہندستان جانے کا راستہ واسکوڑی گاما نے معلوم کر لیا اور دوسرے یہ کہ کولمبس "نئی دنیا" تک پہنچ گیا۔

اس کے بعد یورپ کی نظروں میں دُور دُور کے فاصلے سمانے لگے اور آباد کاری اور استعماریت اور تجارت کا یہ ایک یوروپین قافلہ تھا جس میں ہالینڈ کے لوگ آگے آگے اور اُن کے پیچھے پیچھے اسپینی اور انگریز اور فرانسیسی ہر طرف بڑھے چلے جا رہے تھے۔ سنہ ۱۶۵۰ء میں انگلستان نے ایسٹ انڈیا کمپنی قایم کی جس کی پیش قدمی سے ہندستان خوب واقف ہے۔ سنہ ۱۶۰۴ء میں فرانس نے بھی مشرقی ممالک سے تجارت کرنے کے لیے ایک کمپنی قایم کر لی۔ سنہ ۱۶۱۰ء میں ڈچ لوگوں نے

سمندروں میں نئی زمینوں اور نئے مقبوضات تلاش کرتے کرتے جزیرہ جاوا پر قبضہ کرلیا۔ ۱۶۰۶ء میں انگریزی مہم بھی وہاں پہنچ گئی۔ ۱۶۳۶ء میں انگریزی تجار چین تک پہنچ گئے۔ اور ایسٹ انڈیز میں ایک طرف انگریزوں نے۔ ایک طرف ڈچ نے اور ایک طرف فرانسیسیوں نے قبضہ کرلیا۔ سمندروں کے یہ راستے جس قدر زیادہ کھلتے گئے اور تجارتی منافع جس قدر زیادہ ہوتے گئے اُسی قدر زیادہ یورپین اقوام کو ان راستوں کی حفاظت اور اپنے بازاروں کی ترقی کا خیال پیدا ہوتا گیا اور اُسی قدر زیادہ تجارت سیاست اور سیاحی ملک گیری کی صورت اختیار کرتی گئی۔

اٹھارھویں صدی کا آغاز جبرالٹر پر برطانیہ کے قبضہ سے ہوتا ہے اور اس کے بعد تو ایک آندھی تھی جو یورپ کی طرف سے ایشیا کی طرف چلنی شروع ہوئی۔ اس آندھی کے دامن سے لپٹی ہوئی کلیسائی جماعتیں بھی تھیں جو ہندوستان، افریقہ، نیوزی لینڈ اور بحرپیسفیک کے جزایر اور بعض ایشیائی ممالک میں بھی اپنے خیمے نصب کرنے لگیں۔ تجارت کے ساتھ مسیحیت کی تبلیغ کا یہ سلسلہ دُور دُور تک پہنچا۔

۱۷۰۴ء میں جبرالٹر پر برطانیہ کا قبضہ قایم ہو جانے کے بعد فرانس نے ۱۷۱۵ء میں الجزایر اور مراقش پر قبضہ کرلیا۔ ۱۷۷۰ء میں انگریزوں نے آسٹریلیا میں اپنی نو آبادی قایم کی اور ترکی کے مقبوضات میں رُوس نے عیسائی رعایا کے حقوق کی حفاظت کا اِدّعا شروع کر دیا۔ ۱۷۷۶ء میں شمالی امریکہ میں انگریز، فرانسیسی اور ڈچ آباد کار پہنچ گئے۔ ۱۷۹۵ء میں برطانیہ نے سیلون کی قدیم حکومت کو ہٹاکر

اپنا جھنڈا گاڑ دیا۔

یورپ میں یہ ایک انقلابی زمانہ تھا اور نیپولین بونا پارٹ کے گھوڑوں کی ٹاپوں میں نہ صرف یوروپین براعظم روندا جارہا تھا بلکہ اِس آندھی کے جھونکے مصر اور شام تک بھی پہنچ رہے تھے۔ یورپ کی استعمار پسند اقوام اپنی ترقیوں میں اس طوفانی دَور کی مداخلت سے خوفزدہ ہو رہی تھیں اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا کم وبیش دو صدی کی یہ تمام جد وجہد نیپولین کے ہاتھوں برباد جائے گی۔ مگر قسمت کا پانسا استعماریت کے حق میں پڑا اور نیپولین کے خاتمہ کے بعد تجارت اور سیاست کی یہ ملک گیری پھر شروع ہوگئی۔

سنہ۱۸۰۶ء میں برطانیہ نے جنوبی افریقہ میں کیپ ٹاؤن پر قبضہ کرکے ایشیا کے بازاروں اور ہندوستان کے طول وعرض میں اپنے سیاسی اور تجارتی مفادات کی حفاظت کا پورا سامان کرلیا۔ اِسی ۱۸۱۴ء میں مالٹا پر اپنے قبضہ کا استقرار کرکے بحرروم اور مصر کی سیاست میں بھی برطانیہ نے اپنی قوّت کو زیادہ منظم کرلیا۔ پھر ۱۸۱۹ء میں عدن پر برطانوی قبضہ نے بحرہند اور بحراحمر کا یہ ایک مضبوط مورچہ قائم کر دیا۔ اب برطانوی تجارت نے سیاست کے لبادہ کو پوری طرح اپنے جسم پر لپیٹ لیا۔ چنانچہ ۱۸۴۰-۱۸۳۱ء میں فرانس کے اثرات کو مصر سے دفع کرکے وہاں بھی برطانوی "دخل" کا اعلان کر دیا گیا۔

ہر سمت میں سیاسی اور تجارتی استحکامات کو قایم کرلینے کے بعد ۱۸۳۹-۴۲ء میں برطانیہ نے چین سے ایک لڑائی لڑی اور ہانگ کانگ پر قبضہ کرلیا۔ اس واقعہ کے ایک ہی سال بعد افریقہ میں نیٹال پر برطانوی

جھنڈا سربلند ہوگیا۔

اِس عرصہ میں روس بھی یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس دَوڑ میں پیچھے رہا جاتا ہے اس لیے وہ مشرقِ بعید میں دریائے امور کے شمالی اور دریائے اسوری کے مشرقی علاقوں پر مسلّط ہوگیا۔

یہ زمانہ وہ تھا کہ روس اور برطانیہ کی رقابت مختلف سمتوں میں بہت شدید ہوتی جارہی تھی۔ شاید اسی لیے مشرقِ بعید میں روسی اقدامات کا جواب دینے کی غرض سے برطانیہ نے جزیرہ نمائے ملایا کی ریاستوں پر قبضہ کرلینا ضروری سمجھا۔

۱۹ ویں صدی کے وسطی دَور میں سب سے بڑی اسلامی سلطنت تُرکی تھی اور وہ آخری سانس لے رہی تھی۔ اُس کے دونوں پہلو دبے ہوئے تھے یعنی ایک طرف روس اور دوسری طرف برطانیہ۔ مگر ایک تیسرا حِصّہ دار بھی پیدا ہوتا جا رہا تھا اور وہ جرمنی تھا۔ برطانیہ، فرانس اور روس کا ایمپیریلزم اب بالکل بے نقاب ہو چکا تھا اور جرمنی بھی اِس میدان میں اپنے رقیبوں سے پیچھے رہ جانا پسند نہ کرتا تھا۔ اُس زمانے کا سب سے بڑا برطانوی مدبّر گلیڈسٹن صاف صاف کہ رہا تھا کہ

"مجھے یقین ہے کہ ہم سب اُس عظیم الشان ملک کی محبّت میں متحد ہیں جو ہمارا وطن ہے اور اُس سلطنت سے بھی وابستہ ہیں جس نے ہمارے ملک کو خدا کی ایک ایسی امانت سپرد کی جو کبھی پہلے انسانوں کے کسی خاندان کو نصیب نہیں ہوئی۔ جس وقت میں اُس امانت اور اُس فرض کا ذکر کرتا ہوں تو الفاظ میری مدد نہیں کرسکتے۔ میں کہ نہیں سکتا کہ اِس

وراثت کی عظمت کو میں کیا سمجھتا ہوں۔ میں اُس وراثت
کو بحث طلب سیاسی مسائل کا ہدف نہیں بنا سکتا وہ میرے
وجود، میرے گوشت و پوست اور میرے دل اور میری روح
کا ایک جزو ہے۔"

یہ اُس "امانت" کا تذکرہ تھا جس کو برطانیہ کی استعماریت نے دُنیا کے مختلف حصّوں میں اپنے لیے محفوظ کر لیا تھا۔ اُس وقت برطانیہ کی سیاست کا عظیم تر اور اہم ترین جزو یہی استعماریت تھی۔ اُسی کی ایک علامت ۱۸۷۶ء میں ملکہ وکٹوریہ کا وہ اعلان تھا جس میں اُنھوں نے "ایمپرس آف انڈیا" کا خطاب اپنے شاہی خطابات میں شامل کیا۔ ۱۸۷۶ء میں ہندوستان پر برطانوی قبضہ کی تکمیل ہر طرح ہو چکی تھی حتّٰی کہ اُس کی انتہائی سرحد تک بلوچستان پر بھی قبضہ کیا جا چکا تھا۔
گلیڈسٹن کی آواز یورپ کے دوسرے استعماریت پسند ممالک میں بھی گونج رہی تھی۔ چنانچہ ماہرینِ جغرافیہ کی ایک کانفرنس میں بمقام برسلز شاہ لیوپالڈ کہہ رہا تھا کہ:-

"کرۂ ارضی کے اُس حِصّہ میں جہاں تہذیب نہیں پہنچی ہے، تہذیب کے لیے داخل ہونے کا دروازہ اور اُس تاریکی میں روشنی کا دریچہ پیدا کرنا جو آبادیوں کو لپیٹے ہوئے ہے ایک جہاد ہے اور ایک ایسا جہاد ہے جو ہمارے ملک کی شایانِ شان ہے۔"

اِس "جہاد" کے کارناموں سے اُس زمانہ کی تاریخ پٹی پڑی ہے۔
"گورے آدمی کا یہ بوجھ (White man's burden) اب یوروپین

اقوام کے سیاسی عقیدہ کا ایک اساسی مسئلہ بن گیا تھا۔

۱۸۷۷ء میں روس نے پھر ایک دفعہ ترکی پر حملہ کر کے اپنی ملک گیری کے لیے ایک میدان پیدا کرنا چاہا لیکن برطانیہ نے اُس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لیے ترکوں کی امداد کی اور گویا اُس امداد کے معاوضہ میں جزیرہ قبرس حاصل کر لیا۔

کم و بیش ڈیڑھ سو سال کی اِس مسلسل جدوجہد میں برطانیہ نے جو کچھ حاصل کیا اب ۱۸ ویں صدی کے آخر میں اُس کی تنظیم کا وقت آگیا تھا۔ چنانچہ لندن میں نو آبادیوں کی پہلی کانفرنس ۱۸۸۷ء میں منعقد ہوئی۔ اِس ڈیڑھ صدی کے عرصہ میں جنوبی افریقہ سے بحر روم تک برطانیہ نے جو ذرائع رسل و رسایل اور بحری اور فوجی طاقت کے مورچے قائم کر لیے اب اُن کا منظم اور مستحکم کرنا بھی ضروری تھا۔ اپنی نو آبادیوں اور مقبوضات کے متعلق برطانیہ کے مسلک کا سب سے نمایاں نشان راہ یہی کانفرنس تھی۔

لیکن برطانیہ کی استعماری قوت کو اس قدر منظم ہوتے دیکھ کر روس کے علاوہ فرانس اٹلی اور جرمنی بھی پریشان ہو رہے تھے۔ یہ سب بھی مختلف سمتوں میں پھیلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ ۱۸۸۹ء میں اٹلی نے افریقہ میں پہلا قدم اٹھایا اور سومالی لینڈ پر قبضہ کر لیا۔ فرانس نے جزیرہ "مڈیگاسکر" پر اپنی فوجیں اُتار دیں اور شمالی افریقہ میں تونس کی آزادی سلب کر لی گئی۔ اِس کے علاوہ انام کی ریاست اور چین میں علاقہ تونکن پر بھی فرانسیسی "دخل" مضبوط ہو گیا۔

ملک گیری کی اس دوڑ میں جرمنی نے بھی بے چین ہو کر جنوبی افریقہ اور ٹوگولینڈ، نیو گانیا اور جزایر بحر جنوبی کو اپنی "حفاظت" میں لے لیا اور

۱۸۸۸ء میں قسطنطنیہ جاکر قیصر ولیم نے اپنے ملک کے لیے بعض مراعات حاصل کیں اور بغداد ریلوے کا تخیل پیش کر کے اپنے اثرات کو آلِ عثمان کی سلطنت میں بڑھانے کی کوشش کی۔

۱۹ویں صدی کے آخر میں یورومین اقوام کے استعماریت کا سب سے بڑا ہدف افریقیہ بنا رہا اور اس برِاعظم کے میدانوں میں تمام بڑی اقوام کے گھوڑے دوڑتے رہے۔ ۱۸۸۸ء میں جزیرہ بورنیو کا ایک حصہ انگریزوں کی حفاظت اور سیادت میں داخل ہوا اور اس کے بعد دو سال کے اندر ہی نیا سالینڈ زنجبار اور یوگنڈا کے علاقے بھی برطانوی سلطنت میں شامل ہو گئے حتیٰ کہ ۱۹ویں صدی کے ختم ہونے تک یورپ کی ان استعمار پسند اقوام کے قبضہ میں ایشیا، افریقیہ اور امریکہ کے جو علاقے محفوظ ہو گئے اُن سب کا مجموعی رقبہ یورپ کے رقبہ سے (۷) گنا زیادہ تھا اور تمام دنیا کے انسانوں کی مجموعی آبادی کا ایک تہائی یورپ کے اس جدید استعماریت کے حلقہ اثر میں داخل ہو چکا تھا۔



یہ ایک پس منظر ہے اُن حالات کا جن کے اثرات اُنیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں اسلامی اور ایشیائی ممالک پر مرتب ہونے شروع ہوئے۔ اِن ہی اثرات کے آغوش میں بہت سے قوم پرست پیدا ہوئے اور ایشیا اور اسلام کے اِن قوم پرستوں کی صف اول میں پہلا آدمی افغانی تھا۔ اِس وقت دنیا کے تقریباً ایک ارب (۸۰) کروڑ انسانوں میں (۳۰) کروڑ کے قریب مسلمان تھے جو

دنیا کے ہر گوشے میں آباد تھے۔ یہ آبادیاں کمزور تھیں اور اُن کے شیرازے کو زمانے کے انقلابات نے بکھیر دیا تھا۔ تاہم اِن سونے والوں میں بھی کچھ لوگ تھے جو جاگ رہے تھے۔ یورپ اُن سے جس قدر زیادہ قریب آتا جاتا تھا اسی قدر زیادہ اُن کے قوٰی میں حرکت پیدا ہوتی جاتی تھی۔ واقعات کی روشنی میں تصویر کا یہ دوسرا رُخ بھی بہت بصیرت افروز ہے۔

۱۸ ویں صدی کے شروع میں دریائے دجلہ اور فرات کے کناروں پر تُرکی حکومت کی کمزوریوں اور بدنظمیوں نے ایک انقلابی اثر پیدا کر دیا تھا۔ اِس اثر کا ایک مظاہرہ ۱۷۲۳ء میں احمد پاشا کی بغاوت تھی جس نے بغداد میں چند روز کے لیے ایک آزاد حکومت قایم کرلی۔ لیکن نشاۃِ ثانیہ درحقیقت شروع ہوئی وہابی تحریک سے جو عرب کے ایک گوشہ میں پیدا ہوئی اور ۱۹ ویں صدی کے شروع میں تمام حجاز پر حاوی ہوگئی۔ اِس تحریک کا اثر ہندوستان تک پہنچا اور اگر ترکوں نے محمد علی خدیو مصر کے ذریعہ سے اُس کو دبا نہ دیا ہوتا تو معلوم نہیں کہ وہ قوت اور حرارت جو محمد بن عبدالوہاب کی اس تحریک کے اندر محفوظ تھی، دنیائے اسلام میں کتنا بڑا انقلاب پیدا کرتی۔ بہرحال اس میں شبہہ نہیں کہ وہابی تحریک نے ایک نئے طریقہ سے عربی اقوام کے ضمیر کو بیدار کیا۔ جس وقت یہ تحریک نجد میں شروع ہو رہی تھی تو یورپ و ایشیا میں آلِ عثمان کی وراثت تباہ ہونے کے قریب تھی۔ چنانچہ محمد علی پاشا نے مصر کو قسطنطنیہ کے اقتدار سے آزاد کرلیا تھا۔ اسی زمانہ سے تُرکوں کی سیادت کے خلاف عربوں کی تحریک

بھی شروع ہوئی جس کا منشا اِس وقت بھی برطانیہ کے دفترِ خارجہ میں بقول پامرسٹن یہی سمجھا گیا تھا کہ "اس کا (محمد علی کا) مقصد تمام عربی بولنے والی قوموں کی ایک متحدہ حکومت ہے"۔ ۱۸۳۳ء میں پامرسٹن نے یہ خیال ظاہر کیا تھا۔ اس وقت عثمانی سلطنت کے بہت سے اجزا یورپین اقوام میں تقسیم ہو چکے تھے۔ اور حالات ایسے تھے کہ دنیائے اسلام میں مایوسی کے سوا اور کوئی احساس باقی نہ تھا۔ تاہم یورپ کی ترقیوں اور کامرانیوں ہی کے اندر سے ایشیائی اقوام کو کچھ سبق مل رہے تھے۔ چنانچہ ۱۷۷۶ء میں امریکی نوآبادیوں کی جنگِ آزادی نے بہت سی آنکھوں کے پردے اُٹھا دیے اور ایشیا کے کمزور ممالک میں بھی کچھ چنگاریاں سلگنے لگیں۔ اِس جنگِ آزادی کے (۱۲) سال بعد ہی انقلابِ فرانس کے شعلوں کی حرارت ایشیائی قوم کی زندگی کے مختلف گوشوں میں محسوس کی گئی۔ اِس ہنگامہ زار سے ترکوں کا گھر زیادہ قریب تھا۔ شاید اسی لیے سب سے پہلے ترکی ہی میں احرار کی ایک ایسی جماعت پیدا ہوئی جس نے قدیم استبدادی طرزِ حکومت کو ختم کر کے دستوری اصلاحات کا مطالبہ کرنا شروع کیا۔ چنانچہ باوجود مخالفتوں اور سختیوں کے یہ جماعت اپنا کام کبھی وطن میں رہ کر، کبھی جلا وطن ہو کر، کبھی خفیہ اور کبھی علانیہ کرتی رہی۔ اس جماعت کے جدو جہد کے نتائج بھی کچھ نہ کچھ ظاہر ہوتے رہے۔ چنانچہ ۱۸۲۶ء میں سلطان محمود دوم نے "تنظیمات" جاری کیں۔ پھر ۱۸۳۹ء میں سلطان عبدالحمید خاں نے "خط شریف" جاری کیا اور پھر ۱۸۵۶ء میں "خطِ ہمایوں" جاری ہوا۔ حقوق طلبی کا یہ سلسلہ

مختلف گوشوں میں اور مختلف طریقوں سے جاری رہا اور حُرّیت کی قربان گاہ پر بہت سی قربانیاں بھی ہوتی رہیں۔

۱۸۴۳ء میں طرابلس کے ریگستانوں میں سنوسیوں کی تحریک پیدا ہوئی۔ امام سید محمد نے وہابی تحریک کے قائدین سے بہت کچھ حاصل کیا اور پھر شمالی افریقیہ میں اپنے زاویے قایم کرکے عربوں میں ایک نئی حرکت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ باوجودیکہ وہابیوں اور سنوسیوں کی تحریکات زیادہ تر مذہبی تھیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ملّتِ اسلامی کی نشاۃِ ثانیہ کا ایک اہم جزو تھیں اور جو بیداری اُن کی وجہ سے پیدا ہوئی اُس کی قدر وقیمت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح وہابیوں کی تحریک کا مقصد ملّتِ اسلامی کا اِحیا تھا اسی طرح سنوسی اخوان بھی تمام اسلامی ممالک میں وہی بیداری پیدا کر دینا چاہتے تھے جس کے بغیر کمزور ممالک کا یوروپین اقوام کی دستبرد سے بچنا ناممکن تھا۔

۱۹ ویں صدی عیسوی کے اسی دور میں پسماندہ ایران بھی ایک نئی تحریک سے آشنا ہوا اور یہ مرزا محمد علی باب کی تحریک تھی۔ اِس تحریک کے عقاید اور اصولوں سے اتفاق یا اختلاف کرنے کے بجائے میں اُس کا ذکر صرف اس لیے کرتا ہوں کہ اس تحریک نے بھی دنیائے اسلام کے ایک گوشہ میں بہت قوی حرکت پیدا کی تھی۔ گویا تحریکوں کا یہ ایک مثلّث تھا جس کا ایک زاویہ ایران میں تھا، ایک نجد میں اور ایک طرابلس میں۔ اِس مثلّث کے اندر اور بھی بہت سی تحریکیں ۱۹ ویں صدی میں اپنا اپنا کام کر رہی تھیں۔ مگر یہ تین مرکز ایسے تھے

جن سے سیّد جمال الدین افغانی کی زندگی بھی متاثر ہوئی۔ شیخ کے میدان میں آنے سے پہلے شام میں قوم پرستوں کی ایک تحریک شروع ہو چکی تھی۔ یہ اصحاب ۱۸۵۸ء میں ایک خفیہ انجمن قایم کر چکے تھے جس کا مقصد تُرکوں کی مضمحل سلطنت سے عربوں کو آزاد کرانا تھا۔ اِس انجمن کی خصوصیت یہ تھی کہ اُس کے اراکین عرب اور عیسائی دونوں تھے۔ اس کا مرکز بیروت میں تھا اور اس کی شاخیں دمشق اور طرابلس وغیرہ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اسی زمانہ میں تونس میں بھی جنرل خیرالدین پاشا کی تحریک جاری تھی۔ تُرکی میں احرار کی تحریک شروع ہو چکی تھی اور اس تحریک کا ایک گوشہ تاتاریوں کے وطن تک پھیلا ہوُا تھا۔ ۱۹ ویں صدی کے وسط میں جب روس نے ماورائے قفقاز پر اور فرانس نے الجیریا پر قبضہ کر لیا تو الجیریا میں عبد القادر کی تحریک شروع ہوئی اور وسط ایشیا میں روس کے خلاف نقشبندیہ تحریک نے زور پکڑا۔ اور پھر چینی ترکستان میں بغاوتیں شروع ہوگئیں جن کے ایک مشہو لیڈر یعقوب بیگ تھے۔ علاوہ بریں بخارا میں مجلس اتحاد اسلام قایم ہوئی جس کی جد و جہد کا رشتہ نوجوان تُرکوں کی تحریک سے ملتا ہے۔ چنانچہ ۱۸۹۵ء میں جب شیخ قسطنطنیہ میں موجود تھے تو اسی تاتاری تحریک کے لیڈر یوسف بے نے اُس جگہ وہ تحریک اتحاد تورانی شروع کی جس کو بعد میں اتاترک کے شرکاءِ کار نے بھی اختیار کر لیا تھا۔ اس تحریک کا پروپگنڈا عرصہ تک "اخبار ترک یورد" کے ذریعہ سے کیا جاتا رہا جس کے اڈیٹر احمد بے عقالف تھے۔

ایران ان تحریکوں کے زمانہ میں سب سے پیچھے تھا۔ تاہم

جیساکہ آپ کو ان اوراق سے معلوم ہوگا وہاں بھی کچھ چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ یورپین سرمایہ داروں کی گرفت نے ایران کے کمزور اور ناعاقبت اندیش بادشاہوں کو اتنا مجبور کر دیا تھا کہ اُن کی زخمی رعایا بےچین ہونے لگی تھی۔

مختصراً یہ وہ ماحول ہے جس میں جمال الدین افغانی نے اپنا کام شروع کیا۔ سلطان عبدالحمید خاں نے اپنے آخری زمانہ میں جو تحریک اتحادِ اسلامی شروع کی تھی وہ یورپین ممالک میں بہت مشہور ہوئی لیکن وہ تحریک سید جمال الدین افغانی کی تحریک نہ تھی بلکہ اُس کو سلطان عبدالحمید خاں محض اپنی استبدادیت کے اقتدار کا سہارا بنانا چاہتے تھے۔ درحقیقت شیخ جن نظریات پر عمل کر رہے تھے وہ اُس زمانہ کی نوزائیدہ "نیشنلزم" (قوم پرستی) کے نظریات تھے۔ اُن کے اِن نظریات کو اس زمانہ کی اسلامی تبلیغی تحریکات سے بہت مدد ملی۔ پہلے میں ان تحریکات کا تھوڑا سا ذکر کروں گا اور اِس کے بعد شیخ کی "قوم پرستی" کی کچھ وضاحت۔

اس اسلامی نشاۃِ ثانیہ کے پہلے سانس نے جس چنگاری کو چمکایا وہ اسلام کی تبلیغی تحریک تھی جو مسلمانوں کے مذہب کا ایک اساسی جزو ہے۔ اس زمانہ کی تحریکوں میں سے سب سے زیادہ سنوسیوں نے تبلیغ کا کام انجام دیا۔ اُن کے زاویے اور خانقاہیں تبلیغی مشن کے مراکز تھے۔ افریقہ میں شمال سے جنوب تک اسلام کی اس روشنی کو لیجانے والے سنوسی اور اخوان ہی تھے جنھوں نے سید جمال الدین افغانی جیسے لوگوں کی تحریکوں کے لیے میدان تیار کیا اور افریقہ سے چین تک مسلمانوں میں اُن کے اِس مشن کا

ایک قومی احساس پیدا کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ یوروپین تجارت اور سیاست کے شانہ بشانہ مسیحی مبلّغین بھی ان نئے میدانوں کی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے لیکن ان میدانوں میں ہر جگہ اسلامی مبلّغین سے اُن کی ٹکرّ ہوئی اور ہر جگہ اُنھوں نے شکست کھائی۔ حتّٰی کہ خود عیسائی مشن کے بڑے بڑے لیڈروں نے اپنی تالیفات میں اِس واقعہ کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ اسٹڈرڈ مسیحی مبلّغین کی تحریروں کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ اسلامی مبلغین کی کامیابیاں

"صرف لامذہبوں ہی کے مقابلہ میں نہیں ہیں بلکہ یہ کامیابیاں اس طرح حاصل کی جا رہی ہیں کہ عیسائی مبلّغین کو سخت خسارہ ہو رہا ہے۔ جنوبی افریقہ میں یوروپین مشنوں کے ذریعہ سے جو لوگ عیسائی بنائے جاتے ہیں ان میں سے بہت سے اسلام قبول کر لیتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ وہ قبیلے جن کے اندر کبھی کوئی ایک بھی مسلمان نہ تھا آج تقریباً سب کے سب اسلام کے احکام کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

افریقہ اور چین کے متعلق ایسی شہادتیں ہزار ہا پیشِ نظر ہیں۔ جاوا سماٹرا، ویسٹ انڈیز، شمال سے جنوب تک سارا افریقہ اور چین و جاپان اسلام کے تبلیغی مشن سے کم و بیش متاثر ہوئے اور عالمِ اسلامی کی اُس بیداری کا جو ۱۸ ویں صدی کے آخر اور ۱۹ ویں صدی کے شروع میں پیدا ہوئی یہ ایک بہت قوی اور موثر عنصر تھا۔۔۔۔۔۔۔

یہ میدان تھا اور یہ ماحول تھا جس میں سید جمال الدین افغانی نے اپنا کام انجام دیا۔ جیساکہ ناواقف لوگ سمجھتے ہیں اُنھوں نے اپنی تحریک میں وطنیت اور قوم پرستی کے عناصر کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا۔ اس بحث کے ہر پہلو کو پیش کرنے کے لیے ایک مکمل کتاب لکھنی پڑے گی لیکن جو لوگ "آثار جمال الدین" کے مختصر اوراق کا بغور مطالعہ کریں گے اُن کو معلوم ہو سکے گا کہ شیخ اپنی تحریک اتحاد اسلامی میں مسلمان اقوام کی وطنی اور قومی وحدتوں کو محو کر دینا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ ہر وحدت کو بجائے خود وطنیت کے جذبہ پر مستحکم کر کے اُن کا ایک ایسا وفاق بنانا چاہتے تھے جو یوروبین ایمپریلزم کی دراز دستی کا مقابلہ کر سکے۔

۱۹ ویں صدی کے نصف اول میں نیشنلزم کی تحریکات اوّل مصر سے اور اُس کے چند ہی روز بعد ملک شام سے شروع ہوتی ہیں۔ اِس صدی کے نصف آخر میں نیشنلزم کے خدو خال زیادہ نمایاں ہوئے۔ عربوں کی یہ ابتدائی تحریک تُرکی اقتدار کے خلاف تھی اور اُس میں نسلی اختلافات اور وطنی احساسات کا بہت کچھ دخل تھا۔ ۱۸۷۷ء میں تُرکی پر رُوس کے حملوں کے بعد اس تحریک نے زور پکڑا اور ہم دیکھتے ہیں کہ عربوں کے تمام علاقے اور صوبے اپنی خود مختاری اور آزادی کے لیے کوشاں ہو گئے۔ کہیں اس تحریک کا اساس "وطنیت" تھا اور کہیں نسل، مگر زیادہ تر وطنیت تھا۔ سلطان عبدالحمید خاں نے اپنی تحریک اتحادِ اسلامی کے ذریعہ سے اِن قوم پرستوں کو مطمئن کرنا چاہا لیکن وہ مطمئن نہ ہو سکے۔ بہت سے عرب قوم پرست جو شام میں تُرکی حکام

کی سخت گیری سے بچ کر بھاگے تھے مصر میں جمع ہو گئے اور اِس امر کی شہادتیں موجود ہیں کہ وہ شیخ سے روابط رکھتے تھے۔ خود شیخ مصر میں قومیت اور وطنیت ہی کی بنیاد پر کام کر رہے تھے اور اُن کی تحریک نے جن لوگوں کو میدان میں بھیجا وہ سب وطن پرست اور قوم پرست تھے اور اُن کی جدوجہد میں اقلیت یا اکثریت اور مسلمان اور عیسائی کا کوئی امتیاز کبھی پیدا نہ ہو سکا۔ عربی پاشا کی تحریک کا تو نعرہ ہی یہ تھا کہ "مصر مصریوں کے لیے" اُن کے بعد مصطفےٰ کامل اور زاغلول پاشا کی جدوجہد کا اساس بھی وطن کی آزادی کا سوال تھا۔ اسی طرح ایران میں بھی شیخ کی جماعت سب وطن پرست، مخالف استبداد اور آزادی طلب تھی۔ ترکی میں بھی اُن کے سرکار کار سب وہ احرار تھے جو وطنی مفادات کی حفاظت کرنا چاہتے تھے اور جہاں تک میرا مطالعہ میری مدد کرتا ہے شیخ بھی سلطان عبدالحمید خاں کے تصورات کے حامی نہ تھے بلکہ صرف یہ چاہتے تھے کہ کوئی مرکز ایسا پیدا کریں جس پر اسلامی وحدتوں کا ایک وفاق قائم ہو جائے۔ اتاترک کی وطنی تحریک کے سرسبز ہونے کے بعد معاہدۂ سعد آباد شیخ کے اُسی خواب کی تعبیر ہی جو وہ آزاد اسلامی ممالک کے درمیان ایک سیاسی رابطہ پیدا کرنے کا دیکھا کرتے تھے۔ اُن تمام ملکوں میں جہاں شیخ نے کام کیا وطنیت کے جذبہ کی وہ پوری تائید کرتے رہے۔ مصر میں تو خصوصیت کے ساتھ اُنھوں نے اور اُن کے جانشینوں نے قبطی اور مصری عناصر کو وطنیت ہی کی بنیاد پر متحد کیا تھا۔ چین میں بھی جہاں کروڑوں وطن پرست چینی مسلمان آباد ہیں ایک متحدہ چینی قومیت کا جو شاندار مظاہرہ آج ہم دیکھ رہے ہیں

اس کی اصل چینی ترکستان کے وطن پرستوں کی جدوجہد ہی۔ اُن لوگوں کے لیے جو وطنیت کی بنیاد پر کسی قوم پرستی کے قایل نہیں سب سے زیادہ موثر جواب چینی مسلمانوں کا وجود ہی جو آج اپنے وطن کی عزّت اور آزادی کے لیے میدانِ جنگ میں دشمنوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

آج بھی اگر شیخ زندہ ہوتے تو مجھے کوئی شبہ نہیں کہ وہ اسلامی اخوت سے وطنیت کے جدید تخیل کو ہرگز خارج نہ سمجھتے بلکہ عربی ممالک کی آزادی کے لیے عربوں کی تائید کرتے اور وسط ایشیا کی ریاستوں میں تاتاریوں کے وطنی حقوق کا مطالبہ کرتے اور ترکی وطن میں ترکوں کے استحکام کی کوشش کرتے جس طرح ایران میں وہ ملّتِ ایرانی کی آزادی کے لیے کوشاں رہے۔ حقیقت یہ ہی کہ مصری، ترکی اور ایرانی احرار کی جدوجہد کا تمام اساس ایک شدید وطنیت تھی۔

شیخ کی تحریروں اور تقریروں میں ہم ایک جگہ بھی نہیں دیکھتے کہ اُنھوں نے محض مذہبی جذبات سے اپیل کی ہو بلکہ ہر موقعہ پر وہ "ملّت" کے اجتماعی احساسات کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اِس طرح نیشنلزم کی روایات نے گزشتہ نصف صدی میں باوجود سخت ترین دشواریوں کے نشو نما پائی اور ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم نے اُن کو اور بھی زیادہ قوی کر دیا۔ چنانچہ میثاق سعد آباد پر جس وقت ترکی افغانستان ایران اور عراق کے نمائندوں نے دستخط کیے تو اُنھوں نے اپنی تقریروں میں اِس میثاق کے فائدے "چاروں ملّتوں" اور "ملکوں" کے لیے ظاہر کیے۔

اِن تقریروں کے لہجہ اور الفاظ میں قوم پرستی اور وطنیت کے خلاف اُس جذبہ کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوا جو ہم ہندوستان کے لیڈروں

کی تقریروں میں دیکھا کرتے ہیں۔ اِس نکتہ پر ہندی مسلمانوں نے بہت کم غور کیا ہے کہ ساری دنیا میں وہی تنہا ایسے ہیں جو وطنیت کے اساس پر اپنی ملّت کی تنظیم و تشکیل کرنے سے نہ صرف ابھی تک قاصر رہے ہیں بلکہ ایسے تمام نظریات کے خلاف اُن کی رہنمائی کی جارہی ہے۔ بہرحال مقصود یہ عرض کرنا ہے کہ سیّد جمال الدین افغانی کی تحریک میری رائے میں مذہبی نہ تھی بلکہ زیادہ تر سیاسی تھی۔ اور اُس کے دامن سے سوائے ہندوستان کے تمام دنیا کے اسلامی ممالک کا دامن بندھا ہُوا تھا۔ ہندوستان میں شیخ کی تحریک سے ناواقفیت کا یہ عالم ہے کہ حال ہی میں مَیں نے اخبار "مدینہ" کے صفحات پر کسی پروفیسر صاحب کا ایک مضمون پڑھا تھا جس میں انھوں نے شیخ کی تحریک کے متعلق بہت ہی بے معنی اور بے سروپا خیالات ظاہر کیے ہیں۔ فاضل پروفیسر صاحب نے عجیب و غریب شان سے اپنے مضمون کی تمہید اٹھائی ہے۔ لکھتے ہیں کہ

"ہندستان کے مسلمان آج تک اس بات کو نہیں سمجھے کہ پان اسلامزم کی تحریک خود مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے شروع کی گئی تھی۔"

اس اجمال کی تفصیل پروفیسر صاحب نے یہ بیان فرمائی ہے کہ:۔

"اِس تحریک سے یورپ کے سیاست دانوں کا منشا یہ تھا کہ مسلمان رفتہ رفتہ مغربی معاشرت اور تمدن سے مانوس ہوتے جائیں گے اور وہ منافرت و حقارت جو ابتدا میں مفتوح قوم کو فاتحین سے ہوتی ہے جاتی رہیگی۔"

پروفیسر صاحب جن الفاظ میں شیخ کا ذکر کرتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

چند عالموں نے دنیائے اسلام کا دورہ کیا اور ہر ملک

میں مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کی تلقین کرتے پھرے اُن میں
سے دو بزرگ سیّد جمال الدین اور مفتی عبدہ بہت سرگرم
لیڈر ہوئے ہیں اور ایک عرصۂ دراز تک مسلمانوں نے
اُن کی خوب قدر و منزلت کی - اِس نکتہ کے ساتھ ساتھ
یہ لیڈر مسلمانوں کو یہ بھی سمجھاتے رہے کہ بغیر یورپ کے
علوم و فنون حاصل کیئے کبھی یوروپین طاقتوں کا مقابلہ نہیں
کیا جاسکتا "

اسی سلسلہ میں پروفیسر صاحب سیّد جمال الدّین افغانی کے ساتھ سرسید احمد خاں مرحوم کا نام بھی اس طرح لیتے ہیں کہ گویا اِن دونوں کا مقصد ایک ہی تھا !

"مختصر یہ کہ سیّد جمال الدین اور سید احمد خاں اور مفتی عبدہ
تینوں حضرات نے خود ہی اِس تحریک کو چلایا اور سلطان
عبدالحمید خاں کے زمانہ میں یہ تحریک خوب کامیاب رہی۔
مگر (۱۳) سو سال کے بعد مسلمانوں کی سیاسی غلطی کی تلافی
ناممکن تھی کیونکہ جن جن ممالک میں مسلمان رہ گئے وہیں
کی اقوام میں مدغم ہو گئے اور اُن کو آبائی وطن سے کوئی
ہمدردی نہ رہی اور پکار پکار کر کہنے لگے کہ مسلمان کا
مادر وطن وہی ہے جہاں وہ رہتا ہو "

پروفیسر صاحب شاید بھول گئے کہ اس غلطی کا عمل داگر یہ کوئی غلطی تھی، تو خلیفہ چہارم کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا - پروفیسر صاحب نے اپنے مضمون کے آخر میں اپنا یہ عالمانہ فیصلہ پیش فرمایا ہے کہ :-

"تحریک پاکستان ہو یا پان اسلامزم یا اتحادِ ممالک اسلامیہ، دل کے بہلانے کو یہ تینوں خیال اچھے ہیں اور اُن تحریکوں کے مصنّفوں کے ہم اتنے ہی شکرگزار ہیں جتنے کہ شیخ چلی اور ڈان کویخزاٹ کے فسانہ نویسوں کے جنھوں نے ہماری تفریح طبع کے لیے کافی مصالحہ مہیا کر دیا ہو۔"

میں تو پروفیسر صاحب کے اِس اجتہاد کی اشاعت اِن اوراق میں گوارا نہ کرتا لیکن صرف مثال کے طور پر یہ بتانے کے لیے کہ سید جمال الدین افغانی اور اُن کی تحریک سے ہندوستان کے لوگ کس قدر ناواقف ہیں، میں نے اس بے معنی مضمون کے بعض اقتباسات کو پیش کرنا ضروری سمجھا تاکہ "آثار جمال الدین" کے پڑھنے والے اِن اوراق کا گہرا مطالعہ کریں اور "افغانی" تحریک کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

ایک دوسرے مذہبی اور علمی رسالہ کے مدیر صاحب نے (جو "علومِ قرآنی اور حقایق فرقانی کا ذخیرہ" ہو) اپنے علم و فضل کی ایک شدید "جھلاّہٹ" میں ممالکِ اسلامی کی قومی تحریکات پر تبصرہ فرماتے ہوئے یہاں تک تحریر فرما دیا کہ:-

"ہم یورپ کے اُن ناخدا شناس مفکّرین کی قدر کر سکتے ہیں جنھوں نے اپنے زورِ طبع سے کسی نئے نظامِ فکر و مذہب عمل کی بنا رکھی مگر اتاترک اور رضائے پہلوی جیسے تھرڈ کلاس آدمیوں کی ہم کیا قدر کریں جن کی پوری زندگی سے ایک اجتہادی کارنامہ بھی نکال کر نہیں بتایا

جا سکتا"

یہ مشتبہ امتیاز صرف ہندوستان ہی کے مسلمانوں کو حاصل ہے کہ وہ سب سے زیادہ بےدست دپا بھی ہیں اور دوسروں پر نکتہ چینی کرنے میں سب سے زیادہ بلند آہنگ بھی! یہ رجعت پسند اور شدّت پسند مذہبیت جس کے غیر سنجیدہ مظاہرے ہندوستان میں ہرروز ہوا کرتے ہیں ایک ایسی پست ذہنیت کا پتہ دیتی ہے جس کو ہم جو کچھ بھی کہیں لیکن ترقی پسند تو نہیں کہہ سکتے۔ یوروپین امپیریلزم کے مقابلہ میں اتاترک اور رضاشاہ پہلوی کے کارنامے بالواسطہ جمال الدین افغانی کی تحریک آزادی کے شاندار نتائج ہیں لیکن جب ہندوستان کے فرسٹ کلاس جبّہ و قبّہ کی نظر میں یہ دونوں بھی "تھرڈ کلاس آدمی" قرار پائیں تو ظاہر ہے کہ جمال الدین افغانی تو فورتھ یا ففتھ کلاس سے اوپر کوئی جگہ بھی نہیں پا سکتے۔ ذہنی فضا کی اس ماتم انگیز پستی میں اگر آج تک جمال الدّین افغانی کے نام سے اکثر محراب و منبر نا آشنا رہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔

گرفتم حضرتِ ملّا ترش روست — نگاہش مغز را نشناسد از پوست
اگر با ایں مسلمانی کہ دارم — مرا از کعبہ می راند حق اوست

(اقبال)

٭ ٭ ٭

اِن اوراق کی ترتیب میں میں نے کوشش کی ہے کہ افغانی کے متعلّق مبالغہ آمیز توصیف وتحسین سے احتراز کروں۔ چنانچہ بہت سی ایسی روایات کو میں نے نظرانداز کر دیا اور بہت سے ایسے بیانات

کے لہجہ کا جوش و خروش کم کر دیا جو ایرانیوں اور افغانستانیوں کی تالیفات میں میری نظر سے گزرے۔ ایک کام مجھ سے نہ ہو سکا اور وہ یہ کہ میں خود ایران اور افغانستان جاتا اور برسرِ موقع بعض اُن واقعات کو تحقیق کرتا جن کی صحت میں مجھے شبہ ہو۔ بہر حال "آثار جمال الدین" محض ایک نقشِ اوّل ہو اور اِس عجیب و غریب شخصیت کی روئداد حیات کے بہت سے ایسے گوشے میری دسترس سے باہر رہ گئے ہیں جہاں اہلِ نظر کو ۱۸ویں اور ۱۹ویں صدی میں اسلامی ممالک کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے لیے بہت وسیع میدان مل سکتا ہو۔

میرا آخری فرض اُن محترم احباب کا شکریہ ادا کرنا ہو جن کی ہمت افزائی نے مجھے اِس کام پر آمادہ کیا۔ مسیح الملک حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا ابو الکلام آزاد کی صحبتوں میں میں "افغانی" کی عظمت سے آشنا ہوا اور اُن بزرگوں نے میری اِس جستجو میں اکثر مشکل مقامات پر میری امداد فرمائی۔

اِن تین کے علاوہ ہندوستان میں کچھ اور اربابِ نظر بھی ایسے تھے جنھوں نے وقتاً فوقتاً میری مشکلات کو آسان کیا۔ سب سے زیادہ میں سردار صلاح الدین خاں سابق سفیر کابل کا مرہونِ منّت ہوں کہ موصوف نے کئی بار افغانستان سے میرے لیے مفید معلومات حاصل فرمائی۔

یورپ میں میری تلاش و جستجو کو سب سے زیادہ روشنی علامہ پروفیسر گارڈنر براؤن سے حاصل ہوئی۔ مرحوم مستشرق کے محترم

وجود میں مَیں نے علم وفضل کی اعلیٰ کردار کا ایک نظر افروز نمونہ دیکھا اور میں اُن سے اپنی اُس پہلی ملاقات کو بھول نہیں سکتا جب ایک اجنبی طالب علم کی حیثیت سے میں اُن کے گھر گیا تھا اور وہ میرے مدعا کو معلوم کرنے کے بعد مجھ سے اِس طرح ملے تھے کہ گویا وہ مجھے برسوں سے جانتے ہیں اُس حالت میں جب کہ امراض قلب کی وجہ سے اُن کو ملاقاتیں کرنے کی ممانعت کردی گئی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں اُنھوں نے جمال الدین افغانی کے متعلق مجھے اپنا سارا خزانہ دکھا دیا اور تین گھنٹے تک افغانی کے اذکار میں اس طرح مشغول رہے کہ گویا وہ کبھی بیمار ہی نہ تھے۔ جب تک میں انگلستان میں رہا "افغانی" کا نام میرے اور اُن کے درمیان ایک ایسا واسطہ بن گیا تھا کہ نہ وہ گورے تھے اور نہ میں کالا تھا اور نہ وہ انگریز تھے نہ میں ہندوستانی۔ علم وفضل کی یہ سیرت وکردار میں نے اپنے ملک کے بہت کم علماء وفضلاء میں پائی ہے۔ دوسرا نام جو دلی شکریہ کے ساتھ میں لکھتا ہوں مس Carlton کا ہے جو شیخ کے بہت گہرے دوست مرحوم بلنٹ کی ہمشیرہ تھیں اور جن سے پروفیسر براؤن نے میرا تعارف کرایا تھا۔ اِن محترمہ نے بلنٹ کے تمام کاغذات مجھے دکھائے اور شیخ کے متعلق بعض دلچسپ دستاویزات مجھے اِن ہی کاغذات سے حاصل ہوئیں۔

یورپ میں منجملہ بہت سے احباب کے جنھوں نے میری امداد کی، دو اور محترم احباب ایسے ہیں جن کا ذکر کرنا میرے جذباتِ تشکر کا تقاضہ ہے۔ اِن میں ایک اسد فواد بے مارشل فواد پاشا مرحوم کے

صاحبزادے ہیں ۔ موصوف کی شخصیت ترکی سیاست میں ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ اُن کے والد ماجد مارشل فواد پاشا مشہور معرکہ پلودنا میں غازی عثمان پاشا کے شانہ بشانہ لڑے تھے اور اُسی معرکہ کی خدمات کے معاوضہ میں اُن کو سلطنت ترکیہ کے فیلڈ مارشل کا اعزاز عطا کیا گیا تھا۔ اسد فواد بے نے اپنی زندگی سلطانی استبداد کی پہلی ضرب کھا کر شروع کی تھی۔ وہ اپنی نوجوانی کے زمانہ میں سیاسی شبہ کی بنا پر غلاطہ سرائے کے محبس میں چند روز بند رہے اور ترک احرار کی کامیابی کے بعد وزیر اعظم کامل پاشا کے سکرٹیری مقرر ہوئے۔ اُس کے بعد محمود شوکت پاشا کے سکرٹیری منتخب ہوئے۔ پھر تیسرے وزیر اعظم پرنس سعید حلیم کے معتمد بنائے گئے۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ شروع ہونے کے بعد وہ طلعت پاشا کے سکرٹیری مقرر ہوئے۔ جنگ کے ختم ہونے کے بعد اُن کو سوئٹزر لینڈ میں پناہ گزیں ہونا پڑا اور وہیں لوزان کی صلح کانفرنس کے زمانہ میں مَیں نے اُن کے گھر مہمان رہ کر قدیم اور جدید ٹرکی کی دلنواز انسانیت کا یہ نظر افروز نمونہ دیکھا۔ گویا میں نے اِن چند ہفتوں میں آلِ عثمان کی انقلابی تاریخ کے بہت سے زندہ اوراق کا اوّل سے آخر تک مطالعہ کر لیا۔

دوسرے محترم دوست ڈاکٹر بہجت وہبی ہیں جو وہبی پاشا کے دوسرے صاحبزادے ہیں۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ سے پہلے اُن کے خاندان کا مصر کے شاہی خاندان سے بہت گہرا تعلق تھا چنانچہ وہ اپنی طالب علمانہ زندگی میں شاہزادہ سعید حلیم اور شاہزادہ عباس حلیم سابق خدیو مصر کے ہم سبق رہے۔ جدید طب میں اُن کا مرتبہ بہت بلند سمجھا جاتا ہے۔

مصر میں وہ طبّی کالج کے ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ کچھ عرصہ تک وہ سعد زاغلول پاشا کے اسٹاف میں اُن کے طبّی مشیر رہے اُس کے بعد برطانوی رزیڈنٹ کے ناراض ہو جانے کی وجہ سے اُن کو ترک وطن کرنا پڑا اور عرصہ تک پیرس میں مقیم رہے۔ ۱۹۳۳ء میں موصوف جامعہ ملیہ دہلی کی دعوت قبول کر کے توسیعی لکچر دینے ہندوستان بھی تشریف لائے تھے۔ اب وہ زیادہ تر مصر میں رہتے ہیں اور بین الاقوامی مسایل کے بہت بڑے واقف کار سمجھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر وہبی کے علم و فضل کے متعلق ایک عجیب اور بہت دلچسپ بات یہ مشہور ہے کہ اب دنیا میں صرف وہی ایک شخص ہیں جو مصری ممی تیار کرنے کے قدیم نسخہ سے واقف ہیں۔ ۱۹ویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں موصوف مصر اور ترکی کے سیاسی مسائل سے بہت گہرا تعلق رکھتے تھے۔

دیار مغرب میں اِن احباب اور اُن احباب کے علاوہ بھی بہت سے احباب اور اربابِ علم و فضل نے افغانی کے متعلق ایک مسافر کی تلاش و جستجو میں ہر ممکنہ اعانت فرمائی اور اُن سب کا مَیں مشکور ہوں۔

یہ اوراق کم و بیش دس سال کی تلاش و جستجو کا حاصل ہیں۔ اِس حاصل کا ایک حصہ یعنی شیخ کے مضامین اور مقالات اور قلمی کارناموں کا ایک ذخیرہ میرے پاس ابھی محفوظ ہے اور اگر زمانہ نے مہلت دی تو اِن اوراق کی تکمیل کے بعد اِنشاءاللہ اُس کی ترتیب کا کام بھی شروع ہو جائے گا۔

محمدؐ عبدُ الغفار

حیدرآباد۔ دکن

۱۵ر اگست سنہ۱۹۴۰ء۔

خاندان اور تاریخ و مقامِ ولادت

پہلی ہی منزل پر شیخ کے سوانح نگار کا قلم لغزش کرتا ہے۔ منزل دشوار گزار ہے۔ اُن کے خاندان، مقامِ ولادت اور قومیت کے متعلق بہت اُلجھی ہوئی بحث ہمارے سامنے ہے، بہت سے متضاد بیانات ہیں۔ نفی اور اثبات کی ایک صبر آزما آویزش ہے جس سے بچ کر نکل جانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے۔ قضیہ درصل ایرانیوں اور افغانیوں کے درمیان ہے۔ ایرانی شیخ کو ایرانی کہتے ہیں اور اُن کے ایرانی ہونے پر بے شمار دلیلیں لاتے ہیں۔ مگر افغان مدّعی ہیں کہ وہ افغان تھے اور اپنے دعوے کو بہت سی تاریخی شہادتوں اور بیانات سے اُستوار کرتے ہیں۔ یہ قضیہ سراسر قومی ہے شخصی نہیں ہے۔ دونوں ایک ہی طرۂ افتخار کے لیے جھگڑ رہے ہیں۔ دونوں میں سے ہر ایک کو یہ ضد ہے کہ جمال الدین کے ہم قوم ہونے کی عزّت ہمارے ہی لیے مخصوص ہو۔ یہ کہتے ہیں وہ ہمارے تھے اور ہم میں سے تھے، وہ کہتے ہیں کہ وہ ہمارے تھے اور ہم میں سے تھے۔ دونوں کے جذبات قابلِ احترام ہیں اور دونوں کے بیانات وزن رکھتے ہیں۔ شیخ کے سوانح نگار کے لیے خاکِ ایران اور ارضِ افغانستان کے اس قضیے میں ثالث بالخیر بننا بہت ہی مشکل کام ہے۔ پھر یہ اُلجھا کیونکر سُلجھے؟ درمیانی

صورت صرف یہ ہو سکتی ہو کہ فریقین کے بیانات سے قطع نظر کر کے صرف اُسی بیان کو معتبر اور فیصلہ کن سمجھا جائے جو خود شیخ کا بیان ہو اور مستند ذرائع سے ہم تک پہنچا ہو۔ مگر یہ بھی آسان نہیں، اس لیے کہ ایک فریق اِس قسم کے بیانوں کو "بیانِ حقیقت" نہیں سمجھتا اور شیخ کی خاص خاص سیاسی مصلحتوں پر محمول کرتا ہو۔ بہر حال بہتر یہ ہوگا کہ پہلے دونوں طرف کے بیانات پیش کر دیے جائیں۔ لہٰذا اوّل اُن شہادتوں کو دیکھیے جو شیخ کے ایرانی ہونے پر دلیل لائی گئی ہیں۔

(۱) "... سید جمال الدین کے آباء و اجداد ۲۷۳ھ ہجری سے اسد آباد میں مقیم تھے۔ قبروں کے کتبوں اور بعض دیگر تحریروں سے اُن کے بزرگوں کی تاریخ بہ آسانی معلوم ہو سکتی ہو۔ الغرض وہ ہر اعتبار سے اسد آبادی ہیں۔ اُن کے بزرگ اپنے علوم اور کمالات کے باعث ہمیشہ مشہور رہے۔ جلال الدولہ شیخ الاسلام قاضی سید صالح السعید الشہید بھی انھیں کے خاندان سے گزرے ہیں۔ ان کا خاندان ہمیشہ مرجعِ خواص و عوام رہا ہو اور خوارقِ عادات کا وسیع سلسلہ اس سے منسوب ہوتا رہا ہو۔ اُن کے والد ماجد سید صفدر بن سید علی بن میر ضیاء الدین محمد الحسینی شیخ الاسلام بن میر زین الدین الحسینی القاضی بن میر ظہیر الدین محمد الحسینی شیخ الاسلام بن میر اجمل الدین محمد الحسینی شیخ الاسلام مختلف فنون و علوم سے آراستہ تھے اور اپنے زمانے کے مشہور درویش شیخ مرتضیٰ مرحوم سے بہت ربط و ضبط رکھتے تھے۔ انھیں بھی دنیوی امور سے بہت اعتنا نہ تھی اور ہمیشہ اپنی زمین اور چھوٹے سے باغ میں رہ کر قناعت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ اُن کی والدہ کا نام سکینہ بیگم تھا اور میر شرف الدین الحسینی القادری کی بیٹی تھیں۔ اس طرح وہ نجیب الطرفین تھے اور سیّدوں کے مشہور و معروف خاندان سے تعلق رکھتے تھے"[۱]

---

[۱] بیان مرزا لطف اللہ اسد آبادی جو جامعہ ملیّہ دہلی کی مطبوعہ اور شائع کردہ سوانح عمری میں نقل کیا گیا۔

(۲) "... محقق است کہ جدّ کبارش از ۱۶۳ سنہ ہجری در اسد آباد توطن و سکنا داشتہ اند۔ از بعضے نوشتجات و بخصوص از الواح قبور نیاگاں و اجدادش ....
...... چہار صد و ہفتاد ہفت سال می شود ......"[۲]

(۳) جناب اخوند ملائے طالقانی معروف بہ شیخ الرئیس نقل کرد از جناب آقا سید اسد اللہ خرقانی کہ الیوم در نجف در ادارۂ آقائے خراسانی و از بزرگانش شنیدم کہ گفت از سید جمال الدین سبب را پرسیدم۔ جواب داد افغان در جائے کونسل نہ دارد۔ من خود را بہ افغان نسبت دادم کہ از دست کونسل ہائے ایرانی آسودہ باشم و در ہر شہرے کہ می روم گرفتار کونسل نہ باشم ...."[۳]

(۴) "از فرزندانِ عالم جلیل سید علی ترمذی محدّث مشہور است و نسبِ عالی بہ خامس آل عبا حسین بن علی بن ابی طالب می رساند۔ تولدش ۱۲۵۴ سنہ ہجری مطابق ۱۸۳۹ء در قریہ اسد آباد"[۴]

(۵) " پدر سید جمال سید صفدر از سادات اسد آباد شغلش رعیتی بود۔ خانوادۂ سید جمال الدین از خانوادہ ہائے صحیح و از ساداتِ عالی درجاتِ حسینی و اتّصال شجرۂ ایں سلسلۂ بخامس آلِ عبا حضرت امام حسین ثابت و معلوم است ....."
" سید صفدر پسرش سید جمال را در پنج سالگی بہ مکتب گزاردہ۔ چوں فطانت و ذکاوتِ خوب داشت در ہشت سالگی از خواندن و نوشتن فارسی فارغ گردید...
..... دریں دہ سالگی سید جمال الدین از پدرش قہر کردہ بہ شہرِ ہمدان رفت و در مدرسہ

---

۲ لطف اللہ خاں در" شرح حال و آثار سید جمال الدین اسد آبادی" مطبوعۂ برلن ۱۹۲۶ء
۳ "تاریخ بیداریِ ایران" جلد اوّل۔ مؤلفہ آقائے ناظم الاسلام کرمانی۔
۴ مشاہیر الشرق۔ مؤلفہ جرجی زیدان۔ اس بیان کو صاحب" بیداری ایران" نے بھی نقل کیا ہے۔

ہمدان مشغولِ تحصیل بود۔ مدّتے در اصفہان و مشہد مشغولِ تحصیل بود۔ ازاں جا بطرف افغانستان مسافرت نمودہ ...."[۵۵]

(۶) "..... خانۂ مسکونیٔ سیّد امروز در اسد آباد معلوم است۔ طائفۂ وفامیلش را ہمہ کس می شناسند۔ جناب آقا مرزا علی مجاہد ہمدانی کہ از موثّقین است گوید من خواہرِ سیّد جمال را در چند سال قبل در اسد آباد ملاقات نمودم۔ ——————
..... صاحب[۵۶] اختیار بنگارندہ گفت ..... کہ زمانیکہ جمال الدین بطہران آمد، بملاقتش رفتم و در مجلسِ مذاکرہ ازو سوال کردم۔ سیّد تجاہل کرد و فرمود شنیدہ ام کہ اسد آبادے در نزدیک ہمدان است کہ اہالیش بسیار جاہل و عامی اند۔ چوں دانستم کہ تجاہل می کند لہٰذا ساکت شدم۔"[۵۷]

(۷) —— —— "جناب آقائے طبا طبائی فرمود کہ پسر عموی جمال الدین آقا سیّد ہادی در مدرسۂ چار حصار ایران تحصیل می نمود و سیّد از اہلِ اسد آباد است.."[۵۸]

(۸) "..... طایفۂ صاحبِ اختیارمی گویند کہ سیّد کمال برادر زادۂ سیّد جمال الدین الیوم در اسد آباد است ....."[۵۹]

(۹) "..... جناب حاج سیّاح محلّاتی کہ از دوستانِ سیّد می باشد مذکور ساخت کہ چوں سید جمال الدین مقصدِ بزرگے داشت دربارۂ ایران لہٰذا خود را بہ افغان نسبت داد تا از صدمہ و اذیّتِ ناصر الدین شاہ محفوظ بماند۔ خادم و مصاحب سید کہ معروف بہ عارف آفندی است ابوتراب نامے است کہ برادرش خادم مدرسۂ

---

۵۵ "تاریخ بیداریٔ ایران"

۵۶ صاحب اختیار سلمان خاں کا لقب تھا۔ اسد آباد انہی کی جاگیر و علاقہ میں واقع ہے۔ طائفہ سے مقصود اُن کے خاندان کے لوگ ہیں یا ملازمین۔

۵۷ "تاریخ بیداریٔ ایران" ۵۸ از تاریخ بیداریٔ ایران ،، ۵۹ "تاریخ بیداری ایران"

چار حصار است و مشہدی علی اکبر نام دارد۔ وخود عارف آفندی نوکر جناب آقا مرزا طبا طبائی بود۔ در ایامیکہ جمال الدین واردِ طہران گردید ابوتراب مجذوبِ سیّد جمال شدہ از آقائے طباطبائی اذن و مرخصی خواست وخود را بہ عنوان خادمے بہ سیّد بست و با سیّد مسافرت نمود۔ از تربیت و انفاس قُدسیہ او بگذشت قدمے کہ بہ عارف آفندی و مصاحب سیّد جمال معروف گردید"[10]

(۱۰) " شیخ اسد آباد نواحِ کابل میں نہیں بلکہ اسد آباد متصل ہمدان میں پیدا ہوئے تھے"[11]

(۱۱) سائکس (Sykes) نے بھی اپنی تاریخ ایران جلد دوم میں بیان کیا ہو کہ شیخ ہمدان کے قریب پیدا ہوئے اور نجف میں تعلیم پائی۔ مگر اپنی معلومات کا کوئی معتبر ذریعہ ظاہر نہیں کیا ہو۔

یہ بیانات اس فریق کے ہیں جو شیخ کی وطنیت اور قومیت کو ایرانی تصور کرتا ہو۔ اُن کے مقابلے میں دوسرے فریق کے بیانات پر بھی نظر کیجیے۔

(۱) "..... اُن کے والد، والدہ، چچا اور تمام رشتہ دار کونان[12] (؟) میں رہتے ہیں جو کابُل سے جلال آباد کی سڑک پر دو دن کی مسافت ہو۔ شیخ کے ایک عزیز سیّد محمد بادشاہ کونان کے حاکم ہیں اور اُن کی شادی امیر دوست محمد خاں کی لڑکی سے ہوئی ہو......"[13]

---

[10] از تاریخ بیداریٔ ایران۔ [11] از تاریخ بیداریٔ ایران۔

[12] غالباً یہ نام کنار (؟) ہو اسی نام کا ایک دریا بھی ہو جو جلال آباد کے قریب دریائے کابل سے مل جاتا ہو۔ کنار ریشات اور جلال آباد کے درمیان جلال آباد سے تقریباً ۴۰ میل ہو۔ نقشے میں اس کا محلِ وقوع ۷۰ اور ۲۰، عرض البلد کے درمیان ہو۔

[13] بلنٹ "در ہندوستان" بہ عہد رپن۔

(۲) "..... بعض واقعات کی تائید اور بعض امور کے اضافہ میں اپنے والدِ محترم مولانا اصغر علی خاں افغانی کے افاداتِ علیہ سے مستفیض ہوتا ہوں کیونکہ سیّد جمال الدین کے زمانۂ قیامِ کابُل و ہندوستان میں میرے والد ماجد اُن سے ملے تھے اور اُن کی صحبت میں رہ کر اُن سے استفادہ کیا تھا..... سیّد جمال الدین ۱۲۵۴ھ ہجری (۱۸۳۹ء) میں بمقام اسد آباد پیدا ہوئے جو افغانستان کے مشہور ضلع کنر میں واقع ہی۔ اس ضلع میں ساداتِ حسینی کا ایک مشہور خاندان آباد ہی جو تمام ملک افغانستان میں نہایت عزّت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہی۔ سیّد جمال الدین بھی اسی مبارک خاندان کے ایک مایۂ ناز فرزند تھے۔ ان کے والد بزرگ وار کا نام سید صفدر تھا۔ آپ کا سلسلۂ نسب سیّد علی ترمذی مشہور محدث سے ملتا ہی اور آگے چل کر جناب امام حسین علیہ السّلام سے متّصل ہو جاتا ہی۔ ......"[۱۴]

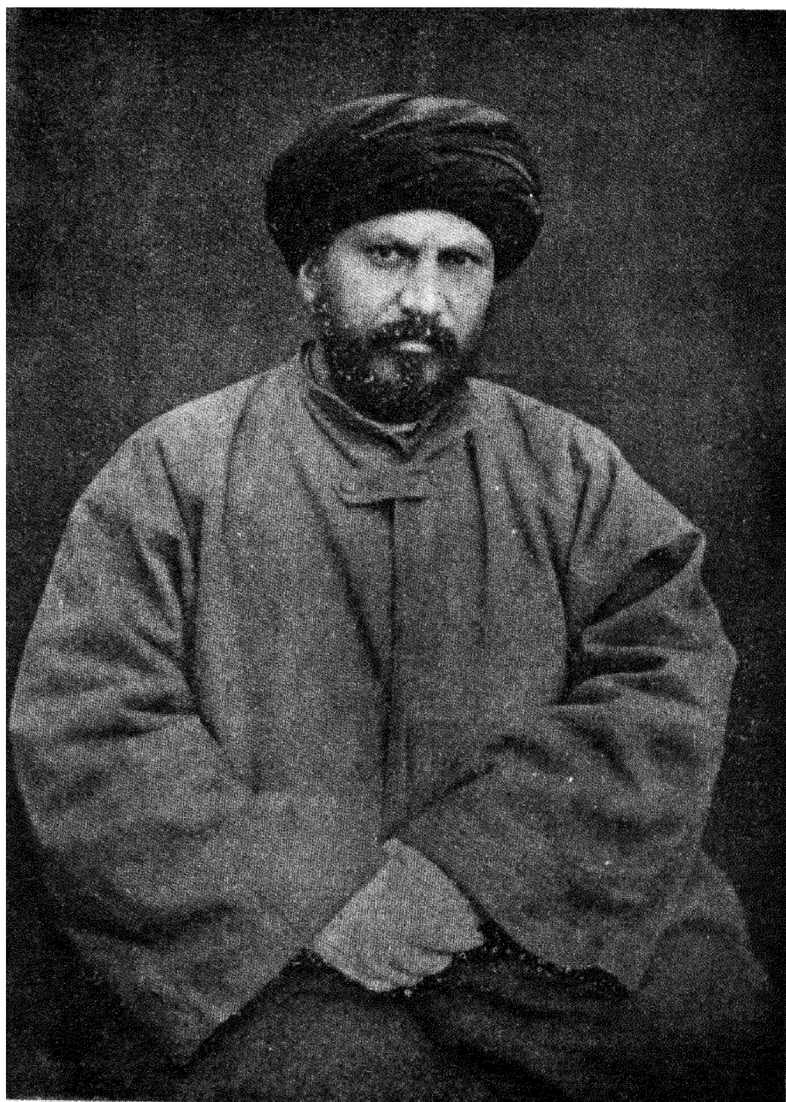
(۳) "افغانستان کے مختلف عناصر میں سے ایک جماعت سادات (اولادِ علیؓ ابن ابی طالب) کی بھی ہی جو اس ملک میں سیّد کہلاتی ہی۔ اس جماعت کے بعض لوگ مقامِ شنگ میں رہتے ہیں اور بعض ولایتِ کنڑ میں آباد ہیں جو جلال آباد کے پاس ہی۔ ساداتِ کنڑ بابر شاہ کے زمانے سے لے کر آج تک علما و اکابر سے خالی نہیں رہے۔ عام طور پر تمام افغانی اُن کے ساتھ بڑی عقیدت رکھتے ہیں اُن کے عادات و اخلاق و لباس افغانیوں کے مشابہ ہیں۔"[۱۵]

(۴) "در ہندوستان یک عقیدہ موجود است کہ جمال الدین مرحوم را ایرانی اسدآبادی می گویند و ایں صرف خیالِ وہم بہ نظر می آید۔ تمام دلایلِ ایرانی بودنِ

---

[۱۴] شیخ کی تالیف "تاریخ افغانستان" کے مترجم مولوی محمود علی خاں نے اپنے دیباچے میں یہ عبارت لکھی ہی۔ صاحب موصوف پچھلے چند سال تک حیات تھے۔ اور بھوپال میں مقیم۔

[۱۵] از سیّد جمال الدین در "تاریخ افغانستان"۔



سید جمال الدین «الافغان»
(وفات ۹ مارچ ۱۸۹۷ع)

او در کاوه[۱۶] موجود است ولے ہیچ کدام دلیل نیست نویسندۂ محقق کاوہ خودش ایں را قبول نہ دارد۔ مگر بیچارہ افغان ہا کہ امروز در دنیائے صدائے در زبانے را مالک نیستند نزدیک است کہ ایں حقیقت ہم پوشیدہ شدہ و آقائے تقی زادہ کہ بہ آزادیٔ خیال و پاکی از تعصب مشہور اند ہم باوجود شہادت بریں کہ فارسیٔ مشارٌ الیہ مرحوم فارسیٔ ایرانی نیست ارادہ میل بہ ایں عقیدہ دارند کہ او ایرانی خواہد بود۔ امیر شکیب ارسلان[۱۸] شامی (کہ خود مولانا را ملاقات کردہ و ارادتِ شاگردانہ بہ او دارند) و عالمِ اجل موسیٰ جار اللہ تاتاری[۱۷] پیشِ خودمن از افغانیتِ او اعتراف داشتند۔ من شنیدہ ام کہ در دفاترِ افغانیہ کاغذات نسبت بہ خاندانِ ایشاں و بنام پدرِ ایشاں (سیّد صفدر) موجود ہستند و از خاندانِ ایشاں بعض تا حال در آں جا موجود است۔ در علاقۂ موجودہ کنر در افغانستان کہ برائے سکونتِ سادات مخصوص است شیرکدہ نام جائے است کہ معنی اسد آباد می دہد..... تسنن مولانا رتبۂ مہمۂ وزارتِ مولانا در عہدِ امیر محمد اعظم خاں در افغانستان چیز ہائے نیست کہ غیر از افغان بودن مولانا چیزے دیگر ثابت کند۔ نیز بزرگ ترین رفقائے مولانا مجتہد معظم مصری شیخ محمد عبدہ[۱۹] صریحاً از جائے ولادتِ مولانا بنام و از افغان بودن ذکر می کند۔"

(۵) "شیخ جمال الدین در افغانستان در تاریخ ۱۲۵۴ھ تولّد و در آں جا منسوب

---

[۱۶] و [۱۷] دیکھیے ضمیمہ جات۔ [۱۸] دیکھیے ضمیمہ جات۔ [۱۹] دیکھیے ضمیمہ جات

[۲۰]۔ ۱۹۲۰ء میں جب میرا قیام یورپ میں تھا تو اس زمانے میں جنرل نادر خاں مرحوم ومغفور (جو بعد کو افغانستان میں مالکِ تاج و تخت ہوئے) افغانی سلطنت کے نمایندے کی حیثیت سے پیرس میں مقیم تھے۔ اور مجھے اکثر اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملتا تھا۔ اس مسئلے پر مرحوم ومغفور سے بارہا گفتگو ہوئی اور میری التجا کو قبول فرماکر مرحوم نے اپنا ایک تحریری بیان مجھے عنایت فرمایا جس کا ضروری اقتباس یہ ہے جو درج کیا گیا۔

به سادات معروف کوثر است ۔[۲۱]

(۶) "در قریہ کنڑ افغانستان تولد یافتند در سال ۱۲۵۴ھ ہجری ۔"[۲۲]

(۷) "۔ بعض از مؤرخین مثلِ سلطان محمد خاں ۔ شیر محمد خاں غلزائی ہیئت مؤرخین سراج التواریخ وے را سید منتسب به اہلِ نبوت دانسته اند که مؤیدِ قولِ شاں بعضے از مؤرخینِ فارس و ماوارالنہر ہم بوده ۔ و صاحبِ تالیف **تذکرة الابرار** خانوادهٔ سید جمال الدین را از اولادِ میر سید علی ترمذی می داند مثلاً به ایں صورت که سید جمال الدین بن سید حسن بن مولانا میر سید علی است ...... چوں سید علی یک شخص عالم و فاضل و مخصوصاً در فنِ رسمِ نقاشی مہارت داشت ، ہمایوں بادشاہ اورا بمعیتِ خود به ہند بُرد ۔ و پس از زمانهٔ ہمایوں پسرش حسن که در فضائل و کمالات مثل پدر بود در جملہ ندیمانِ اکبر بادشاہ به ہندی زیست ۔ آخراً در کابل آمده توقف گزینِ خاکِ کابُل شد ۔ ہمچنیں بعضے از مؤرخین افغانی و خارجی مثل مؤلفین **سکینة الفضلا ، تذکرة الابرار ، نگارستان ، تذکرۂ شمعِ انجمن** وغیرہ دارند که ورودِ خانوادهٔ سید جمال در کابُل از سالہائے عہدِ گورگانی ہا ولودین ہائے افغانی ہست ...... بہر حال مؤرخینِ خود یا افغانی و خارجہ جمیع به سیادت جمال الدین و خانواده اش اکثریت دارند و وُرُودِ ایں خانواده را از عہد گورگانی ولودین ہا می گویند ۔ جدّ اعلیٰ جمال الدین که در تاریخ معروف است ، سید علی است اگرچہ سید علی معروف به ترمذی بالاتر ازاں ہم سلسله روشن اجدادے امی (؟) خاندانِ نبوت دارد ولے از آں جا که بینِ سید علی قطفی مصورِ مشہورِ عہدِ ہمایوں و سید علی ترمذی شیخ معروف اشتباہ موجود است که آیا ایں دو نفر شخص علیحده یا بصفات علیحده و فی حدّ

---

[۲۱] "بیوک مجاہد شیخ جمال الدین افغانی" از سید عیسیٰ خاں در اخبارِ وطن قسطنطنیہ اشاعت مورخه ۳۰ ر اگست ۱۹۲۴ء ۔ [۲۲] برہان الدین قلیچ خاں ۔ از تلامذهٔ قدیم جمال الدین افغانی در جریدهٔ ملت قسطنطنیہ۔

ذات یکے بودہ اند ۔ ازیں رونمی شود دیگر سلسلۂ اجدادیٔ سیّد جمال الدین را زاید توضیح نمود..... امیر دوست محمد خاں سیّد صفدر را مغایرِ روشِ پولتیک خود دیدہ بکابل جلب کردہ بود ۔ بلکہ وجائیداد اورا بہ عنوان مصادرہ جائیداد سرکاری قید وضبط داشتہ بود اجدادِ سیّد صفدر کہ بقول مؤرّخین خواہ از بخارا و تبریز یا از خان آباد موجودہ وطن مشرقی کابل آمدہ باشند معلوم است بہ عائلہ نہ آمدہ بودند ۔ زیرا والدۂ سیّد صفدر وجدہ اش از افغانانِ صافی کنڑ بہ ہمیں نسبتِ خویشی قدیمہ سیّد صفدر ہم باہمان طایفہ پرداخت کردہ بود ۔ سیّد صفدر بعضے موسم گرما را بخوگیانی جلال آباد و بعضے سالہا را بجود کابل صرف می نمود و نظر بہ عشقے کہ در تحصیل علوم داشت گاہے بہ ہند ہم تشریف بُردہ بہ تماشاہائے تدریس خانہ ہا وصحبت علمائے آنجا مشغول می باشد .... درمحاربہ سال ۱۲۵۶ھ ہجری سیّد صفدر در ردیفِ مجاہدین سمت مشرقی اقوام خود ہم شامل شدہ بود ۔ سیّد ہاشم مجاہد مشہور کہ از جملہ حکّام امیر دوست محمد خاں و موقع عوات شجاع الملک بہ وے تسلیم نہ شدہ و در قلعۂ خصوصی خویش بہ کنڑ مردانہ دفاع از قوّتِ اجنبی کردہ بود او ہم از بنی اعمام سیّد صفدر بودہ است[۲۳]

(۸) "..... ردّ علی الدہرین" کے ترجمۂ عربی مطبوعہ حیدر آباد (۱۸۸۰ء) اور مطبوعہ بیروت (۱۸۸۵ء) کے ابتدائی اوراق میں شیخ کے جو مختصر حالات درج ہیں وہ بھی شیخ کے افغانی ہونے پر دلالت کرتے ہیں[۲۴]"

بہر حال خاندان، مولد، تاریخ و مقامِ ولادت، قومیت اور نسب کے متعلق یہ ہیں وہ تمام بیانات جو مختلف ذرائع سے اب تک حاصل ہو سکے ہیں ۔ بہ حیثیت مجموعی یہ تمام بیانات بعض امور کے متعلّق بالکل متفق ہیں یعنی یہ مسلّمہ ہے کہ شیخ

۲۳ھ غلام جیلانی اعظمی ۔ در مجلّہ کابل ۔ شمارۂ دوم ۔ ۷ جولائی ۱۹۲۱ء

۲۴ھ ۔ اس رسالے کے اب جو نسخے ملتے ہیں اُن میں شیخ کے حالات کا حصّہ موجود نہیں پایا جاتا ۔

سنہ ۱۲۵۴ھ میں پیدا ہوئے اور یہ کہ اُن کے والد ماجد کا نام سیّد صفدر تھا۔ سلسلۂ نسب کے متعلّق صرف اعظمی کا بیان تمام دوسرے بیانات سے مختلف ہے اور چونکہ کسی دوسرے ذریعے سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی ہے اس لیے اُس کو مشتبہ اور ناقابلِ اعتبار سمجھا جاسکتا ہے۔

مقامِ ولادت اور قومیت کے باب میں سب سے زیادہ اُلجھانے والا بیان مرزا لطف اللہ خاں کا ہے جو شیخ کے خواہر زادے کہے جاتے ہیں اور جن کی نسبت یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ عرصہ تک شیخ کی خدمت میں حاضر رہے۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں اُن کی مرتبہ ایک سوانح عمری موسومہ "شرحِ حال و آثار سیّد جمال الدین اسد آبادی" چاپ خانۂ ایران شہر برلن سے شائع ہوئی ہے جس کے دیباچے میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ "ایں کتاب ہر گونہ شک و شبہ را ازالہ می کند و ثابت می سازد کہ سیّد جمال الدین ایرانی و اسد آبادی بودہ است"۔ نیز اس تالیف کی نمایاں خصوصیت بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ مؤلف نے شیخ کی زندگی کے تمام اہم حالات و معاملات کو پسِ پشت ڈال کر اپنا تمام زور اسی نکتہ پر صرف کر دیا ہے کہ شیخ افغانی نہ تھے بلکہ ایرانی تھے۔ درحقیقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "شرحِ حال و آثار" کا مقصدِ واحد صرف یہی دعویٰ پیش کرنا ہے کہ شیخ ایرانی تھے اس کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد معلوم ہی نہیں ہوتا۔ مؤلف کا یہ غلو اُن کے دعوے اور بیانات کی قیمت کو بہت گرا دیتا ہے اس لیے ضرورت ہے کہ اُن کے بیانات پر غور کرنے سے پہلے خود اُن کی شخصیت پر غور کر لیا جائے۔ کتاب کے دیباچے میں لطف اللہ خاں کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے۔

"مرحوم (لطف اللہ) یکے از آزادی خواہانِ روشن فکر بود۔ از تربیت یافتگانِ فیضِ حضور فیلسوفِ مشرق حضرت جمال الدین اسد آبادی مشہور بہ

افغانی بود۔ در دو مرحلۂ مسافرتش بہ پایۂ تختِ ایران در خدمتِ آں سیّد بزرگ وار مشغولِ استفادہ از فیوضاتِ معنوی و کمالاتِ صوری بودہ تا روزے کہ از ایران حرکت نمودند .... مرزا لطف اللہ خاں محرّرِ مقالاتِ سیاسی حضرتِ سیّد بودہ اند........"

لیکن شیخ کی مسافرت و سیاحت کے جو حالات مختلف ذرائع سے ہم تک پہنچے ہیں ان میں کہیں لطف اللہ کا نام نہیں آتا۔ لطف اللہ بیان کرتے ہیں کہ وہ ہر دفعہ جب شیخ ایران آئے تو اُن کی خدمت میں حاضر رہے۔ شیخ کے اکثر سوانح نگاروں نے ایران میں اُن کے معتقدین احباب اور شرکائے کار کا تذکرہ بھی نام بنام کیا ہے۔ لیکن لطف اللہ کا کہیں نام نہیں آتا۔ لطف اللہ خود بیان کرتے ہیں کہ جب شیخ شاہ عبدالعظیم کی خانقاہ میں پناہ گزیں تھے تو وہ اُن کے پاس موجود تھے اور آخر تک موجود رہے۔ لیکن شیخ جب خانقاہ میں گرفتار کیے گئے تو بھی لطف اللہ کا کہیں ذکر نہیں آتا۔ بہر حال اگر اُن کے بیانات کو غلط نہ بھی کہا جائے تو اتنا تو ضرور کہا جاسکتا ہے کہ جو کچھ اُنھوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے وہ مبالغہ اور رنگ آمیزی سے پاک نہیں۔ آیندہ صفحات میں ان کی بعض روایات جابجا نقل کی گئی ہیں جن سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جائے گی۔

مرزا لطف اللہ کی طرح ایک اور مدّعی مؤلفِ "تاریخ بیداری ایران" بھی ہیں۔ جنھوں نے اپنی تاریخ کے اوراق میں اس بحث پر بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن تاریخی حیثیت سے اُنھوں نے بعض ایسی غلطیاں کی ہیں جو اُن کے بیانات کی حقیقت کو بہت ناقابلِ اعتماد بنا دیتی ہیں۔ مثلاً صرف ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔ شیخ کے خادم ابوتراب یا عارف آفندی کے متعلق لکھا گیا ہے کہ وہ ایران سے شیخ

کے ساتھ آیا لیکن شیخ کی زندگی میں ابوتراب کا ذکر پہلی دفعہ ۱۸۷۹ء میں آتا ہے جب وہ مصر سے خارج البلد کیے گئے۔ مصر سے جب وہ حیدر آباد دکن آئے تو ابوتراب اُن کے ہمراہ تھا۔ ایران کا پہلا سفر شیخ نے ۱۸۸۵ء میں کیا یعنی ہندوستان سے جانے کے چھ سال بعد۔ اگر ابوتراب مصر اور ہندوستان میں اُن کے ایران جانے سے پہلے شیخ کے ہمراہ تھا تو وہ ایران میں پہلی دفعہ اُن سے کب ملا ؟۔ اس حالت میں صاحب بیداریٔ ایران کا یہ بیان کہ

"در ایّامے کہ سیّد جمال الدین واردِ طہران گردید ابوتراب مجذوب سیّد جمال شدہ از آقائے طباطبائی اِذن و مرخصی خواست وخود را بہ عنوان خادمے بہ سیّد بست و با سیّد مسافرت نمود"

کمزور معلوم ہوتا ہے جب کہ وہ خود اس واقعہ کو تسلیم کرتے ہیں کہ ۱۸۸۵ء سے پہلے شیخ کبھی ایران نہیں گئے۔ البتہ دس برس کی عمر میں (بقول صاحب "بیداریٔ ایران") وہ مشہد اور اصفہان گئے تھے۔ پھر اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اس زمانۂ طفولیت میں شیخ کسی طرح طہران بھی پہنچ گئے تھے تو اس وقت ابوتراب کا شیخ کی خدمت سے وابستہ ہوجانا کسی طرح قرینِ قیاس نہیں۔

یہ مثال صرف اس لیے پیش کی گئی کہ اِن صفحات کے پڑھنے والوں کو یہ معلوم ہوجائے کہ صاحب "بیداریٔ ایران" نے واقعات کو کس طرح مرتّب کیا ہے اور اس کتاب کی تاریخی اور علمی حیثیت کیا ہے اور پھر تعجب یہ کہ یہ وہ کتاب ہے جس کے اکثر بیانات کو یورپین مستشرقین نے قبول کر لیا ہے ! صاحب "بیداریٔ ایران" نے شیخ کے بہ ظاہر افغانی مشہور ہونے کا بڑا سبب یہ بتایا ہے کہ

"چوں سیّد مقصدِ بزرگے داشت دربارۂ ایران لہٰذا خود را بہ افغان نسبت داد تا از صدمہ و اذیّتِ ناصرالدین شاہ محفوظ بماند..."

اور پھر شیخ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

"جواب داد (شیخ)، کہ افغان در جائے کونسل ندارد ومن خود را بہ افغان نسبت دادم کہ از دستِ کونسل ہائے ایرانی آسودہ باشم...."

یورپین مستشرقین نے "بیداریٔ ایران" کے اس سلسلۂ دلائل کو بغیر جانچے مان لیا ہے حالانکہ اس بیان کی صحت بہت مشتبہ ہے۔ سوال تاریخی تحقیقات کا نہیں ہے بلکہ صرف یہ ہے کہ معمولی فہم کی کسوٹی پر اس واقعہ کو کس کر دیکھنے سے کیا نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔ آئیے ہم مسلّمہ واقعات کو بحیثیتِ مجموعی سامنے رکھ کر اس بیان کو جانچیں۔

مان لیجیے کہ یہ واقعہ صحیح ہے کہ شیخ نے ایرانی حکومت سے بچنے کے لیے اپنے کو افغانی مشہور کیا لیکن ایرانی حکومت سے اُن کا تصادم عمر کے آخری حصّے میں ہوا یعنی جب وہ افغانستان سے اپنا پیام لے کر دنیائے اسلام کی طرف آئے تھے تو ایرانی حکومت سے اُن کو کوئی واسطہ نہ پڑا تھا نہ پڑنے والا تھا۔ وہ عرصہ تک مصر اور یورپ میں کام کرتے رہے اور ایران کی سیاسیات سے اُن کو دور کا بھی کوئی تعلق نہ تھا۔ پھر یہ عجیب بات ہے کہ جو خطرہ پیشِ نظر بھی نہ آیا تھا اس کے لیے شیخ نے ۳۰ برس پہلے ہی پیش بندی کرلی تھی! اس قسم کی تیار کردہ شہادتیں عموماً فہمِ عامہ کی کسوٹی پر بہ آسانی کھوٹی ثابت ہوجاتی ہیں۔

علاوہ بریں اس بیان پر یقین کرنے والوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے ایک اور نکتہ بھی قابلِ گزارش ہے۔

اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ شیخ دراصل ایرانی تھے اور سیاسی مصلحتوں کی بنا پر اپنے کو افغانی مشہور کرتے تھے تو یہ ظاہر ہے

کہ اُن کا یہ فریب عرصے تک اُن کے مخالفین اور خصوصاً انگریزوں سے پوشیدہ نہ رہ سکتا تھا اور انگریز جو مصر میں شیخ کی مخالفانہ کوششوں سے تنگ آچکے تھے اس راز کو فاش کر کے شیخ کو بہت بڑی شکست دے سکتے تھے۔ وہ اس طرح ازہر کے تمام علما کو اُن کے خلاف کر دیتے اور بہت آسانی کے ساتھ شیخ کے اثرات کا خاتمہ کر دیا جاتا۔ یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ شیخ نے کیوں کر ساری عمر اپنے اس راز کو چھپانے کی کامیاب تدابیر اختیار کیں۔ افغانستان میں وہ عہدۂ وزارت پر فائز ہوئے۔ مصر میں وہ ازہر کے علما کو اپنا شریکِ کار بنانے میں کامیاب ہوئے۔ ترکی میں باوجود ترکی اور ایران کی باہمی مخاصمت کے، وہ اپنی قومیت کو چھپائے رہے اور باوجودیکہ ایران میں (بقول مرزا لطف اللہ خاں) بہت سے لوگ جانتے تھے کہ شیخ ایرانی ہیں اور خود شاہِ ایران بھی اس راز سے واقف تھا لیکن وہ راز بدستور راز ہی رہا اور اُس وقت بھی جب کہ شاہ سلطان عبدالحمید خاں کو اس امر پر مجبور کر رہا تھا کہ شیخ کو ایرانی حکومت کے حوالے کر دیا جائے وہ یہ ثابت نہ کر سکا کہ شیخ دراصل ایرانی ہیں۔

ایک امرِ واقعہ اور بھی قابلِ غور ہے۔

شیخ کے ایک عزیز سید محمد پاشا حاکمِ کونان کی شادی امیر دوست محمد خاں کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ (اس واقعہ کی کسی ایرانی سوانح نگار نے اب تک تردید نہیں کی) نیز امیر محمد اعظم خاں کے زمانے میں شیخ عہدۂ وزارت پر بھی فائز ہو گئے تھے۔ اِن دونوں واقعات کو مختلف اہلِ قلم نے بار بار دُہرایا ہے۔ تاریخ افغانستان کا ہر مطالعہ کرنے والا جانتا ہو گا کہ اُس زمانے میں ایران اور افغانستان کے تعلقات نہایت خراب تھے حتّٰی کہ چند مرتبہ دونوں میں

لڑائی بھی ہو چکی تھی اور نہ صرف سیاسی تعلقات خراب تھے بلکہ مذہبی تعصّبات بھی دونوں قوموں کے درمیان منافرت پیدا کر چکے تھے۔ ان حالات میں ایک ایرانی کا کسی طرح افغانی بن کر عہدۂ وزارت حاصل کر لینا یا اس کے خاندان میں امیر کی بیٹی کا بیاہ جانا تقریباً ناممکن تھا۔ تاہم یہ دونوں واقعات ابھی تک فریقین کے درمیان مسلّمہ ہیں۔ مزید برآں ایک نکتہ اور بھی یاد رکھنے کے قابل ہے؛ وہ یہ کہ شیخ جو فارسی زبان لکھتے اور بولتے تھے وہ ایرانی فارسی نہ تھی۔ اُن کی تقریریں اور تحریریں ہمارے سامنے موجود ہیں اور اس بحث کا فیصلہ مشکل نہیں کہ شیخ کی فارسی ایرانی تھی یا افغانی۔ اگر اس بیان کو صحیح مان لیا جائے کہ شیخ کی ابتدائی زندگی ایران ہی میں گزری اور اُنھوں نے تعلیم بھی ایران ہی میں پائی تو ناممکن ہے کہ وہ اپنی ابتدائی تعلیم و تربیت کے اثرات کو مٹا سکتے۔ نام کا بدل لینا آسان تھا لیکن زبان کا بدلنا تقریباً ناممکن تھا۔ میں نے ایک مرتبہ مرحوم پروفیسر براؤن[۲۵] کے سامنے بھی یہ بحث پیش کی تھی اور اُن کو بھی اتنا ماننا پڑا تھا کہ شیخ جو فارسی بولتے اور لکھتے تھے وہ جو کچھ بھی ہو، ایرانی زبان تو نہ تھی۔ پروفیسر مرحوم نے اپنی تصانیف میں شیخ کے بہت کچھ حالات لکھے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ بلنٹ[۲۶] کے بعد مرحوم ہی یورپین مستشرقین میں سے پہلے شخص تھے جنھوں نے شیخ کی عظیم الشان شخصیت کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اُنھوں نے شیخ کی زندگی کے متعلق بہت کچھ تحقیقات کی، لیکن شیخ کی قومیت کے متعلق وہ کوئی قطعی رائے قائم نہ کر سکے اور نہ اُنھوں نے اپنی تصانیف میں کوئی ایسا فیصلہ کن واقعہ بیان کیا جو اس قضیے کا فیصلہ کرتا۔ لیکن زبانی گفتگو کے دوران میں

۲۵۔ دیکھیے ضمیمہ جات۔ ۲۶۔ دیکھیے ضمیمہ جات۔

انھوں نے ضرور مجھ سے یہ کہا کہ اُن کا رجحان اسی طرف ہے کہ شیخ افغانی نہ تھے بلکہ ایرانی تھے۔ مگر یہ کہہ کر انھوں نے اپنی اس گفتگو کو " واللہ اعلم بالصواب" پر ختم کر دیا !....

جدید سیاسیاتِ مشرق کے متعلق وسیع معلومات رکھنے والا ایک مشہور صاحبِ قلم ہینس کوہن (Hans Kohn) بھی اپنی کتاب " ہسٹری آف نیشنل ازم اِن دی ایسٹ " میں شیخ کی قومیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ :۔

" جمال الدین کی ولادت ، اصل اور ابتدائی زندگی کے متعلق ہماری معلومات بہت ہی کم ہے۔ تاہم وہ خود کہا کرتے تھے کہ وہ ۱۸۳۸ء میں افغانستان میں پیدا ہوئے اور انھوں نے بخارا میں تعلیم حاصل کی "

ایک اور یورپین مستشرق (Louis Massignon) نے ۱۹۱۰ء میں (Reveu du Monde Mussulman) کی بارھویں جلد میں جمال الدین کے حالات لکھتے ہوئے اپنی رائے ظاہر کی ہے کہ :۔

جمال الدین میں ہم ایک خالص ایرانی تہذیب کا نمونہ دیکھتے ہیں۔ دوسرے افغانیوں کی طرح وہ تھے تو سُنّی مگر مزاج اور تہذیب کے اعتبار سے وہ ایرانی تھے .... وہ سادات میں سے تھے اور اُن کا سلسلۂ نسب مشہور محدّث ترمذی سے ملتا تھا۔ اُن کا خاندان ایک ہزار برس سے زیادہ ایران میں آباد رہا تھا .... جمال الدین کی تربیت اور تہذیب حد درجہ ایرانی تھی "

لیکن یورپین مستشرقین ۔ بہ استثنائے براؤن ۔ شیخ کے حالات میں بعض ایسے مغالطوں کا شکار ہوئے ہیں کہ اُن کے بیانات پر اعتبار کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً اِن ہی (Louis Massignon) نے شیخ کے ایران سے نکالے جانے کا ذکر کرتے ہوئے ایک عجیب بات لکھ دی ہے کہ جمال الدین کو

شاہزادہ عبدالعظیم نے ایران سے نکالا اور رضا کرمانی در اصل" شاہزادہ عبدالعظیم" ہی کو قتل کرنا چاہتا تھا مگر اُس نے قتل کر دیا ناصرالدین شاہ کو! مؤلف کو مغالطہ یہ ہؤا کہ درگاہِ شاہ عبدالعظیم کو جہاں شیخ پناہ گزیں تھے اُس نے شاہزادہ عبدالعظیم بنا دیا! شیخ کے اخراج کے سلسلے میں اس نام کے کسی شاہزادے کا وجود ہی نہیں مگر درگاہ کو شاہزادہ سمجھ لینا اِس امر کی دلیل ہو کہ مشرق کے مسایل پر یورپین صاحبانِ قلم کچھ اس طرح قلم برداشتہ لکھتے ہیں کہ واقعات کی تحقیق اصل ذرایع سے نہیں کرتے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ درگاہ شاہ عبدالعظیم شاہزادہ عبدالعظیم بن جاتی ہو!:-

ایران کے مشہور صاحبانِ قلم اور وطن پرستوں میں آقائے نقی زادہ نے جو شیخ کی زندگی سے بہت کچھ واقفیت حاصل کرچکے ہیں، اخبار کاوہ (شمارہ ۳ و ۹) میں ایک مفصّل مضمون لکھا تھا لیکن وہ بھی اس خاص امر کے متعلّق کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکے۔ چنانچہ خود لطف اللہ خاں اُن کے مضمون کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" زندگانیٔ سید را تا یک درجہ روشن ساختہ است ولے باز اظہارِ تردید در ایرانی بودن سیّد خود داری نفرمودہ و در آخرِ مقالہ نوشتہ اند کہ ایرانی بودنِ سیّد قریب بہ یقین بودہ است "

آخری دلیل شیخ کے افغانی ہونے پر مفتی عبدہ کا بیان ہو۔ مفتی عبدہ شیخ کے ارشد تلامذہ تھے اور ان کے وفادار دوست رازدار اور شریکِ کار تھے۔ مفتی موصوف نے بار بار اس امر کا اعادہ کیا ہو کہ شیخ افغانی تھے۔ بلنٹ اور مفتی عبدہ یہ دو شیخ کے سب سے زیادہ معتبر احباب تھے اوران دونوں کی شہادتیں یقیناً قولِ فیصل ہیں۔ لیکن قطع نظر ان بیانات کے جیسا کہ شروع

میں عرض کیا جاچکا ہے، فریقین کے درمیان اس قضیے کا بہتر فیصلہ خود شیخ ہی کے ایسے بیانات سے کیا جاسکتا ہے جن کی صحت ناقابلِ انکار ہو اور یہی فیصلہ قطعی فیصلہ ہو سکتا ہے۔

۱۔۔۔ شیخ کے خاص اور گہرے دوست بلنٹ کا ایک قلمی روزنامچہ میری نظر سے گزرا جو اب ان کی بہن مس ڈروتھی کارلٹن Dorothy Carlton کے پاس موجود ہے، وہ ۱۹۲۳ء میں لندن کے قریب South water ساؤتھ واٹر میں بلنٹ کے آبائی مکان میں رہتی تھیں۔ اس روز نامچہ میں لکھا ہے کہ جب بلنٹ نے شیخ سے اس باب میں سوال کیا تو شیخ نے فرمایا کہ اُن کے خاندان کے مورثِ اعلیٰ سیّد علی ترمذی (مؤلف صحیح ترمذی) تھے جن کو ۶۰۰ سو برس پہلے امیر تیمور ترمود (ترکستان) سے افغانستان لائے تھے۔

۲۔۔۔ بلنٹ نے اپنی کتاب "تاریخ قبضۂ مصر"

میں جابجا شیخ کے

بیانات درج کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ ہمیشہ بلاتکلّف اپنے افغانی ہونے کا اعلان کیا کرتے رہتے تھے۔

۳۔۔۔ اسی طرح اپنی کتاب "ہندوستان بہ عہدِ رِپن"

میں بھی بلنٹ شیخ کے حوالہ سے اُن کے افغانی ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔

۴۔۔۔ خود شیخ نے اپنی تاریخ افغانستان میں اپنے خاندان سادات کا ذکر کیا ہے گو کہ اپنے ذاتی حالات کچھ نہیں لکھے۔

۵۔۔۔ برہان الدین قلیچ خاں نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ جریدۂ "ملت" قسطنطنیہ کی اشاعت (مورخہ ماہِ تشرین ثانی ۱۳۲۶ھ ہجری۔ ۱۹۲۶ء) میں خود شیخ کا ایک قول نقل کیا ہے۔ برہان الدین شیخ کے خاص تلامذہ میں سے

تھے اور کوئی وجہ نہیں کہ اُن کے بیان کو غلط یا مبالغہ آمیز سمجھا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ :-

چوں روز ہا می شنوم کہ حضرت اُستاد را بعض ہا ایرانی می پندارانند، بنا بریں یک محاورہ را کہ دریں خصوص حضرتِ استادم بامن کردہ اند عیناً می نویسم۔ (من از سادات معروفِ کنز بودہ در سال ۱۲۵۴ھ ہجری در افغانستان تولّد شدم۔ شیخ جمال الدین[۲۶] کہ از رؤسائے بابی واز اہالیٔ ایران می باشد بہ ہر جائے کہ من رفتہ ام اوہم محقق بہ آں جا رفتہ است۔ ازیں سبب ایرانی ہا دانستہ یا نادانستہ مرا شیخ جمال الدین ایرانی می پندارند۔ ایں ظنِ فاسد مردود و سراپا خطا آلود و دروغِ مطلق است۔ اگر مرا خود من خوب ترمی شناسم اینک خود من می گویم کہ من اصلا ایرانی نیستم و افغان می باشم۔ تمام افغانی ہا مرا می شناسند و تصدیقِ من می کنند۔"

۶۔ "ہیئت علمیہ" استنبول نے (جس کے صدر ابراہیم علاؤالدین بک تھے) "جریدۂ مصوّرہ" میں شیخ کے حالات شایع کیے تھے۔ یہ کتاب ۱۹۲۷ء میں مطبع ثبات استانبول سے شایع ہوئی ہے۔ اس میں بھی شیخ کی زبان سے اس قضیے میں یہی فیصلہ ہوا ہے کہ۔

"ہیچ احتیاج بہ ایں ندارم کہ خود را بہ یک ملّتے نسبت دہم۔ من افغان می باشم۔"

جمال الدین بابی کے متعلق شیخ کا اشارہ بہت معنی خیز ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جمال الدین بابی اُن اطراف میں بہت عرصہ تک کام کرتے رہے جہاں شیخ مصروفِ کار تھے اور ناممکن نہیں ہے کہ اس زمانے کے وقایع نگاروں نے ان دو ناموں کو مخلوط کر کے یہ تکلیف دہ مغالطہ پیدا کر دیا ہو۔

۲۶۔ دیکھیے ضمیمہ نمبر ۳

علاوہ واقعات کے ایک دوسری طرح سے بھی خود شیخ نے اس قضیے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ انھوں نے یہ کہہ کر کہ "ہیچ احتیاج بہ این نہ دارم کہ خود را بہ یک ملتے نسبت دہم"، گویا اپنی زندگی کا ایک بہترین خلاصہ بیان کر دیا اور اسی پر ساری بحث ختم ہے۔ جمال الدین جیسا مجاہد بزرگ اور مجدّدِ اعظم آباو اجداد کی فضیلت اور بلند مقامی کا محتاج ہی کب تھا۔ اس کے نسب کا حال کچھ بھی معلوم نہ ہوتا تب بھی ہماری یہ لاعلمی کیا اس کی عظمت کو ایک ذرّہ کم کر دیتی؟ نسل و خاندان کی نسبتیں ایسے لوگوں کے لیے جن کی روحانی عظمت اور عالمانہ تبحّر اور سیاسی تدبُّر ناقابلِ انکار ہو محض بے معنی ہوتی ہیں۔ اس لیے درحقیقت یہ ساری بحث شیخ کی سیرت کا کوئی اہم اور ضروری جزو نہیں شیخ اسلامی حرّیت و عصبیت کے علمبردار بن کر ایک ایسا کھُلا ہوُا پیام ساری دنیائے اسلام کے لیے لائے تھے جو جغرافیٔ حدود کا پابند نہ تھا نہ خود پیامبر کی عظمت جغرافیٔ امتیازات کی پابند ہو سکتی تھی۔ وہ افغانی تھے محض اس لیے نہیں کہ افغانی خون اُن کی رگوں میں متحرک تھا بلکہ اس لیے کہ اُنھوں نے افغانیوں کو بھی عالمگیر اسلامی اتحاد کی زنجیروں میں باندھ لیا۔ وہ ایرانی بھی تھے اس لیے کہ انھوں نے سب سے پہلے حریت کی وہ شمع فروزاں ایران میں روشن کی جس نے ایرانی دلوں کے آتش خانوں کو ایک دفعہ پھر گرم کر دیا۔ وہ ترک بھی تھے اس لیے کہ استبداد کے خلاف انھوں نے ملّتِ عثمانی کو آزادی و عزّت کا راستہ بتایا۔ وہ مصری بھی تھے اس لیے کہ انھوں نے مصریوں کی ٹھنڈی راکھ میں چنگاریاں پیدا کر دیں۔ وہ ہندی تھے، روسی تھے، عراقی تھے، شامی تھے، سب کچھ تھے۔ وہ اگر شیعہ تھے تب بھی جلیل القدر تھے اور سنّی تھے تب بھی اُن کا منصب

بہت بلند اور ارفع تھا۔

ابر جب آسمان پر گھر کر آتا ہے اور ہر طرف برستا ہوا گزرتا ہے تو کوئی ایک قریہ یا ایک شہر یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ یہ بارانِ رحمت صرف ہمارے ہی لیے ہے اور یہ بادل صرف ہمارے ہی ہیں —— بلا شرکتِ غیرے — وہ ابر آسمان کی وسعت پر اس طرح برستا ہوا جاتا ہے کہ ہر قصبہ اور شہر اور صحرا اور ویرانہ اُس سے اپنا حصّہ پاتا ہے۔ سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے مگر کیا وہ صرف مشرقیوں ہی کا حصّہ ہے؟ ۔ وہ مغرب میں غروب ہوتا ہے مگر کیا وہ مغربیوں ہی کا حصّہ ہے؟ جب اس کی پُر نور شعاعیں مشرق اور مغرب کے دامنوں میں یکساں جگہ پائیں تو کس کی مجال ہے کہ وہ خورشیدِ عالمتاب کو محض اپنے ہی لیے مخصوص سمجھے!۔ حقیقت یہ ہے کہ جمال الدین کی شخصی اور انفرادی حیثیت خود اُن کے "پیام" میں محو ہوگئی تھی —— اس طرح کہ دو چیزیں ایک دوسرے سے جُدا نہ رہی تھیں۔ جہاں جمال الدین تھے وہاں اُن کا پیام تھا — آج تقریباً نصف صدی بعد جہاں اُن کا پیام ہے وہاں وہ بھی موجود ہیں۔ اُن کی زندگی کی داستان دنیا کے ہر گوشہ میں بکھری ہوئی ہے۔

اُڑائے کچھ ورق لالے نے کچھ بُلبل نے کچھ گُل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

شیخ کی زندگی کی یہی ایک بڑی خصوصیت ہے جس نے اُن کو داعیان حق کی صف میں ممتاز کردیا ہے۔ ہر داعی عموماً اپنے ملک اور اپنی قوم کے لیے ایک پیام لاتا ہے اور اُس قوم اور ملک کی تاریخ میں اُس کا نام آبِ زر سے لکھا جاتا ہے لیکن جمال الدین کا نام بہت سے اسلامی اور غیراسلامی

ممالک میں اپنی جگہ بنا چکا ہے۔ اس عجیب و غریب زندگی کی داستان کہاں کہاں سے چنی اور سمیٹی گئی ہے۔ افغانستان، ہندوستان، مصر، فرانس، انگلستان، ایران، ترکی، روس، بخارا، عراق، حجاز ہر جگہ وہی ایک نقشِ قدم ہے۔ جو سجدۂ صاحبِ نظر ان کا منتظر ہے!

دور دراز کنڑ میں پیدا ہوکر قوم افغان کا یہ فرزندِ جلیل استنبول کی خاک میں محوِ خوابِ ابد ہے۔ اُس نے اسلامی دنیا کے مشرق و مغرب کا دامن ایک دوسرے سے باندھ دیا اور ایسی گرہ لگا دی ہے جس میں آنے والی صدیوں کے پُر شکوہ امکانات کی ایک دنیا محفوظ ہے۔

ایک سوانح نگار کے لیے وطنیت اور قومیت کی ضمنی بحث میں اُلجھ کر رہ جانا ایسا ہے کہ جیسے کوئی شخص ایک سر بہ فلک پہاڑ پر چڑھنے کا تہیہ کرکے اُٹھے اور پھر دامنِ کوہ میں ایک ہی سنگریزے کو لے کر بیٹھ رہے!

دورِ اوّل

عہدِ انتظار

دنیائے اسلام پر مصائب اور ابتلا کے بادل جھوم رہے تھے۔ اور ہر طرف مغرب مشرق پر چھایا ہوا تھا۔ افقِ مشرق پر کچھ برسے ہوئے بادل تھے جن کی بجلیاں فنا ہو چکی تھیں۔ ہر طرف ایک عالمِ انتشار تھا۔ اس زمانے میں دنیا کے سب سے کم ترقی یافتہ اور سب سے زیادہ پسماندہ ملک افغانستان میں اتحادِ اسلام کا داعی جمال الدین پیدا ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ایک طرف ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت حکومت کی شکل اختیار کر چکی تھی اور دوسری طرف وسط ایشیا میں خیوا اور بخارا کی آزادی روسی شہنشاہیت کی قربان گاہ پر آخری سانس لے رہی تھی۔ مصر میں سلطان ترکی کی سیادت اور خدیو کے اقتدار کا خاتمہ ہو چلا تھا ایران میں یورپین دول اپنا اپنا حصّہ بانٹ رہی تھیں۔ ترکی مریضِ ناتواں اب بیماری کے آخری درجے میں موت کا مقابلہ کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا اور یورپ کے دشنہ در آستین اطبّا مریض کے سرہانے بیٹھے ہوئے اس کی آخری ہچکی کا انتظا کر رہے تھے۔

اس عہدِ ابتلا میں جب ہمتیں پست دل ضعیف اور حوصلے کمزور ہو چکے

تھے عالمِ اسلام کی ہمہ گیر تاریکی کے اندر کبھی کبھی اور کہیں کہیں ظلمت کے پردوں میں روشنی کی ایک شعاع چمک جاتی تھی اور چمک کر غائب ہو جاتی تھی۔ مختلف اسلامی ممالک میں کچھ اللہ کے بندے موت کی سختی سے گھبرا گھبرا کر اُٹھتے تھے، چند قدم چلتے تھے، کچھ کہتے تھے، اور پھر گر جاتے تھے!۔ امید کا چراغ کم و بیش سو برس تک ٹوٹے ہوئے قدیم طاقوں میں ٹمٹماتے رہنے کے بعد اگر گل نہ بھی ہوا تھا تو گل ہوا ہی چاہتا تھا! سونے والوں میں سے کبھی کوئی "بار بستر" ایک دو کروٹیں لیتا تھا اور پھر فنا کی نیند میں غافل ہو جاتا تھا۔ دلوں کے آتش خانے سرد پڑے تھے۔ اگر کوئی چنگاری باقی تھی تو وہ بھی راکھ کے ڈھیر کے اندر دبی ہوئی تھی!۔

مگر موت ہی کے دامن سے حیات بندھی ہوئی ہے۔ چنانچہ فنا کی شدّت اور سخت گیری داعیانِ حق کی روحوں کو بیدار کر رہی تھی اور اکثر اسلامی ممالک میں موت کی گھنٹی کے ساتھ ہی ساتھ زندگی کا نقّارہ بھی بج رہا تھا۔ قسطنطنیہ میں ابو الاحرار مدحت پاشا[۲۹] اور اُن کے معاصرین مصطفیٰ پاشا، رشید پاشا، ضیا پاشا، علی سعاری، فواد پاشا، عمر پاشا، نامق کمال بے[۳۰] اور کتنے ہی ایسے قوم پرست، ایران میں آنے والے عہدِ انقلاب کے حرّیت پرست علما اور مجتہدین:۔ سید عبد اللہ، سید محمد طباطبائی، حاجی مرزا حسن شیرازی، حجۃ الاسلام شیخ ہادی نجم آبادی[۳۱]، مصر میں مصطفیٰ کامل[۳۲] اور اُن کے شرکائے کار، ٹیونس میں خیر الدین پاشا[۳۳] الجیریا میں امیر عبد القادر[۳۴]، وسطِ ایشیا اور ترکستان میں شیخ محمد بیرم وغیرہ نجد میں محمد بن عبد الوہاب، طرابلس[۳۵] میں امام محمد بن سنوسی[۳۶]۔ یہ ایک سلسلہ تھا

۲۹۔ دیکھیے ضمیمہ ۳۰۔ دیکھیے ضمیمہ ۳۱۔ دیکھیے ضمیمہ ۳۲۔ دیکھیے ضمیمہ

۳۳۔ دیکھیے ضمیمہ ۳۴۔ دیکھیے ضمیمہ ۳۵۔ دیکھیے ضمیمہ ۳۶۔ دیکھیے ضمیمہ

داعیانِ حریّتِ اسلامی کا جو باوجود ناموافق حالات کے دنیائے اسلام میں پھیلتا جاتا تھا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی جمال الدین افغانی تھے۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے وہ ان تمام مردانِ میدان میں اپنی ایک مخصوص شانِ امتیاز رکھتے تھے۔ حرّیت اور آزادی کی راہ میں یہ جتنے راہ رو تھے ان میں سے ہر ایک کسی ایک ہی ملک یا ایک ہی جغرافی حد کے اندر اپنا کام کر رہا تھا۔ مصطفےٰ کامل نے جو کچھ جد و جہد کی وہ مصری قوم کے نقطۂ نظر سے، مدحت پاشا نے جو قربانیاں گوارہ کیں وہ صرف ملّتِ عثمانی کی خاطر، عبدالوہاب کی تحریک نجد میں مرکوز رہی، سنوسی کا جولانگاہ طرابلس رہا، اِن سب کا پیام ایک تھا لیکن ان میں سے اکثر کا دائرۂ عمل محدود تھا۔ لیکن جمال الدین تمام جغرافی حدود سے آزاد ہوکر اسلامی ممالک کی فضا میں پھیل گیا اس نے متفرق تحریکات کو ایک ہی مرکز پر متحد کر دینے کی کوشش کی، وہ ایک شعلہ کی طرح بھڑکتا ہؤا افغانستان سے اٹھا تو مصر، ایران، ترکی، ہندوستان، عراق، مراقش، بخارا اور ترکستان تک آگ اور نور برساتا ہؤا گزر گیا۔ فی الحقیقت دنیائے اسلام کے عہد جدید کی تاریخ میں کوئی نام اس قدر ہمہ گیر اور وسیع اور اس قدر گوش آشنا نہیں مل سکتا۔ مراقش سے ترکستان اور لندن و پیرس سے پیٹروگراد تک جمال الدین کی آواز اس طرح سُنی گئی جس طرح کبھی پہلے گزشتہ چند صدیوں میں تنہا کسی ایک شخص کی نہ سُنی گئی تھی۔ شیخ کا یہ شخصی امتیاز جو اُن کی روحانی عظمت کا ایک عکس تھا، ناقابلِ انکار ہے۔

افغانستان میں شیخ کی ابتدائے زندگی ایک عہدِ انتظار تھا جب وہ اپنے وطن کے فتنوں میں اپنی زندگی کے وسیع ترمیدانوں کے لیے فکر و نظر کا سرمایہ حاصل کر رہے تھے۔ انیسویں صدی عیسوی کے نصف اوّل میں افغانستان خانہ جنگی

اور طوائف الملوکی کا شکار تھا، نہ کوئی مستقل حکومت قائم تھی نہ ہوسکتی تھی۔ افغان قوم کی قومی زندگی کا کوئی نظم قایم نہ تھا۔ درحقیقت کوئی قومی زندگی ہی نہ تھی۔ سرزمینِ افاغنہ امن و امان کے نام سے نا آشنا تھی۔ ۱۲۵۰ھ ہجری (۱۸۳۴ء) میں ہرات پر ایرانیوں نے حملہ کیا اور کامران کو سخت شکست اُٹھانی پڑی لیکن بعد کو انگریزوں کی امداد سے وہ سنبھل گیا۔ برطانوی پالیسی اس وقت افغانستان میں مستقل مداخلت کا فیصلہ کرچکی تھی اسی لیے شاہ شجاع کو دوست محمد خاں پر حملہ کرنے کی ترغیب دی گئی۔ چنانچہ شجاع نے دوست محمد خاں کو شکست دے کر ملک کے بڑے حصّے پر قبضہ کرلیا اور دوست محمد خاں انگریزی حکومت کے قیدی بناکر ہندوستان لائے گئے۔ تقریباً یہی زمانہ شیخ کی پیدائش کا زمانہ تھا۔ انگریزی اقتدار افغانستان میں قدم جماچکا تھا اور انگریزی سیاست کے مہرے افغانستان کی بساط پر لڑائے جارہے تھے۔ بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ افغانستان کی آزادی ختم ہوگئی اور جس طرح روس نے وسطِ ایشیا میں اپنا اقتدار قائم کرلیا تھا اُسی طرح برطانوی سیادت افغانستان میں قائم ہوجائے گی لیکن قدرت پردوں کے پیچھے اپنا کھیل رہی تھی اور نظروں سے پوشیدہ اس کا ایک جلیل القدر مہرہ اسی بساط کے ایک گوشے میں تیار ہو رہا تھا۔ انگریزوں کو اس وقت کچھ خبر نہ تھی کہ اس ملک میں اُن کی فوجوں کا پڑاو تین سال بھی قایم اور باقی نہ رہ سکے گا۔ اور ایک نیا طوفان آئے گا جس کی ابتدا چند افغان ڈاکوؤں اور لٹیروں سے ہوگی۔

جب انگریز اپنے قبضے کی بنیادیں مضبوط کرنے میں مشغول تھے تو دفعتاً غلزی قبیلے کے اندر شورش پیدا ہوئی اور قبائل کی ایک معقول تعداد

اس شورش میں شامل ہوگئے۔ غلزئی خواتین نے کابل کے راستے بند کردیے اور موقع کو مناسب سمجھ کر دوست محمد خاں کے لڑکے محمد اکبر خاں نے اُن سے اتحاد پیدا کرلیا اور صورتِ حالات سے فائدہ اٹھاکر ایک زبردست جمعیت اپنے ساتھ فراہم کرلی، یہاں تک کہ انگریزوں نے محسوس کرلیا کہ اکبر خاں کی بڑھتی ہوئی قوّت انگریزی اقتدار کو خطرے میں ڈال رہی ہو۔ چنانچہ اکبرخاں کے استیصال کا تہیہ کرکے حملہ کی تیاریاں شروع کردی گئیں۔لیکن غلزئی گروہ نے کابل کی شہر پناہ کے سامنے پہنچ کر شجاع کو محصور کر لیا اور خود شہر کابل کے اندر سخت بغاوت شروع ہوگئی۔ باغیوں نے باغ شاہ اور قلعہ محمد شریف پر قبضہ کرکے انگریزوں پر زندگی کے دروازے بند کر دیے۔ بہت سے انگریز باغیوں کے ہاتھ سے مارے گئے ملکی قبائل اس فتح کے بعد زیادہ تعداد میں غلزیوں کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے اور شجاع معہ انگریزوں کے ہر طرف سے گھر گیا۔ اب صلح کی تحریک شروع ہوئی بالآخر اس قول و اقرار کے ساتھ کہ افغانستان میں کسی جگہ کوئی انگریز قیام نہ کرنے پائے گا اور امیر دوست محمد خاں آزاد کیے جائیں گے انگریزی فوج کو افغانستان سے واپس جانے کی اجازت دی گئی۔ ساتھ ہی انگریزوں سے وعدہ لیا گیا کہ وہ بطور تاوان ۱۴ لاکھ روپیہ ادا کریں گے نیز چند انگریز بطور ضمانت افغانستان میں مقیّد رکھے گئے۔ اس معاہدے کے بعد انگریزی فوج کی واپسی شروع ہوئی۔ انگریزی فوج کا یہ وہ خوفناک سفر تھا جس کے دردناک واقعات تاریخ کے صفحات پر خون اور آنسوؤں سے لکھے گئے ہیں۔ انگریزوں کی اس فوج میں سے جو کابل سے ہندوستان کی طرف واپس ہوئی صرف ایک نفر واحد ڈاکٹر برایڈن

زندہ بچ کر افغانستان کی سرزمین سے باہر نکل سکا تھا۔ اس طرح ۱۸۴۲ء میں آخری دفعہ انگریزی فوج افغانستان سے واپس ہوئی اور اس واقعہ کے بعد سے افغانستان کے متعلق برطانوی حکمت عملی کا رُخ ہی بدل گیا۔ ابھی یہ معرکہ نہ ہوا تھا کہ ایک بارکزئی سردار نے شاہ شجاع کو قتل کر ڈالا۔ بقول شیخ جمال الدین۔

"شاہ شجاع کی طمع حکومت اس کی موت کا باعث ہوئی اور انگریزوں کی اس طمع نے کہ افغانستان پر انگریزی قبضہ قایم ہو جائے اُن کی قبریں بھی وہیں بنا دیں" نمبر ۳۷

اس طرح امیر دوست محمد خاں قیدِ فرنگ سے آزاد ہو کر پھر افغانستان واپس آئے۔ اُس زمانے کے ان واقعات میں ایک تاریخی توارد اور لطیفۂ غیبی قابلِ ذکر ہے۔ شاہ شجاع کے عہد کا وہ انقلاب جو وحشی اور جرائم پیشہ قبایل کی بغاوت سے شروع ہوا تھا بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ اختتام دورِ امان اللہ خاں کا واقعہ۔ ۱۸۴۳ء میں غلزئی قبیلہ بھی اسی طرح کابل کے نواح میں لوٹ مار کے لیے اُٹھا تھا جس طرح قدرت نے بچۂ سقہ کی حقیر شخصیت کو یکایک اپنا آلۂ کار بنا لیا، اور اس ادنیٰ لٹیرے کے ذریعے امان اللہ خاں کی حکومت کا شیرازہ درہم برہم کرا دیا۔ جس طرح آج سے ۸۵ برس پہلے امیر دوست محمد خاں کے لیے استقلال اور استقبال کا راستہ صاف ہوا تھا اسی طرح ۱۹۲۹ء میں شاہ نادر خاں غازی کے لیے حکیم مطلق نے کارسازی فرمائی۔ دونوں انقلابوں کے واقعات اور نتایج بہت ہی ملتے جلتے ہیں اور جس طرح ۱۸۴۲ء کا انقلاب افغانی قوم کی زندگی کا ایک نشانِ منزل تھا اسی طرح

---

۳۷ ۔ از "تتمۃ البیان فی تاریخ افغانستان" مؤلفہ سید جمال الدین افغانی مطبوعہ مصر ۱۹۰۱ء

۱۰ سال بعد ۱۸۲۹ء کے ہنگامے نے بھی تاریخ افغانستان کا ایک نیا ورق لوٹ دیا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ محض انسان کی تدبیر کی جیت ہے یا قدرت کا کھیل!

امیر دوست محمد خاں اپنی واپسی کے بعد جب ملک کے مختلف حصوں میں خانہ جنگی اور بد امنی کا انسداد کر رہے تھے اُس وقت ان کو سید صفدر کی سیاسی دلچسپیوں کے متعلق کچھ شبہات پیدا ہوئے۔ یعنی اُن کو یہ اطلاعیں ملیں کہ سید صفدر اُن کے بعض مخالفین سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ چنانچہ اِس شبہ کی بنا پر امیر نے سید صفدر کو معہ اہل و عیال کابل بلا لیا اور اُن کی جائیداد اور املاک کو بحقِ حکومت ضبط کرکے ان کا گزارہ مقرر کر دیا۔ یہ واقعہ غالباً ۱۸۴۷ء کا ہے۔

جب سید صفدر اس طرح کابل میں رہنے پر مجبور کیے گئے۔ تو شیخ کی عمر اس وقت آٹھ سال کی تھی۔ چنانچہ شیخ کی ابتدائی تعلیم زیادہ تر کابل ہی میں ہوئی۔ مؤلف "جمال الدین" (مطبوعہ مطبع ثبات استانبول) لکھتا ہے کہ

"معلّمین او از جملہ علمائے متبحر افغانستان شمار می رفتند کہ از جملہ آں یکے ماہر ابن علی نام یک ذات باعلم و فضل بودند"[۵۳]!

تقریباً تمام وقائع نگار سوائے صاحب بیداریٔ ایران اور مرزا لطف اللہ خاں کے اس حقیقت پر متفق ہیں کہ ۱۸ سال کی عمر تک شیخ کا قیام کابل ہی میں رہا جہاں خود ممدوح کے والد ماجد اور دیگر علماء و فضلا نے اس داعیٔ حق کے دماغ کو زیورِ علم سے آراستہ کیا۔ چنانچہ دس سال کے قلیل عرصے میں شیخ نے نحو، بلاغت، تاریخ، فلسفہ، تصوف، طبعیات، مابعد الطبعیات، ریاضی، ہیئت، طب، تشریح الابدان، ہندسہ، کلام یعنی جملہ

---

[۵۳] - افسوس ہے کہ باوجود تلاش و جستجو کے ان صاحب کے کچھ حالات معلوم نہ ہو سکے۔

علوم رائج الوقت حاصل کرکے اور علم کی اس دولت سے مالا مال ہوکر اپنی عمر کے اُس دور کو شروع کیا جس کے ساتھ کارسازِ قدرت نے عالمِ اسلامی کے آنے والے انقلاب کا دامن باندھ دیا تھا۔ لیکن صاحب "بیداریٔ ایران" اور لطف اللہ خاں کے بیانات ان شہادتوں کے بالکل خلاف ہیں جن سے مندرجہ بالا حالات اخذ کیے گئے ہیں۔ ان اختلافی بیانات پر بھی ایک نظر کرنا ضروری ہے۔

مرزا لطف اللہ خاں کہتے ہیں کہ شیخ ۱۲۶۴ھ ہجری میں قزوین بغرض تعلیم بھیجے گئے اور وہاں دو سال مقیم رہے۔ لطف اللہ خاں سید صفدر کے کابل آنے اور وہاں مقیم رہنے کا کوئی ذکر نہیں کرتے بلکہ یہ بیان کرتے ہیں کہ قزوین میں دو سال قیام کے بعد جب شیخ کی عمر ۱۱ سال کی ہوئی تو اُن کے والد اُن کو طہران لے گئے۔ طہران میں شیخ کی تعلیم کا حال یوں لکھتے ہیں کہ وہ وہاں سلمان خاں حاکم اسد آباد کے مکان پر مقیم ہوئے اور آقا سید صادق کے درس میں جانے لگے جو اُس زمانے کے مشہور علما میں سے تھے اُنھوں نے شیخ کی ذہانت کی بہت قدر کی۔ وہاں سے شیخ اپنے والد کے ساتھ عتباتِ عالیات گئے اور وہاں وہ شیخ مرتضیٰ عالم و مجتہد کے پاس مقیم ہوئے۔ چار سال تک وہ وہاں حصولِ علم میں مشغول رہے اور آخر کار سولہ سال کی عمر میں (۱۲۷۰ھ ہجری ۱۸۵۳ء) وہ پہلی دفعہ بمبئی آئے۔ بمبئی آتے ہوئے وہ بوشہر میں حاج عبدالنبی کے پاس ٹھیرے۔ ہندوستان آنے کے بعد۔

یک سال و چند ماہے در آں جا اقامت داشتہ وعلوم اروپائی و ریاضی وغیرہ را فرا می گیرد و ماہے چند در کلکتہ منزل حاجی عبدالکریم بودہ پس ازاں سفر مکّہ معظمہ می نماید۔[۳۹]

---

[۳۹] شرحِ حال و آثار سید جمال الدین اسد آبادی مؤلّف مرزا لطف اللہ خاں

بقول مرزا لطف اللہ خاں شیخ ۱۲۶۴ھ ہجری (۱۸۴۸ء) کے قریب مکہ معظمہ پہنچے، وہاں سے نجف و کربلا گئے پھر ۱۲۶۶ھ ہجری (۱۸۵۰ء) میں چار دن کے لیے اسد آباد آئے اس کے بعد چند ماہ طہران میں رہے۔ پھر خراسان کی طرف روانہ ہوئے۔

"طائفہ از ترکمان ہا بسر زوّار و قافلہ ریختہ زوّار را غارت و برہنہ می کنند۔ بعد از ملاقات سید بہ آں ہا حالتے پیدا می شود کہ آں ہا دست سید را بوسیدہ باکمال عذر تمام اموال و اثقال منہوبہ را بہ زوّار مسترد می دارند۔"[۱۴]

امام رضا کی زیارت کے بعد کابل آتے ہیں اور

"با امیرِ کابل مصاحب وندیم می شوند و بعد ازاں بخدمت امیر دوست محمد خاں می رسند۔"[۱۵]

تقریباً پانچ سال کابل میں مقیم رہتے ہیں اور اُسی زمانے میں "تاریخ افغانستان" عربی میں لکھتے ہیں۔ یہاں تک مرزا لطف اللہ کا اختلافی بیان ہے جس کو ہم مستند نہیں مانتے۔

شیخ کی ابتدائی زندگی کے متعلق دوسرا بیان جو عام شہادتوں سے مختلف ہے، صاحب "بیداریٔ ایران" کا بیان ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ سید صفدر کچھ پڑھے لکھے آدمی نہ تھے۔ جمال الدین نے البتہ کچھ دنوں مقامی مدرسے میں تعلیم پائی اور آٹھ سال کی عمر میں فارسی زبان میں کچھ لکھ پڑھ سکتے تھے۔ تھوڑی سی ترکی زبان بھی جانتے تھے۔ پھر وہ

"دس برس کی عمر میں اپنے باپ کے پاس سے بھاگ گئے اور ہمدان و

---

۱۴ شرح حال و آثار سید جمال الدین اسد آبادی مولفہ مرزا لطف اللہ خاں

۱۵ شرح حال و آثار سید جمال الدین اسدآبادی مولفہ مرزا لطف اللہ خاں

اصفہان و مشہد ہوتے ہوئے افغانستان آئے جہاں کہ انگریزی سیکھی مگر وہ اپنی ایرانی قومیت کو قبول نہ کرتے تھے"[۴۲]

اس موقعہ پر یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہو کہ خود دو بڑے ایرانی وقایع نگاروں میں بھی شیخ کی ابتدائی زندگی کے متعلق اس قدر اختلاف موجود ہو اور ان دونوں کی بیان کی ہوئی تفصیلات اس درجہ مختلف ہیں کہ تاریخی حیثیت سے دونوں میں سے کسی پر بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ پروفیسر براؤن نے بیداریِ ایران کے حوالے سے اس بیان کو نقل تو کیا ہو لیکن اس کی تصدیق یا تائید نہیں کی۔ دوسری تمام شہادتیں جو شیخ کی ابتدائی زندگی کے متعلق مہیا ہو سکیں سب اس بیان کے خلاف ہیں۔ ان کا کوئی سوانح نگار آج تک ابتدائی عمر میں ان کے سفرِ ایران کا کوئی پتہ نہیں چلا سکا۔ معلوم یہ ہوتا ہو کہ مرزا لطف اللہ خاں اور صاحب "بیداریِ ایران" کا مرکزِ خیال صرف شیخ کی قومیت کا سوال ہو۔ ہر پھر کر اور گھوم گھام کر موقعہ اور بے موقعہ دونوں بزرگ اس بحث کو بار بار اٹھاتے ہیں اور اپنی رائے کی تائید میں ہر طرف سے شہادتیں جمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ اُن کے بیانات میں ربط و یابس زیادہ اور حقائق کی مقدار بہت کم ہو جاتی ہو۔

صرف ایک بیان اور ہم کو ایسا ملتا ہو جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ ابتدائی عمر میں شیخ نے ایران کا سفر کیا تھا۔ وہ بیان اعظمی کا ہو جو "مجلۂ کابل" میں شایع ہوا ہو۔ آیندہ صفحات میں اس بیان کو بھی نقل کیا گیا ہو لیکن اس سے بھی یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ شیخ دس برس کی عمر میں اپنے باپ کے پاس سے بھاگ کر ہمدان و اصفہان گئے تھے، بلکہ اس بیان کے مطابق شیخ نے

۴۲ص: "تاریخ بیداریِ ایران"

یہ سفر سنہ ۱۸۶۰-۶۱ء میں کیا تھا جب یقیناً شیخ جوان ہوں گے: جہاں تک ابتدائی عمر میں شیخ کے ایران میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے کا سوال ہی، ہم مرزا لطف اللہ خاں اور صاحب تاریخ "بیداریٔ ایران" کو نظر انداز کرنے پر اس لیے مجبور ہیں کہ دوسرے کسی بیان سے اُن کی تصدیق نہیں ہوتی اور خود یہ دونوں راوی اس قدر ضعیف ثابت ہوچکے ہیں کہ تنہا ان کے بیان پر اعتماد کرنا اصولاً نامناسب ہی۔ بہر حال ہم اپنے بیانات کو ہر باب میں مصدقہ روایات کی کثرت پر مبنی کرتے ہیں اور سلسلۂ بیان اس طرح جاری رہتا ہی کہ:-

سنہ ۱۸۵۵-۵۶ء میں جب امیر دوست محمد خاں قندھار کی طرف سفر کر رہے تھے اُنھوں نے سید صفدر کی جائیداد واپس کر دی۔ اس طرح شیخ دس سال کابل میں مقیم رہ کر پھر اپنے والد ماجد کے ساتھ وطن واپس آئے۔ چند روز بعد (غالباً سنہ ۱۸۵۶ء میں) سید صفدر کا انتقال ہوگیا اس وقت شیخ کی عمر اُنیس سال کے قریب تھی۔ سید صفدر کے انتقال کے بعد ہی شیخ کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہؤا اور ان کا پہلا قدم اُن میدانوں کی طرف اٹھا جن میدانوں میں ان کو اپنی تمام عمر حق و باطل کی صف آرائی میں گزارنی تھی۔

ہندوستان و حجاز

امیر دوست محمد خاں کی مسند حکومت کے کونے چاروں طرف کی ہواؤں سے ہر وقت اُڑتے رہتے تھے۔ جمال الدین کی نوجوانی اس سیاسی مدّوجزر کا تماشہ دیکھ رہی تھی لیکن ابھی تک وہ ایک ناظر کی حیثیت سے طوفانی سمندر کے ساحل پر کھڑے ہوئے تھے۔ ابھی ان کی کشتی موجوں کے دامن میں نہ گئی تھی۔ عمل کے میدان سے ان کا وجود

دور تھا اور وہ وقت ابھی نہ آیا تھا جب وہ ایک مستقل سیاسی مطمح نظر اور مسلک لے کر بروئے کار آتے اور نہ ابھی ان کا جوہر اصلی پختہ اور مکمل ہوا تھا۔ دنیا کے ہر بڑے مصلح اور روحانی قاید اور مجدد کو اس عہد انتظار سے گزرنا ہوتا ہے۔ پہاڑوں کی وادیوں میں تاریک حجروں میں غاروں میں صحراؤں میں ویرانوں میں، اُن کو فکر و نظر حاصل کرنے کے لیے ایک قسم کا اعتکاف کرنا پڑتا ہے۔ یہ اُن کی تیاری اور امیدواری کا زمانہ ہوتا ہے۔ وہ زمانہ جب کچّا لوہا پکّا بنتا ہے!۔

شیخ نے حاکموں اور مدعیانِ حکومت کی شام و صبح اپنے وطن میں خوب دیکھ لی تھی، لیکن ابھی محکوم اقوام کی زندگی کا مطالعہ بھی اُن کو کرنا ضرور تھا۔ وہ حج بیت اللہ کا ارادہ کرکے گھر سے نکلے اور چند روز ہندوستان میں قیام کرکے منزلِ مقصود کی طرف چلے گئے۔ ہندوستان میں ان کا یہ مطالعہ محض سرِراہ تھا۔ اُنھوں نے اس ملک میں کیا دیکھا، کیا سُنا، کیا سمجھا، معلوم نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت ان کی زندگی محض طالبِ علمانہ تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ۱۸۵۶ء میں ابھی لال قلعہ کے اندر دودمان تیموری کا ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ باقی تھا۔ مغلوں کے تخت پر تیمور کی یادگار نظر تو آتی تھی لیکن "حکم کمپنی بہادر کا" تھا۔ خدا جانے اس وقت شیخ نے محسوس کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر وہ ہندستان سے اس زمانے میں اس طرح گزر رہے تھے کہ جیسے کسی کوہِ آتش فشاں پر!

۱۸۵۷ء کے خونی ہنگامہ کے لیے سارا مواد تیار تھا اور حکومت اور محکومیت کی ایک خونی ٹکر ہونے والی تھی۔ تعجب نہیں اگر شیخ نے اس وقت بھی اس آتش فشاں کے کلیجے کی آگ کو محسوس کر لیا ہو اور اسی قسم کے ابتدائی تصورات اور تاثرات اُن کی آیندہ زندگی میں اُن کے لیے چراغ راہ بنے ہوں۔ کیا تعجب

ہے! افسوس ہے کہ پہلے سفر کی روئداد اس قدر نابود ہے کہ ہم کو یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ ہندستان میں شیخ کہاں کہاں گئے اور انھوں نے کن کن مقامات پر قیام کیا، کس کس سے ملے اور کیا کیا دیکھا۔ سوائے اس کے کہ۔

" بعضے شہرہائے مختلف ہند را بطور غیر معروف سیاحت کردہ ضمناً ریاضی جدید و پارہ علوم کہ تازہ بہ آں خاک قدم گزاشتہ بود، آن را تحصیل کرد و در سال بستم سنِ شریف خود کہ بہ اواخر ۱۲۷۳ سنہ ہجری بودہ بہ مقصد تشریف بکعبۂ معظمہ رہسپار گردید[۴۳]"

پروفیسر براؤن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دفعہ شیخ ایک سال اور کچھ ماہ ہندستان میں رہے اور اس کے بعد حجاز تشریف لے گئے۔

اگر یہ معلوم ہو سکتا کہ شیخ نے اُس حرم قدس میں اور کعبۃ اللہ کی دیواروں کے سائے میں کیا کیا سعادتیں حاصل کیں، مستقبل کے کیا کیا جلوے دیکھے اور اپنے خالق کی بارگاہ میں اپنے ارادوں کے کیا کیا نقشے بنائے، تو شاید اُن آثار اور نقوش کا کچھ پتہ چل سکتا جنھوں نے شیخ کے قلبِ مطمئنہ کی تربیت و تہذیب کی ہوگی۔ مگر سوائے اس کے کچھ معلوم نہیں کہ جب ۱۸۵۷ء میں ہندستان ایک خوفناک اور خونریز انقلاب کی کشمکش میں مبتلا تھا، تو شیخ بیت الحرام میں معتکف تھے۔ وہ ایک سال کے قریب حجاز میں رہے لیکن اُن کی زندگی کا یہ ایک سال تاریخ کے صفحات سے بہت دور ہے۔

در سال ۱۲۷۳ سنہ ہجری بہ نیت ادائے فریضۂ حج اجرائے یک سیاحت کہ تخمیناً بقدر یک سال دوام کردہ، علاوہ بر ادائے حج در بارۂ اخلاق و عادات اقوام اسلامیہ کہ در راہ سیاحت او تصارف کردہ اند تتبعات خیلے عمیقانہ کردہ

[۴۳] - اعظمی - در مجلہ کابل"

است۔"[۴۴]

"خیلے عمیقانہ" کی کوئی تشریح و تفصیل میسر نہیں آئی۔ اس سفر کی ابتدا اور انتہا یہ ہے کہ

"بعد ادائے فریضۂ حج و زیارتِ مدینۂ طیبہ روانۂ شام و بیت المقدس وازان جا بہ عراق و بعضے شہر ہائے فارس مسافرت و سیاحت کردہ دو بارہ از راہِ کرمان خاک فارس وارد بلوچستان و ہندستان شدہ در سال ۱۲۸۰ھ ہجری موقعے کہ اعلیٰ حضرت دوست محمد خاں جہت صرف موسم شتا در جلال آباد متوقف بود، سید جمال الدین وارد خاک وطن و بہ دربار شاہی در جلال آباد بحضور شاہ معرفی و در سلکِ مصاحبین بادشاہی شامل گردید[۴۵]۔"

مندرجہ بالا دو بیانات پر شیخ کی پہلی سیاحت کے متعلق ایک یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سفر کتنے عرصے تک جاری رہا۔ ایک بیان سے تو صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس سیاحت میں ایک سال سے زیادہ صرف نہیں ہوا لیکن دوسرے بیان سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک سال کے قریب حجاز میں قیام کرکے پھر دوسرے اسلامی ممالک میں بھی تشریف لے گئے۔ اس صورت میں اعظمی کا بیان زیادہ قابلِ وثوق معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ شیخ کی روانگی اور واپسی کا وقت دوسری شہادتوں سے بھی مصدقہ ہے اور اس بنا پر اُن کی سیاحت کی مدت ۱۸۵۶ء اور ۱۸۶۱ء کے درمیان ہے۔ افغانستان میں وہ ۱۸۶۱ء کے قریب واپس آئے اور اسی وقت سے افغانی سیاسیات میں شیخ کی عملی دلچسپی کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔

---

۴۴ - "جمال الدین افغانی" مطبوعہ ثبات استنبول۔

۴۵ - اعظمی در مجلۂ کابل۔

افغانی سیاسیات

جس وقت شیخ اپنی سیاحت سے واپس آکر دربار شاہی میں بمقام جلال آباد حاضر ہوئے تو امیر دوست محمد خاں ہرات کی مہم پر جانے والے تھے۔ اس مہم کے ساتھ اُن کی زندگی کی مہم بھی ختم ہونے والی تھی۔ افغانستان کے سیاسی حالات کی صورت اس وقت یہ تھی کہ ہرات پر ایران کا قبضہ انگلستان کی سیاسی مصلحتوں کے بالکل خلاف تھا۔ انگریز دیکھ چکے تھے کہ ۵۶ء کے ہنگامہ میں ہرات پر ایران کا قبضہ ہندستانی مسلمانوں کے مشتعل کرنے کا باعث ہوگیا تھا اور اب انگریز کسی طرح بھی ہرات کو ایران کے قبضے میں چھوڑنا گوارا نہ کرتے تھے۔ اس وقت امیر دوست محمد خاں کے چچا زاد بھائی سلطان احمد خاں شاہِ ایران کی طرف سے ہرات کے گورنر تھے۔ اور خطبہ شاہِ ایران کے نام کا پڑھا جاتا تھا۔ چنانچہ انگریزوں نے

"امیر دوست محمد خاں کو ہرات پر قبضہ کرنے کی ترغیب دی اور عہد کیا کہ امیر اور اس کے جانشینوں کو ایک سالانہ رقم انگریزوں کی طرف سے دی جائے گی جو فوج کو درست کرنے اور قلعوں کو مضبوط رکھنے کے لیے کافی ہوگی تاکہ افغانستان کی امارت وسطی ایشیا میں روس اور ہندستان کے درمیان ایک مضبوط قلعے کا کام دے۔"[546]

امیر دوست محمد خاں نے انگریزوں کی تحریک کو قبول کرکے ہرات کو فتح کرلیا مگر فاتح اور مفتوح یعنی دوست محمد خاں اور سلطان احمد خاں دونوں اسی جنگ کے زمانے میں ہمیشہ کے لیے اپنے جھگڑے ختم کرکے اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

امیر دوست محمد خاں کے بعد اُن کے لڑکے اور ولی عہد شیر علی خاں نے

---

[546] ۔ "تاریخ افغانستان" مولفہ سید جمال الدین۔

زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور اُس اعتماد اور بھروسہ کی وجہ سے جو دوست محمد خاں کو شیخ پر تھا، شیر علی نے بھی شیخ کو اپنے دربار میں بطور مشیر و مصاحب رکھا۔ دوست محمد خاں کے انتقال کے وقت یہ اندیشہ قوی تھا کہ شیر علی اور اُن کے بھائیوں میں جنگ چھڑ جائے گی اس لیے کہ دوست محمد خاں نے بڑے لڑکوں کو محروم کرکے شیر علی کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا اور شیر علی کے بڑے بھائی سب ملک کے ایک ایک صوبے پر قابض تھے۔ لیکن اس موقعہ پر شیخ کی عاقبت اندیشی اور فراست نے معاملے کو بڑھنے نہ دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ دوست محمد خاں کے سب لڑکوں پر شیخ کا کافی اثر تھا اور سب بھائی ان کا احترام کرتے تھے یہی سبب تھا کہ تخت و تاج کے معاملے میں بھی وہ بڑوں کو چھوٹے کے مقابلے میں رضامند کرسکے بہرحال شیخ کے مشورے کے مطابق محمد اعظم وغیرہ شیر علی کے حق میں دست بردار ہونے پر راضی ہوگئے۔ لیکن بدقسمتی سے شیر علی کے پہلو میں ایک فتنہ پرداز وزیر محمد رفیق بھی تھا جو شیخ کی صلح جوئی کو پسند نہ کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ شیر علی کے بھائیوں کو بزورِ شمشیر مغلوب کرلیا جائے۔ وہ شیر علی کو آمادۂ فساد کرتا رہتا تھا اور شیخ اس شخص کی ریشہ دوانیوں اور فتنہ پردازیوں کو دیکھ رہے تھے۔ جو واقعات اس سلسلے میں پیش آئے اُن کا تذکرہ شیخ خود اپنی تاریخ افغانستان میں بہ این الفاظ کرتے ہیں کہ۔

"شیر علی کا ایک خاین وزیر محمد رفیق تھا جو خاندانِ غلجی سے نسبت رکھتا تھا اس نے امیر کو مشورہ دیا کہ سب بھائیوں کو گرفتار کرلیا جائے کیونکہ جب تک یہ لوگ افغانی صوبوں پر آزادانہ حکومت کریں گے اُس وقت تک شیر علی کی حکومت مضبوط نہیں ہوسکتی۔ اس تجویز کی خبر بھائیوں



امیر شیر علی خان

کو بھی ہوگئی جو فوج میں موجود تھے وہ رات ہی کو وہاں سے بھاگ کر اپنے اپنے علاقوں میں پہنچ گئے۔"

انھیں واقعات کو ایک افغانی وقائع نگار کی زبان سے بھی سُن لینا چاہیے۔

"ہنوز اعلیٰ حضرت امیر دوست محمد خاں در جلال آباد تشریف داشت کہ خبر حملۂ سردار سلطان محمد خاں مرحوم بفراہ بحضورش رسید۔ امیر کبیر در سال ۱۲۷۰ھ ہجری بغرض دفع وے از جلال آباد عازم کابل و رہسپارِ قندھار گردید۔ سید جمال الدین نیز در سلکِ ندیماں خاصہ بمعیتِ وے عازمِ قندھار شد .... خوش بختانہ دراثرِ تدابیر و افکار برجستہ وے بدون این کہ درزحمتِ مداخلۂ حرب عاید بشخصِ امیر کبیر شود یا دراں واقعہ محاربہ و خونریزی بعمل آید، عساکر و سردارانِ امیر کبیر بدون جنگ بہ تصرّفِ شہر فراہ و اخراج سلطان احمد خاں مرحوم موفق گردید۔

موقعیت سید جمال الدین دریں سفر مخصوصاً بہ دربار نفوذ و بلندی حاصل کرد............"

پس از حدوثِ ایں واقعہ کہ امیر کبیر بہ تنظیم ادارہ معاملاتِ فراہ وغیرہ مصروف بود سردار سلطان احمد خاں مرحوم بارِ دویم بہ ہرات از راہِ فارس حملہ کردہ آں شہر را از تصرّفِ عمال امیر کبیر خارج کردہ متصرّف گردید۔

سید جمال الدین کہ دریں امر دست و اغراض ناصرالدین شاہ فارس را شریک و شامل می دانست رفتن امیر کبیر را بہ سرعت طرف ہرات تجویز و تسخیر ہرات را بہ زودی التزام کردہ امیر کبیر روانۂ ہرات شد۔

شہر را بمحاصرہ انداخت۔ ولے در آغازِ این محاصرہ عمر سلطان احمد خان

بسری شده بر صحت ایزدی پیوست .... امیر کبیر آں شہر را بغلبہ و قہر فتح و بہ ہماں روز داخل شدہ بہ شہر دفات نمود "......

و الحاصل اعلیٰ حضرت امیر شیر علی خاں در سال ۱۲۷۹ھ ہجری در ہرات بہ مسندِ سلطنت تقرر گرفتہ سید جمال الدین را مشیر اوّل و مصاحبِ خاص مقرر فرمود ....

از نقطۂ نظرِ خدمات و نفوذِ قومی کہ محمد رفیق خاں لودی داشت، او را وزیرِ اوّل قرار دادہ ولے مرتبہ و عزّت و احترامِ سید جمال الدین بحضورش بالاتر ازاں بود ۔ محمد رفیق لودی از موقعیت خود نسبت بہ نفوذ و اقتدار سیّد جمال الدین اطمینان گاہے نہ داشت ۔ لہٰذا در صدد بود کہ صدمہ بموقعیتِ جمال الدین وارد کند"[۴۹]

اس میں شبہ نہیں کہ امیر شیر علی کے دربار میں شیخ کے اثرات بہت کارگر ہوتے تھے ۔ اور اس زمانے کے افغانی سیاسیات میں شیخ کی شخصیت بہت وزن رکھتی تھی ۔ غالباً اسی وجہ سے وہ محمد رفیق کی آنکھ میں کھٹک رہے تھے ۔صورت یہ تھی کہ ایک طرف تو محمد رفیق امیر کو بھائیوں کی بیخ کنی پر آمادہ کر رہا تھا اور دوسری طرف شیخ اِس پالسی کی سختی کے ساتھ مخالفت کر رہے تھے ۔ محمد رفیق سے شیخ کے اختلافات ذرا بھی تعجب انگیز نہیں ۔ اوّل تو اس لئے کہ (جیسا کہ آیندہ صفحات میں شیخ کے حالات سے واضح ہوگا) ان کا مزاج بہت سخت تھا وہ ہمیشہ اختلاف کا مقابلہ شدّت اور غصّے کے ساتھ کیا کرتے تھے ۔ وہ میٹھی زبان اور دھیمے مزاج والے چالاک مدبّر نہ تھے بلکہ صاف گو اور پرجوش مبلغ اور داعی اور نیز اس لیے بھی کہ شیخ کی تمام زندگی کا طور ہی یہ تھا کہ حکومتوں کے ارا کین

[۴۹] ۔ اعظمی" در مجلۂ کابل

اور عمال سے اُن کی کبھی نہ بنتی تھی۔ مصر، ترکی اور ایران میں ہر جگہ حکومت کے ٹھیکہ داروں سے وہ چند روز بھی نہ نبھا سکے بلکہ بہت سختی کے ساتھ اور بہت سی قربانیاں کرکے ان کا مقابلہ کرتے رہے۔ اس قسم کا یہ پہلا مقابلہ اور تصادم تھا جو شیخ کی زندگی میں پیش آیا۔ شیخ آخر تک اپنی اس رائے پر جمے رہے کہ شیر علی کو اپنے بھائیوں سے جھگڑا نہ کرنا چاہیے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ اگر شیر علی نے شیخ کے مشورے پر عمل کیا ہوتا تو افغانستان کی تاریخ کے اس دور میں خوں ریزی، بدامنی اور فتنے کی بجائے امن و امان کے ساتھ ملک کی تنظیم ہو سکتی اور وہ انقلابات پیش نہ آتے جو بعد میں عرصے تک پیش آتے رہے۔ یہ قرین قیاس ہے کہ اگر محمد رفیق اور شیخ کے درمیان یہ کشمکش ختم ہوگئی ہوتی اور رفیق کے مشوروں پر شیر علی نے عمل نہ کیا ہوتا تو شیخ عرصے تک افغانستان میں مقیم رہتے اور افغانی سیاست کی بہت سی گتھیوں کو ان کا ناخنِ تدبیر سلجھاتا۔ لیکن جیسا کہ بہت جلد معلوم ہوگیا، محمد رفیق اور شیر علی کے رویے نے ان کو بد دل کر دیا اور وہ اپنے وطن کی سیاست سے قطع نظر کرکے دنیائے اسلام کے متعلق بڑے بڑے خواب دیکھنے لگے۔ لیکن ہر ناخوشگوار واقعہ کا کوئی نہ کوئی خوشگوار پہلو بھی ہوتا ہے۔ شیر علی اور رفیق سے شیخ کے اختلافات دنیائے اسلام کے لیے ایک برکت عظیم ثابت ہوئے۔ جو کچھ افغانستان نے کھو دیا وہ عالمِ اسلام نے پایا۔ قدرت نے ان کی اس تارک الوطنی میں دنیائے اسلام کو ایک ایسا داعیٔ حق عطا فرمایا جس کی مثال انیسویں صدی میں مل نہیں سکتی۔ جب تک شیخ شیر علی کی خدمت میں رہے وہ افغانستان کی قومی زندگی میں ایک نئی تحریک پیدا کرنے کی فکر کرتے رہے۔ انھوں نے تنظیم ملت کے نئے راستے پیدا کیے اور جس منزل کی طرف وہ افغانستان کو پہنچانا چاہتے تھے وہ وہی منزل تھی جس کا پتہ اپنی

آیندہ زندگی میں انھوں نے دوسرے اسلامی ممالک کو دیا۔ اپنے وطن میں انھوں نے جو کچھ کیا اس کے متعلق چند مختصر اشارات حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ افغانستان میں سب سے پہلا اخبار "شمس النہار" کے نام سے جاری کرایا اور امیر شیر علی سے اس جریدے کے اجرا کی اجازت دلوائی۔ افسوس ہے کہ اس اخبار کا اب کوئی پتہ نہیں چلتا۔ "شمس النہار" کے پرچے تمام ملک میں تقسیم کیے جاتے تھے اور غیر ممالک میں بھی بھیجے جاتے تھے۔ جب تک شیخ افغانستان میں رہے یہ جریدہ بھی جاری رہا۔"[۴۴]

جیسا کہ شیخ کے حالات سے واضح ہوگا وہ ہمیشہ رائے عامہ کی تہذیب اور تنظیم کے لیے قومی اخبارات اور جراید کا وجود بہت ضروری سمجھتے تھے۔ وہ خود اپنے زمانے میں سب سے بڑے مسلمان اخبار نویس تھے۔ جس ملک میں بھی وہ گئے انھوں نے جراید و اخبارات جاری کرائے اور اسی ذریعے سے اپنا پیام عامۃ الناس تک پہنچایا۔ شیخ کا قایم کیا ہوا وہی پہلا نقطہ تھا جو بعد کو افغانستان میں صحافت اور جریدہ نگاری کا مرکز قرار پایا۔ بقول پروفیسر باگدارو اواخر ۱۸۷۵ء میں امیر شیر علی کے زمانے میں ایک اور اخبار بھی جاری ہوا تھا جس کا نام "کابل" تھا۔ ؞

افغانستان جیسے ملک میں جہاں اہلِ سیاست اور حکومت تلوار اور رائفل کے سوا کسی دوسری چیز کو قومی عصبیت اور حریت کا مظہر سمجھتے ہی نہ تھے قومی سیاست میں قلم کی قوت کو داخل کر دینا شیخ ہی کا کام تھا۔

۲۔ امیر کے دربار اور دفاترِ حکومت کے دروبست کو بھی شیخ نے ایک بلند تر سطح پر لانے کی کوشش کی اور متمدّن طریقوں سے ایک جدید تنظیم کی

---

[۴۴] ۔ اعظمی " در مجلۂ کابل ؞ اسلامک کلچر جنوری ۱۹۲۹ء

بنیاد ڈالی - افسوس ہی کہ اس زمانے کے تمام دفتری کاغذات ضایع ہو چکے ہیں اور باوجود کوشش کے مزید تفصیلات حاصل نہ ہوسکیں -

۳- فوج کی جدید ترتیب قایم کرائی اور جدید اصولوں پر اس کو منظم کرایا -

۴- سب سے پہلے سرکاری مکاتب قایم کرائے اور تعلیم کی ترقی کے لیے تدابیر اختیار کیں -

۵- عوام کے لیے سرکاری شفا خانے قایم کرائے -

۶- ڈاک اور رسل و رسائل کا کوئی باقاعدہ انتظام نہ تھا۔ اُس کو جدید اصولوں کے مطابق جاری کرایا -

۷- وزرا کی ایک مجلسِ شوریٰ قایم کرائی -

۸- غیر ممالک میں سفیر اور نمایندے بھیجنے کا انتظام کیا۔ وغیرہ وغیرہ

یہ تمام جدید اصلاحات وہ تھیں جن سے اُس وقت تک افغانستان ذرّہ برابر آشنا نہ تھا اور بلا شُبہ ان اصلاحات کا اجرا شیخ ہی کا کارنامہ تھا جس کی قدر و قیمت کو اب ان کے ہم قوم اچھی طرح محسوس کر رہے ہیں -

"مجلہ کابل" میں اعظمی نے بھی شیخ کی اِن کوششوں کی طرف بعض اشارات کیے ہیں -

"امورِ دربار بصورت خیلے عالی و مطابق سلیقہ دربارِ شاہان بزرگ تنظیم گردید - عساکر خیلے مرتب و منظم کہ نظیرِ آں در بعضے بلادِ شرقی کمتر دیدہ شدہ بود با یک تعداد کافی تشکیل گردید - مکتب ہائے عسکری و کشوری تاسیس شد - تسطیع راہا و احداثِ مسافر خانہ ہا در عرض طریق مسافرت برپا و تعمیر شد - کابینۂ وزرا انصاب و خوانیں صاحبِ منصبان عسکری و کشوری بہ آسامی زبان افغانی

وضع شد - شہرِ جدیدہ شیرپور احداث گردید ....

.... ہمچناں تنظیم تجارت و روابط با خارجہ صورت گرفتہ سید جمال الدین میل داشت ہرچہ زود افغانستان بصورت دول معروضہ داخلِ اتحاد و مؤدت با دولِ خارجہ شود .... نمایندہ ہائے بعضے دول ہمسایہ ہم بہ کابل حاضر شدہ بودند "...

ان اشارات سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہوتی ہے کہ شیخ ترقی کی جدید راہوں پر افغانستان کو لے جانا چاہتے تھے لیکن بدقسمتی سے شیرعلی نے محمد رفیق کے مشوروں سے متاثر ہوکر اپنے بھائیوں کے قلع قمع کرنے کا ارادہ کرلیا۔ جب شیخ نے دیکھا کہ اُن کے مشورے کارگر نہیں ہوتے اور امن و امان قایم ہونے کے بجائے پھر جنگ کے شعلے بھڑکنے والے ہیں تو انھوں نے دربار سے قطعِ تعلق کرنے کا تہیہ کرلیا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ ایسا کریں امیر شیرعلی کے بھائیوں کو کسی طرح امیر کے ارادوں سے مطلع کرا دیا۔ اسی اطلاع کی بنا پر محمد اعظم محمد اسلم اور محمد امین تینوں بھائی دفعتاً اپنے علاقوں کو چلے گئے جہاں وہ سمجھتے تھے کہ شیرعلی کا دستِ دراز ان تک نہ پہنچ سکے گا۔ شیخ نے اب وطن سے رخصت ہونے کا فیصلہ کرلیا۔

"بہرحال سید جمال الدین از اوضاع محمد رفیق خان بُکلی مایوس شدہ بعنوانِ مسافرت موقتی از حضور شاہ اجازت گرفتہ عازمِ ہند گردید[۴۹]"

یہ واقعہ ۱۸۶۴ء یا ۱۸۶۵ء کا ہے۔

ہندستان

قراین یہ ہیں کہ شیخ چند روز مصلحتاً افغانستان سے باہر رہنا چاہتے تھے تاکہ شیرعلی اور اُن کے بھائیوں کی آویزش سے بے تعلق رہیں۔

---

۴۹ اعظمی در مجلۂ کابل

اس دفعہ شیخ کا قیام ہندستان میں چند ماہ سے زائد نہیں رہا اور اس عرصے میں وہ بہت خاموش اور گمنام رہے ۔سوائے اس امر کے کہ اُن کا اس زمانے میں ہندستان آنا بعض روایات سے متقین ہوتا ہے، باقی اس سفر کے تمام حالات نامعلوم ہیں ۔زیادہ سے زیادہ اتنا اورمعلوم ہے کہ شیخ کو حکومتِ ہند نے اس دفعہ پنجاب سے آگے جانے کی اجازت نہیں دی ۔پنجاب میں وہ کہاں کہاں رہے اور کیا کیا کرتے رہے کچھ معلوم نہیں ۔لیکن یہ قیاس غلط نہیں کہ شیخ کو جو مرتبہ افغانی سیاست میں حاصل ہوچکا تھا اس کے باعث حکومت ہند نے ان کی نقل و حرکت کی خاص طور پر نگرانی کی ہوگی اس لیے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب افغانستان کے معاملات سے برطانوی مدبرین بہت زیادہ دلچسپی لے رہے تھے اور شیرعلی کو برطانوی ہمدردیاں حاصل تھیں ۔دوسری طرف یہ واقعہ بھی کوئی راز نہ تھا کہ شیخ شیرعلی کے طرزِ عمل کو ناپسند کرتے تھے ۔

شیخ کی روانگی کے بعد ہی شیرعلی نے اپنے بھائیوں کے خلاف پیش قدمی شروع کردی ۔پہلی مہم تو اس لیے ناکام رہی کہ خود کابل میں شیرعلی کے خلاف بغاوت اور فساد کی صورت پیدا ہوگئی اور ان کو بھائیوں کی بیخ کنی کا ارادہ ترک کرکے کابل واپس آنا پڑا ۔لیکن بھائیوں کا وجود کانٹے کی طرح شیرعلی کے دل میں کھٹک رہا تھا اور کابل کے حالات سے یک گونہ مطمئن ہوکر انھوں نے پھر محمد اعظم کے خلاف فوج کشی شروع کی ۔محمد اعظم مقابلہ کی تاب نہ لاکر ہندستان کی طرف چلے گئے اور اب شیرعلی عبدالرحمٰن خاں کے والد سردار افضل خاں کے خلاف آمادۂ پیکار ہوئے ۔محمد افضل خاں بھی میدان میں اُتر آئے ۔اُس وقت شیرعلی نے بظاہر اُن سے صلح کرلی اور افضل خاں اپنی سادہ دلی کی وجہ سے بالکل مطمئن ہوگئے ۔اُن کی اس غلطی کا یہ نتیجہ نکلا کہ جب تاسکرمان کے مقام پر

وہ شیر علی سے ملنے گئے تو شیر علی نے اُن کو بلاپس وپیش قید کرلیا۔ افضل خاں کے اس طرح قید ہو جانے پر عبدالرحمٰن خاں بہت بگڑے لیکن باپ نے بیٹے کو تاکیداً لکھا کہ وہ فوراً بخارا چلے جائیں۔ چنانچہ وہ بخارا چلے گئے اور چند روز بعد اُنھوں نے اپنے چچا محمد اعظم کو بھی بخارا بُلا لیا۔ اُدھر شیر علی خاں افضل خاں کو مقید ساتھ لے کر اپنے تیسرے بھائی محمد امین کا فیصلہ کرنے کے لیے قندھار کی طرف لوٹے۔ دو دن کے سخت معرکہ کے بعد سردار امین خاں میدانِ جنگ میں مارے گئے لیکن اُسی معرکہ میں شیر علی کا بیٹا بھی جو وارثِ تاج و تخت سمجھا جاتا تھا، مارا گیا۔ امیر عبدالرحمٰن خاں نے اپنی سوانح عمری میں بہت عبرت آموز طریقے پر یہ واقعہ بیان کیا ہے یعنی جس وقت لڑائی کے بعد شیر علی کے سامنے اُن کے مقتول بھائی کی لاش لائی گئی تو وہ اپنی فتح کے نشے میں بہت مست تھے۔ لاش پر ایک غلط انداز نظر ڈال کر اُنھوں نے بڑی رعونت کے ساتھ حکم دیا کہ اس کتے کی لاش کو پھینک دو اور میرے بیٹے سے کہو کہ مجھے آکر مبارک باد دے۔" لوگوں کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ بیٹے کے مارے جانے کا حال بیان کریں۔ آخر وہ چپ چاپ لاش کو لے کر سامنے آئے۔ شیر علی نے پھر اُسی رعونت کے ساتھ کہا "اب یہ کس کتے کی لاش ہے؟" لوگوں نے لاش کا چہرہ کھول دیا!۔ شیر علی اس صدمے سے دیوانے ہو گئے۔ کپڑے پھاڑ ڈالے اور عرصے تک مخبوط الحواس رہے۔ درحقیقت اس عبرت انگیز واقعہ نے اُن کی کمر توڑ دی اور وہ بالکل گوشہ نشین ہو گئے۔ عبدالرحمٰن بخارا میں بیٹھے ہوئے کابل کے حالات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اُن کو جب شیر علی کے اس حال کی خبر ملی تو وہ بخارا سے بلخ کی طرف روانہ ہوئے اور چند معمولی لڑائیوں کے بعد اس صوبے پر قبضہ کرلیا۔ اُس کے بعد اعظم خاں اور عبدالرحمٰن پوری قوت سے کابل کی طرف

متوجہ ہوئے۔ شیر علی کے دوسرے بیٹے ابراہیم نے مقابلہ کیا مگر شکست کھائی اور قندھار کی طرف بھاگا جہاں شیر علی مقیم تھے۔ غزنی میں اعظم خاں نے افضل خاں کو بھی قید سے رہا کر لیا تھا اور دونوں بھائی اور عبدالرحمٰن کابل کی شہر پناہ کے سامنے پہنچ گئے۔ شیر علی کے وزیر محمد رفیق نے شہر کے دروازے پر ان تینوں کا استقبال کیا۔ لیکن ان کا استقبال تو کیا کیا خود اپنی موت کا استقبال کیا۔ اُس کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور محمد اعظم خاں نے کابل میں داخل ہونے کے بعد پہلا کام یہی کیا کہ محمد رفیق کو فساد کا اصلی بانی قرار دے کر پھانسی دے دی۔ اس کے بعد محمد اعظم خاں نے قندھار پر حملہ کیا اور شیر علی شکست کھا کر ہرات کی طرف بھاگ گئے۔[۵۰]

شیخ ہندستان میں بیٹھے ہوئے ان تمام حالات سے باخبر تھے اور جب اُن کو یہ اطلاع مل گئی کہ کابل پر محمد اعظم خاں قابض ہو گئے اور شیر علی بھاگ گئے اور محمد رفیق نے پھانسی کے تختہ میں اپنی زندگی ختم کر دی تو وہ ہندستان سے پھر وطن کی طرف روانہ ہوئے۔

"از واقعاتِ بالا جمال الدین در ہند مطلع گردید۔ فوراً از راہِ چمن و کوئٹہ خود را بہ قندھار رسانیدہ و چوں دو بارہ تبدیلِ سلطنتِ افغان را موجب خونریزی و بربادیٔ وطن عقیدہ داشت مدید از امداد امیرِ شیر علی منحرف و بہ تائید اعلیٰ حضرت امیر محمد اعظم خاں شامل گردید[۵۱]"

قندھار کی فتح کے بعد جب محمد اعظم کابل آئے تو شیخ اُن کے ہمراہ تھے۔ یہ واقعہ غالباً ۱۸۶۶ء کا ہے۔

آخری دفعہ وطن میں

کابل میں اب محمد افضل خاں سریر آرائے سلطنت ہوئے مگر اُن کی عمر نے وفا نہ کی اور صرف ایک ہی سال کے بعد ان کا انتقال

۵۰ تاریخ افغانستان۔ مؤلفہ سید جمال الدین افغانی ۵۱ اعظمی "درمجلہ کابل

ہوگیا۔ عبدالرحمٰن خاں کابل میں موجود تھے لیکن انھوں نے باپ کے بعد اپنے چچا محمد اعظم خاں کو تخت پر بٹھایا۔ شیخ اب ارکینِ سلطنت میں بہت عالی مقام ہوگئے تھے۔ وہ امیر کے مشیرِ خاص اور وزیرِ اعظم مقرر کر دیے گئے تھے۔ اُس زمانے میں ملک کے نظم ونسق کے متعلق ان کے کارنامے پیش نظر نہیں ہیں۔ اور کچھ معلوم نہیں کہ اس دفعہ قومی اور ملکی اصلاح اور ترقی کی کیا کوششیں انھوں نے کیں۔ لیکن یہ ظاہر ہی کہ ان کی وزارت کا زمانہ سال ڈیڑھ سال سے زیادہ طویل نہ تھا اور اُس زمانے کی تاریخ کی اسناد کہیں موجود نہیں۔ میں نے کوشش کی کہ افغانستان کے سرکاری دفاتر کے قدیم کاغذات کا پتہ چلاؤں، لیکن معلوم ہوا کہ اس عہد انقلاب کے دفتری کاغذات خدا جانے کب ضائع ہوچکے۔ میں شکرگزاری کے ساتھ اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ میری اس جستجو میں افغانی حکام نے میری کافی امداد کی لیکن شیخ کی وزارت کے حالات کا ایک شمہ بھی حاصل نہ ہوسکا۔ بہر حال یہ معلوم ہو کہ وہ تمام زمانہ بدامنی اور بے اطمینانی کا زمانہ تھا اور افغانستان کے عام حالات امیروں اور سرداروں کے باہمی فسادات کی وجہ سے بہت خراب تھے۔ شیرعلی نے شکست تو کھائی تھی مگر وہ شکست فیصلہ کُن نہ تھی۔ وہ سرحد پر موجود تھے۔ ان کے حملے جاری تھے اور دارالسلطنت اندرونی اور بیرونی خطرات سے محفوظ نہ تھا۔ بدقسمتی سے امیر اعظم خاں اور سردار عبدالرحمٰن خاں کے درمیان ناچاقی اور بد دلی شروع ہوگئی اور اسی بنا پر امیر نے ان کو دارالسلطنت سے ہٹا کر بلخ کا گورنر بنا کر بھیج دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو تقویت حکومت اور محمد اعظم خاں کو حاصل تھی وہ نہ رہی۔ شیرعلی کو جب معلوم ہوا کہ عبدالرحمٰن خاں اور محمد اعظم خاں کا اتحاد باقی نہیں رہا تو ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ شیخ نے بہت کوشش کی کہ محمد اعظم خاں اور عبدالرحمٰن کے درمیان

صفائی اور اتحاد ہو جائے مگر مقدرات محمد اعظم خاں کو غلط راستے پر لیے جا رہے تھے اور ان کی قسمت میں نہ تھا کہ وہ زیادہ عرصے تک برسرِ حکومت رہ سکیں۔ انھوں نے شیخ کے مشوروں پر توجہ نہ کی اور اس حالت میں شیخ کے لیے سوائے اس کے چارہ نہ تھا کہ خاموشی سے بیٹھے ہوئے واقعات کے مدّ و جزر کو دیکھتے رہیں۔

"سیّد جمال الدین کہ ہم خوب تر بہ طبیعت ایں دو شاہ مانوس بود، از آیندہ اوضاع نامطمئن چارہ جز توکّل نہ دید۔[۵۲]"

چند ہی روز کے اندر اعظم خاں اور شیر علی کے درمیان ایک فیصلہ کُن کشمکش شروع ہو گئی۔ ایک ہی حملے میں شیر علی نے قندھار پر قبضہ کر لیا اور پھر کابل کی طرف بڑھنے لگے۔ اس وقت افغانستان کی سرحدوں پر انگریز اور رُوسی مدبرین نظریں جمائے ہوئے تھے۔ رُوس اور انگلستان کی سیاسی رقابت نے افغانستان کے حالات کو بہت اہم بنا دیا تھا۔ اِس لیے کہ ان رقیبوں میں سے ہر ایک کوشش کر چکا تھا کہ افغانستان پر اس کا اثر مستحکم ہو جائے۔ چنانچہ پھر انگریزوں نے اِس بساط پر اپنی سیاسی چالیں شروع کیں۔ شیر علی جو خارجی امداد کے بہت محتاج تھے، بہ آسانی برطانوی امداد کو قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اُس وقت اُن کے لیے یہ امداد ایک نعمتِ غیر مترقبہ تھی۔ دراصل شیر علی کا جذبۂ انتقام ہر حالت میں اور ہر قیمت پر محمد اعظم خاں کو شکست دینا چاہتا تھا۔ دونوں خارجی سیاست کے رموز اور نکات سے ناآشنا تھے۔ اور دونوں انگریزوں کو اپنا دوست سمجھنے کے لیے تیار تھے۔ محمد اعظم خاں کے مزاج کی سختی اور شدّت نے اُن کو غیر ہر دلعزیز بنا دیا تھا اور خود اُن کے دربار میں لوگ اُن

۵۲؎ اعظمی "در مجلّۂ کابل"

سے ناخوش ہوگئے تھے۔ چنانچہ اکثر خوانین شیرعلی سے جاکر بل گئے اور محمد اعظم خاں کا پلّہ ہلکا دیکھ کر انگریزوں نے بھی شیرعلی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ شیخ خارجی سیاست کی ان کارفرمایوں کو اچھی طرح دیکھ رہے تھے لیکن معاملہ اُن کے قابو سے باہر ہوچکا تھا۔ آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ محمد اعظم خاں اور عبدالرحمٰن خاں شیرعلی سے شکست کھاکر مشہد کی طرف چلے گئے اور شیرعلی فاتحانہ کابل میں داخل ہوئے۔ شیخ اس وقت تک کابل میں موجود تھے اور ان کے لیے یہ وقت بہت نازک اور خطرناک تھا۔

وہ محمد اعظم خاں کے خاص مشیر سمجھے جاتے تھے اور شیرعلی کو قدرتاً اُن کی طرف سے بدگمان ہونا چاہیے تھا، لیکن شیخ خدا پر بھروسہ کیے ہوئے بیٹھے رہے اور شیرعلی نے بھی اس وقت کچھ تو شیخ کے ذاتی اثرات اور شخصی نفوذ کا لحاظ کرکے اور کچھ اس خیال سے کہ کوئی نیا فتنہ کھڑا نہ ہو جائے، شیخ کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی مناسب نہ سمجھی اور نہ شیخ سے کوئی تعرض کیا، البتہ شاہی دربار سے وہ دور ہی دور رہنے لگے۔

"وہم شیرعلی نظر بہ احترام افکار بلند و خدماتِ گزشتہ او را بحالِ خویش واگزاشت"[۵۳]

لیکن شیخ خوب جانتے تھے کہ اب افغانستان میں اُن کا قیام نہ صرف فضول بلکہ خطرناک ہے۔ اُن کی نظر وطن کے باہر اب بہت دُور تک جارہی تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ شیرعلی برطانوی سیاست کا ایک مہرہ ہے اور اس مہرے کے ذریعے سے افغانستان کی ترقی و اصلاح ناممکن ہے۔ "عہدِ انتظار" اب ختم ہو رہا تھا۔ شیخ کو جو کچھ اپنے وطن میں سیکھنا اور سمجھنا تھا وہ سیکھ

۵۳۔ اعظمی "در مجلّہ کابل"

اور سمجھ چکے تھے۔ وہ اب وطن سے نکل کر دوسرے اسلامی ممالک تک اپنا پیام پہنچانا چاہتے تھے اور اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ اسلامی ممالک کی عافیت کا انحصار اب باہمی اتحاد میں ہے۔ چنانچہ انھوں نے شیر علی سے سفرِ حج کی اجازت چاہی اور شیر علی نے بھی اس شرط کے ساتھ ان کو اجازت دے دی کہ وہ ایران یا وسط ایشیا کی طرف ہوکر نہ جائیں غالباً یہ شرط اس لیے لگائی گئی کہ شیخ محمد اعظم خاں سے ایران میں اور عبدالرحمٰن خاں سے بخارا میں ملاقات نہ کرسکیں۔

اس طرح سنہ ۱۸۶۸ـ۶۹ء میں شیخ ہمیشہ کے لیے اپنے وطن سے رخصت ہوئے اور ان کی زندگی کا وہ سفر شروع ہوا جو ان کو افغانستان کی گمنامی سے نکال کر ایک ایسے میدان میں لے جانے والا تھا جہاں سیاست اور تدبر کی بڑی بڑی بازیاں بدی جارہی تھیں۔ وہ تنہا اپنے وطن سے نکلے مگر ارادوں، حوصلوں اور عزایم کا ایک عظیم الشان قافلہ ان کے ساتھ تھا۔ وہ بظاہر بے یار و مددگار تھے لیکن عزم اور ایمان یہ دو اُن کے مضبوط بازو تھے جن کے بھروسہ پر وہ یکہ و تنہا ایک ایسی منزل کی طرف جارہے تھے جو پیغمبروں کی منزل سے صرف دوسرے درجہ پر ہے! اس سفر کا آغاز ان کی زندگی کے دورِ اوّل کا خاتمہ تھا۔ اپنے وطن کی خونریزیوں اور سیاسی کشمکش میں انھوں نے وہ سب تجربے حاصل کر لیے تھے جو اُن کی آیندہ زندگی میں کام آنے والے تھے۔ ان کی جیب میں پیسہ نہ تھا۔ جب وہ وطن سے چلے، لیکن تجربہ، ایمان اور قوّتِ عمل یہ سب زادِراہ ان کے پاس تھا اہلِ غرض کی خود غرضیاں، اربابِ حکومت کا غرور۔ اہلِ ثروت کی مکّاریاں، فاتح کی رعونت اور مفتوح کا جذبۂ انتقام۔ ملک اور مال

کے لیے انسانوں کی ریاکاریاں اور خونخواریاں۔ مشرقی اقوام کے ساتھ مغربی اقوام کی سیاسی چالیں۔ یہ سب انھوں نے زندگی کے دورِ اوّل کے مکتب میں سیکھا اور جانا۔ اس طرح وہ اس مدرسہ سے سندِ تحصیل حاصل کرکے دنیائے اسلام کی طرف چلے جہاں اُن کو ملّت اسلامی پر اپنی عمر کے بقیہ ۲۰ برس قربان کرنے تھے۔

دورِ ثانی

دورِ ثانی

شیخ کی زندگی کے دورِ ثانی کے متعلّق شاعر کی زبان سے کہا جا سکتا ہے کہ ؎

رہروِ راہ محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

ہندستان تیسری دفعہ

ہندستان بدنصیب وہ ملک ہے جہاں لوگ اپنے ہم وطن اکابر و مشاہیر کو بھی ایک ہفتہ کے اندر بھول جایا کرتے ہیں۔ تو پھر جمال الدین کو جو اب تیسری دفعہ ہندوستان آئے تھے، آج ساٹھ برس بعد کون یاد کر سکتا ہے۔

اس دفعہ ہندستان میں شیخ کا قیام ایک ماہ سے زاید نہیں رہا۔ اس عرصہ میں وہ کہاں کہاں رہے اور کس کس سے ملے، معلوم نہیں سوائے اس کے کہ۔

"در سال ۱۲۸۵ھ ہجری سید جمال الدین افغان بہ ہندستان رفتہ حکومتِ ہند علمائے ہند را از مذاکرہ و اجتماع باشا رٌ الیہ منع کرد۔ پس از یک ماہ

اقامت در ہند بہ مصر رفت "[۵۴]

یہ وقت تھا کہ غدر ۱۸۵۷ء کو گزرے دس گیارہ برس سے زیادہ نہ ہوئے تھے، آگ بجھ گئی تھی مگر راکھ میں چنگاریاں باقی تھیں۔ برطانوی حکومت پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی تھی اور قدرتاً انگریز بہت محتاط اور ہوشیار تھے۔ اس زمانے میں شیخ کا ہندستان آنا حکومت کے نقطۂ نظر سے کسی طرح پسندیدہ نہ تھا۔ علاوہ بریں محمد اعظم خان اور عبدالرحمٰن خان انگریزی مدبرین کی نظر میں انگریزی اقتدار کے خلاف تھے اور شیخ ان دونوں کے خاص آدمی سمجھے جاتے تھے۔ شیر علی کے متعلق جو اس وقت انگریزوں کے آدمی تھے، شیخ کے خیالات بہت ہی خراب تھے اور اغلب یہ ہے کہ حسبِ عادت وہ شیر علی کے متعلق صاف صاف اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتے ہوں گے۔ محمد اعظم خاں اور عبدالرحمٰن خاں جب انگریزی دعوت کو رد کر کے ایران اور بخارا چلے گئے تو پھر شیخ کا ہندوستان آنا انگریزی حکومت کے لئے ناگوار ہوا ہوگا۔ ہندستان کے علما کے طبقوں میں غدر کے اثرات ابھی تک باقی سمجھے جاتے تھے اور اس بارود کے پاس اس افغانی مشعل کا آنے دیا جانا قطعاً نامناسب تھا! ایسی حالت میں شیخ نے بھی محسوس کر لیا ہوگا کہ ان کا ہندستان میں زیادہ قیام بالکل فضول ہے۔ بہرحال یہ امر واقعہ مستند ہے کہ شیخ اس دفعہ ہندستان میں زیادہ نہیں ٹھیرے۔ صحیح طور پر یہ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ یہاں سے کہاں گئے۔ روایتیں مختلف ہیں لیکن تاریخ کے صفحات پر ہندستان کے بعد وہ سب سے پہلے مصر میں نظر آتے ہیں اور اس سفر کی درمیانی کڑی اگر کوئی تھی تو وہ مفقود ہے۔

---

[۵۴] "جمال الدین" مطبوعہ ثبات استانبول

پہلا سفرِ مصر

پروفیسر براؤن نے مفتی عبدہ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ "شیخ محمد عبدہ نے مجھ سے کہا کہ شیخ جمال الدین کا پہلی دفعہ مصر آنا اُن کو خوب یاد ہے شیخ سیدھے بخارا سے آئے تھے اور مغربی ممالک میں قاہرہ پہلی جگہ تھی جہاں اُن کا قیام ہوا"۔ اگر اس بیان کو صحیح مان لیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندستان سے وسط ایشیا کی طرف اگر شیخ گئے تو کدھر سے گئے۔ مشکل یہ ہے کہ مصر میں شیخ کی آمد کی صحیح تاریخ کا تعیّن ناممکن ہے اور یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ شیخ ہندستان سے روانہ ہو کر کس قدر عرصے بعد مصر پہنچے۔ اگر یہ معلوم ہو جاتا تو مدّتِ سفر کے طول سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ شیخ براہِ راست مصر گئے یا حجاز ہو کر گئے یا واقعی بخارا سے مصر آئے۔ تحقیق و تفتیش کی ساری راہیں بند ہیں۔ پس سوائے اس کے چارہ نہیں کہ براؤن اور مفتی عبدہ کے قول کو بلا تصدیق صحیح مان لیا جائے۔

مصر کی سرزمین پر بھی شیخ کے لیے وہی آسمان پیدا تھا جو اُن کا قیام ہندستان میں گوارا نہ کر سکا چنانچہ وہ صرف چالیس دن مصر میں ٹھیرنے پائے۔ اس چالیس دن کی مختصر مدّت میں وہ کیا کرتے رہے اس کا حال صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ

" درطرفِ ایں مدّت با محفلِ علمی الازہر[۵۵] آشنا شدہ طلّابِ مدرسۂ مذکور کہ از سوریہ بودند بہ نسبت جمال الدین افغانی حرمت بسیارے نشان دادہ و از مشارٌ الیہ تدریس "شرح اظہار" آرزو کردند۔ سید جمال الدین افغانی چندے بہ ایشاں "شرحِ اظہار" درس دادہ۔[۵۶]

ازہر میں شیخ کی تقریریں اور مواعظ کا لہجہ اور موضوع برطانوی سیاست

---

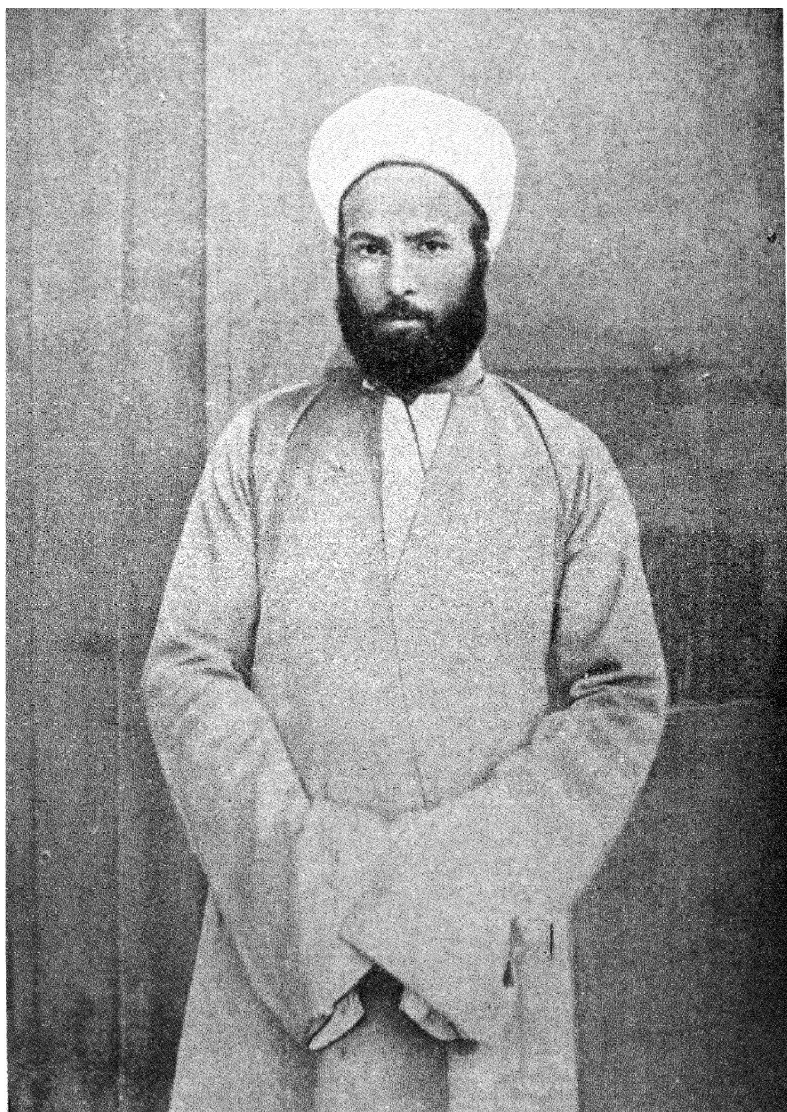
[۵۵] دیکھو ضمیمہ - [۵۶] "جمال الدین" مطبوعہ ثبات استانبول

کے لیے خوشگوار ثابت نہ ہوا۔ وہ سیاستِ خارجہ اور ادارۂ داخلیہ پر اعتراضات کرنے لگے اور غضب یہ تھا کہ طلبا ان کی صاف گوئی اور اُن کے خیالات سے متاثر معلوم ہوتے تھے۔ مصر کی سرزمین پر جہاں مستقبل قریب میں برطانوی "دخل" مستقل صورت اختیار کرنے والا تھا اس قسم کے خیالات کا اظہار روا نہ رکھا جاسکتا تھا۔ برطانوی سیاست سے شیخ کا یہ تصادم پہلا علانیہ تصادم تھا اس لیے تعجب نہیں کہ انگریز

"مترصد بودند کہ برائے اخراج سیّد موقعۂ بدست آورند۔ اتفاقاً ہماں روز ہا کشیش از نصرانیاں مجذوب فرمایشات سیّد شدہ بدست وی اسلام آورد۔ اقوام عیسوی مقیم مصر بمعارضہ برخاستند۔ مسلمین آن جا بہ دفاع قیام نمودند۔ خدیو مصر موقعہ را غنیمت دانستہ از طول اقامت سیّد معذرت خواست......
پس از مرور دو ماہ یا کمتر....... بطرف استانبول مرافعہ فرمود۔"[۵۵]

یہ ظاہر ہے کہ اخراج کی اصل وجہ ایک نصرانی کا مسلمان ہونا نہ تھا اور خدیو مصر کا حکم بھی صرف اُسی کا حکم نہ تھا۔ سیاسی قوتیں شیخ کے خلاف کام کرنے لگی تھیں اور غالباً شیخ کو بھی اس حقیقت کا کافی اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کی منزل دور اور کڑی ہے۔ مگر جو چالیس دن اُنھوں نے سرزمین فراعنہ پر گزارے وہ بے نتیجہ نہ تھے۔ اس قلیل مدت میں اُنھوں نے مصریوں کے دلوں میں وہ تخمِ عمل ڈال دیا جو باوجود ہر قسم کے موانع کے مصر کے ریگستانوں اور دریائے نیل کے کنارے پھیلتا پھولتا رہا اور آج بھی ایک تناور درخت کی صورت میں قائم ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ شیخ کی شخصیت میں وہ کیا جادو تھا جو اس قدر جلد کارگر ہو جاتا تھا۔ یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ جمال الدین

---
[۵۵] عظمی۔ در مجلّہ کابل



شیخ محمد عبده

ہی وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے مصر کی نوجوان نسل کو قوم پرستی اور حریت کا ابتدائی سبق پڑھایا جس صرف ونحو پر جو لیکچر جمال الدین نے ازہر کے طلبا کو دیے وہ صرف و نحو درحقیقت جذبۂ ملّی اور حریت اسلامی کی صرف ونحو تھی۔ اس مختصر قیام میں انھوں نے مصر کی حیات ملّی کی رہنمائی کے لیے اپنا ایک قائم مقام بھی ڈھونڈ لیا تھا۔ یہ مفتی عبدہ تھے جو بعد کو مصر کے مفتی اعظم اور احرارِ مصر کے قاید محترم بنے۔ اس وقت جب پہلی دفعہ وہ شیخ کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے تو وہ ایک بیس سالہ نوجوان تھے اور ہنوز ان کی طالب علمی کا زمانہ ختم نہ ہوا تھا۔ بقول براؤن اسی زمانہ میں عبدہ شیخ کی شخصیت سے متاثر ہوگئے تھے اور دوسری دفعہ جب شیخ مصر آئے تو وہ شیخ کے سب سے قوی دستِ و بازو بن گئے۔

جس زمانہ میں شیخ مصر پہنچے قسطنطنیہ میں قوم پرستوں کی ایک چھوٹی سی جماعت پیدا ہو چکی تھی اور غالباً امید کی یہی ایک شعاع تھی جو اُن کو مصر سے ترکی کی طرف لے گئی۔ تعجب نہیں کہ وہ یہ اُمید لے کر مصر سے چلے ہوں کہ جو کام مصر میں اُن کے لیے مشکل تھا وہ ترکی میں اس قدر مشکل نہ ہوگا مگر ان کو معلوم نہ تھا کہ ابھی اس راہ میں کتنی کڑی منزلوں سے گزرنا ہے۔

ترکی کا پہلا سفر

یہ واقعہ مشتبہ ہے کہ شیخ مصر سے سیدھے قسطنطنیہ گئے یا حجاز ہو کر گئے۔ مرزا لطف اللہ کا بیان ہے کہ۔

"و بعد از مسافرت مکہ متصرف واز آں جا عازم استانبول می شوند"

اس بیان کی تائید یا تردید میں کوئی دوسرا بیان ہمارے سامنے نہیں۔ بہرحال یہ مسلّم ہے کہ مصر سے روانہ ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ

استانبول پہنچ گئے اور اگر وہ حجاز گئے بھی تو اُن کا قیام وہاں کچھ زیادہ نہیں رہا۔

اُس وقت جب شیخ مصر سے رخصت ہوئے، استانبول کے تاریک گوشوں میں جماعتِ احرار کچھ مشورے کر رہی تھی۔ اس زمانے میں ترکی کے عام حالات کی تصویر شیخ کی مساعی کے لیے ایک ضروری پس منظر ہو۔ لہٰذا اُن عام حالات کا ایک مختصر خاکہ پیش کر دینا مناسب ہوگا۔

سترھویں صدی عیسوی کے نصفِ آخر میں آلِ عثمان کا انحطاط شروع ہوگیا تھا۔ جس وقت تک محمد فاتح کے جانشینوں کی تلوار زنگ آلود نہ ہوئی تھی اس وقت تک یورپ میں اسلامی اقتدار غیر متزلزل رہا، لیکن جب سلاطین عثمانی نے کمر کھول دی اور تلوار کو ہاتھ سے رکھ دیا۔ اپنے گھوڑے اصطبل میں باندھ دیے اور ساحل باسفورس پر سمندری موجوں کی موسیقی میں راحت و آرام تلاش کرنے لگے، اُن کے آفتابِ اقبال کا نور کم ہونے لگا۔ قصرِ شاہی میں اور قصرِ شاہی کے باہر بھی سیاہ اور سفید کے اختیارات رفتہ رفتہ "کزلر آغاسی" اور بستان جی آغاسی" کے ہاتھوں میں منتقل ہوگئے۔ آلِ عثمان کے تاجداروں نے قصرِ یلدیز میں عیش و عشرت کی زندگی کو میدانِ جنگ کی صعوبتوں پر ترجیح دی اور اس طرح یورپ کے دل سے محمد فاتح کی یاد محو ہونے لگی۔

اُسی زمانے میں دارالسلطنت میں "جاں نثاریوں[ش۵]" کی طاقت اس قدر زیادہ ہوگئی تھی کہ سلطنت اور حکومت کے نظم و اصلاح کے تمام دروازے اِن سپاہیوں نے روک دیے۔ سلطان سلیم ثالث نے جب اندرونی اصلاحات

ش۵۔ دیکھو ضمیمہ نمبر ۱۔

کی کچھ کوشش شروع کی تو وہ اس جرم کی پاداش میں جاں نثاریوں کے ہاتھ سے مارے گئے ۔ سلیم ثالث کے قتل کے بعد جب محمد ثانی تخت نشین ہوئے تو ملک کی بد امنی اور نظمِ حکومت کی خرابی تقریباً لا علاج ہوچکی تھی۔ سرویا آمادۂ بغاوت تھا۔ مصر میں خدیو محمد علی مالک جزو کل ہوگیا تھا۔ عرب میں وہابیوں کی تحریک قوی ہوتی جاتی تھی ۔ شاہی گورنر اپنے اپنے صوبوں میں آزاد اور خود مختار ہوتے جاتے تھے اور ہر طرف سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا تھا ۔

پھر جب یونان نے بھی اطاعت کی زنجیریں توڑ ڈالیں اور آسٹریا، فرانس اور رُوس نے حکومتِ عثمانی پر زور ڈال کر اس کو آزاد کرادیا تو ۱۸۳۹ء میں مصر میں محمد علی نے بھی اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اُدھر سلطان کے گھر کے دروازے پر رُوس نے آبنائے باسفورس کے متعلق اپنے لیے خاص خاص حقوق حاصل کرکے ترکی سلطنت کے سینہ پر ایک پانو جمادیا۔ اِن نازک حالات میں سلطان عبدالمجید نے ۱۸۴۰ء میں رشید پاشا کو اپنا وزیرِ اعظم مقرر کیا۔ رشید پاشا نے کسی نہ کسی طرح سلطان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ سلطنت کے درو بست کی اصلاح کی جائے۔ چنانچہ اصلاح کی تجاویز "خط شریف" کے نام سے شایع کی گئیں ۔ اُن کا خلاصہ یہ تھا کہ :۔

۱۔ تمام عثمانی رعایا کو جان و عزّت کی طمانیت دی جائے ۔
۲۔ محکمۂ ٹیکس کی اصلاح کی جائے ۔
۳۔ قانون مساوات قائم کیا جائے ۔
۴۔ غلاموں کی تجارت کو مسدود کیا جائے۔
۵۔ سول اور فوج اور اقتصادیات کے جدید محکمے قائم کیے جائیں ۔

اصلاحات کی یہ کوشش جاری ہی تھی کہ بیت المقدس میں سخت فساد برپا ہوگیا اور روس نے عیسائی باشندوں کی حفاظت کا بہانہ کرکے وہاں مداخلت شروع کر دی۔ اس طرح تجاویز اصلاح کا نفاذ رُک گیا۔ اور یہی دول کا عین منشا تھا۔ ۱۸۵۳ء میں جنگ کریمیا شروع ہوگئی اور دو تین سال کی خونریزی کے بعد ۱۸۵۶ء میں عہد نامۂ پیرس کی رُو سے دولِ یورپ نے عثمانی حکومت سے بہت سے حقوق حاصل کر لیے۔ اس زمانے میں بھی عالی پاشا رشید پاشا اور فواد پاشا جیسے لوگ اصلاحات کے حامی موجود تھے لیکن ایک طرف تو سلطان اپنے خود مختارانہ اختیارات کی کمی کو پسند نہ کرتے تھے اور دوسری طرف دولِ یورپ کی ریشہ دوانیاں اتنی مہلت ہی نہ دیتی تھیں کہ اصلاحات کی تحریک کو بروئے کار لایا جاسکے۔ اگرچہ ۱۸۵۶ء میں پھر ایک دفعہ ان تجاویز کا اعلان کیا گیا اور ایک "خطِ ہمایوں" شایع ہوا لیکن فی الواقعہ کوئی نتیجہ خیز کارروائی نہ ہوسکی اور سلطنت کے اندرونی حالات بد سے بدتر ہوتے رہے۔

۱۸۶۱ء میں سلطان عبدالمجید خاں کا انتقال ہوگیا اور سلطان عبدالعزیز تخت نشین ہوئے۔ دولتِ عثمانیہ کے لیے یہ بہت ہی سخت مصائب اور خطرات کا زمانہ تھا۔ دولِ یورپ اور خصوصاً برطانیہ کے اثرات حاوی ہوتے جاتے تھے۔ ۱۸۶۷ء میں سلطان عبدالعزیز نے پیرس اور لندن کا سفر کیا اور اس سفر نے ترکی کی قسمت کا گویا فیصلہ ہی کر دیا۔ عہدِ جدید کی تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ اُس زمانے میں مشرق اور خصوصاً اسلامی تاجداروں کی سیاحتِ یورپ اکثر ان کی تباہی کا پیش خیمہ ہوتی تھی۔ خدیو اسمٰعیل، ناصرالدین شاہ، سلطان عبدالعزیز یہ سب یورپ ہی سے ایسی "برکات"

لے کر واپس آئے کہ پھر دو دن بھی چین سے اپنے تخت پر نہ بیٹھ سکے۔ اس واقعہ کے نفسیات اور فلسفہ سے قطعِ نظر (کہ اِن اوراق میں اِس قسم کے مباحث کی گنجائش نہیں) مختصر یہ ہو کہ سلطان عبدالعزیز کو یورپ کے لالہ زاروں کی سیاحت راس نہ آئی!

فتنۂ یمن کی وجہ سے ترکی حکومت سخت پریشان تھی جب شیخ نے ۱۸۷۱ء میں آلِ عثمان کی سرزمین پر قدم رکھا۔ یہ وقت وہ تھا کہ ترکی کی تمام فضا تاریک تھی۔ لیکن اُسی ظلمت میں شیخ روشنی کی ایک خفیف شعاع دیکھ رہے تھے۔ ملک کے مصائب اور ابتلا سے زندگی کی حرارت آہستہ آہستہ پیدا ہو رہی تھی اور شیخ کو غالباً اچھی طرح معلوم تھا کہ۔

"بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں!"

عین اس زمانے میں جب کہ ترکانِ احرار کی جماعت کا پہلا سنگِ بُنیاد رکھا جانے والا تھا شیخ میدانِ عمل کو تیار کرنے کے لیے برسرِ موقعہ پہنچ گئے۔ اُس وقت اُن کو یہ تو معلوم نہ ہوگا کہ اُن کی آیندہ زندگی کا کس قدر زمانہ ملّتِ عثمانی کی خدمت گزاری میں صرف ہونے والا ہو! اور یہ کہ جب اُن کے تخیل کی تکمیل کا وقت آئے گا تو وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہوں گے اور نہ ان کو یہ معلوم ہوگا کہ جس سرزمین پر اُنھوں نے قدم رکھا ہو اُسی کی خاک میں اُن کو ۲۲ برس بعد دفن ہو جانا ہو۔ قُدرت اپنے نقشوں کو کس قدر پوشیدہ رکھتی ہو! قصّہ مختصر شیخ اُسی وقت تُرکی میں پہنچے جس وقت ان کو پہنچنا چاہیے تھا۔

قسطنطنیہ میں پہنچنے کے چند ہی روز بعد شیخ کی ملاقات عالی پاشا وزیرِ اعظم سے ہوئی اور پہلی ہی ملاقات میں بقول صاحب "بیداری ایران"

"بقوتِ جاذبہ، فضیلت و بیان چناں صدرِ اعظم را بسوئے خود جذب نمود کہ ما فوق تصوّر نمی شود"

شیخ کی اسی قوتِ جاذبہ نے بہت جلد عثمانی قوم کے امرا اور اکابر اور علما اور عوام کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ وزیرِ اعظم نے شیخ کے علم و فضل سے متاثر ہوکر ان کو امورِ معارف کی اصلاح کی غرض سے انجمنِ معارف میں شریک کر لیا۔

"و رسمیتِ ایں مقام را از حضورِ سلطان برائے اش حاصل کرد"[۵۹]

چند ہی روز بعد "انجمنِ دانش" کے رکن بھی بنائے گئے۔ انجمنِ معارف میں شیخ کو اپنے خیالات اور اصلاحی تجاویز پر عمل کرنے کا کافی موقعہ ملا اور رفتہ رفتہ انھوں نے اربابِ بصیرت کے قلوب پر اپنا نقش قائم کرلیا۔

"سیّد در مدّتِ قلیلے با اصلاحاتِ معارف آں جا موفق شد و یکسر صورتِ تازہ بہ آں بخشید۔ طرزِ تحصیل و پروگرام را تغیر دادہ یک طریقۂ خاص و موزوں و معقولے را مقرر نمود۔ کلاسہائے فنّی را ایزاد کرد و در مجامع علمیہ نطق ہائے غرّہ و خطابہ ہائے پُرجوش دایر بمطالبِ علمی، صنائع اقتصادیات، تجارت، اتحادِ مسلمین و اشکالِ مشرق وغیرہ ایزاد می فرمود...
رفتہ رفتہ حسنِ صوتِ وی در تمامِ اقطارِ ترکیہ نفوذ کردہ اہالی برائے شنیدنِ خطاب ہا و فرمایشات بہ بابِ عالی می شتافتند و سیّد ہم اوقاتے را برائے افادۂ عموم معیّن کرد بلا فاصلہ بعطائے کانفرنس ہا و اجرائے معاوضہ می پرداخت۔ اہالیِ ترکی والہ و مفتوں فضائل و کلامِ سحرآفریں شدہ ہمیشہ بہ در او مجتمع و از وی مدح و تمجید می کردند۔ خطابہ ہائے او را

۵۹۔ اعظمی۔ در مجلہ کابل

"سحر القلوب" نام نہادہ بودند"۔ [۵۰]

دائرہ معارف کے علاوہ بھی جامعۂ کبیر سلطان احمد اور ایاصوفیہ میں انھوں نے دینی اور اجتماعی مواعظ کا سلسلہ جاری کر دیا اور "سحر القلوب" کی آواز ترکی سے نکل کر شام و عراق و حجاز تک پہنچنے لگی۔ لیکن ہر دلعزیزی شہرت اور مقبولیت کے اس درجے پر اس قدر جلد پہنچ کر اُن کو ترکی کے قدامت پسند علما کی ایک سخت ٹکر برداشت کرنی پڑی۔ ہوا یہ کہ شیخ کا فلسفۂ اسلام ترکی علما کی ایک مقتدر جماعت کے لیے سخت ناپسندیدہ تھا۔ گو کہ عوام کی ایک جماعت شیخ کی طرف مائل تھی لیکن عوام کا یہی رجحان شیخ الاسلام کے گروہ کو سخت ناگوار گزرا۔ جیسا کہ ہونا چاہیے تھا اُن کی وسعتِ خیال اور بلندئ عزائم جس کا اظہار وہ اپنی تقریروں میں کرتے تھے، شیخ الاسلام کی نظر میں بدعت قرار پائی۔ علاوہ بریں وہ گروہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ اگر شیخ کی ہر دلعزیزی اسی طرح بڑھتی رہی تو قدامت پسند علما کا اقتدار اُسی نسبت سے گھٹتا رہے گا۔ اور بالآخر اس جماعت کی مطلقیت کو سخت صدمہ پہنچے گا لہٰذا کچھ تعجب نہیں کہ استانبول کے علما کا کلیسائی اقتدار شیخ کے خلاف شمشیر بکف کھڑا ہو گیا۔

سلطان عبدالمجید کا یہ آخری زمانہ تھا اور تحسین آفندی اُس وقت جامعہ قسطنطنیہ کے صدر تھے۔ وہ اُس زمانے کے وسیع النظر علما میں سے ایک تھے اور شیخ کے خیالات کی قدر کرتے تھے۔ ان کے علاوہ جماعتِ علما میں سے دوسرے شخص سلیمان بلخی تھے۔ جو اپنے علم و فضل کی وجہ سے مرجعِ خلائق تھے اور شیخ کی تعلیمات کو دل سے پسند کرتے تھے۔ منیف پاشا

---

[۵۰] اعظمی۔ در مجلّہ کابل۔

وزیر تعلیمات بھی شیخ کے قدردانوں میں سے تھے لیکن ان سب کی متحدہ طاقت بھی شیخ الاسلام اور اس کے حاشیہ نشینوں کی ریشہ دوانیوں کا مقابلہ نہ کرسکی۔ اگر سوال صرف فلسفۂ مذہب ہی کا ہوتا تو شاید اس جماعت کو شیخ پر حملہ کرنے کا موقعہ بمشکل مل سکتا، لیکن شیخ اپنے نصب العین کو دل میں رکھ کر کام کرنے کے عادی نہ تھے۔ اس کو اُن کی خوبی سمجھیے یا ان کا عیب بے باک وہ اس قدر تھے کہ کسی شخص یا جماعت سے کبھی مرعوب نہ ہوتے تھے۔ یہی باتیں اُن کے مخالفین کی تقویت کا باعث ہوئیں۔ اپنے لیکچروں میں شیخ اکثر مطلقیت اور شہنشاہیت پر بھی اعتراضات کیا کرتے تھے اور یہی اعتراضات بابِ حکومت اور شہنشاہیت پرست وزرا کو مشتعل کرنے کا باعث ہوئے۔ رمضان ۱۲۸۷ھ میں شیخ نے دارالفنون مسجد فاتح سلطان محمد میں ایک تقریر کی اور اس تقریر سے ایک طوفان اُٹھا جس نے قسطنطنیہ میں شیخ کا قیام ناممکن کر دیا۔ اس تقریر کے متعلق مختلف اور متضاد بیانات ہمارے سامنے ہیں اور افسوس یہ ہے کہ وہ سب نہایت مجمل بلکہ بعض نہایت مہمل بھی ہیں کسی بیان سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ وہ مطالب کیا تھے جن کو علما نے قابلِ اعتراض سمجھا اور جن کی بنا پر شیخ کے خلاف کُفر کا فتویٰ تک تیار ہو گیا۔ جس طرح کہ آج اُسی طرح اُس زمانے میں بھی علماء سوء حق کے مقابلے میں اپنی شکست کا اعلان کُفر کے فتووں سے کیا کرتے تھے۔ بہرحال ہم چند بیانات کو مختصراً اِس جگہ درج کیے دیتے ہیں:-

۱۔ شیخ نے دورانِ تقریر میں چند اشعار کے مطالب بیان کیے اور وہ مطالب قابلِ اعتراض سمجھے گئے۔ اشعار یہ تھے کہ

علمِ حق در علمِ صوفی گم شود   ایں سخن کے باورِ مردم شود
علمِ صوفی حادث و حق از قدیم   ایں چناں درفہم آید اے سلیم[۵۶۰]

۲۔ در ماہ رمضان المبارک ۱۲۸۷ھ ہجری مدیر عمومی دارالفنون یک کونفرنسے بدہد۔ مشارٌالیہ اگرچہ ضعفِ زبان ترکی را عذر قرار دادہ امّا بہ سبب اصرار خواجہ تحسین آفندی بالمجوریہ بہ اعطائے یک کونفرنس را قبول کردہ مباحثۂ آں را نوشتہ بنابر معارف صفوت پاشا تقدیم نمود۔ موضوع کانفرنس از طرف نظارت معارف و از طرفِ مجلسِ معارف باممنونیت تفویب کردہ شد،،[۵۶۱]

۳۔ بنابرعلیہ وقتے کہ سید جمال الدین افغانی بہ منبرِ خطابہ برآمدہ و ایراد نطق می نمود، شیخ الاسلام حسن فہمی افندی بہ امید یافتن یک خطا تماماً وضعیت یک مترقب را گرفتہ بود۔ سید جمال الدین افغان دریں کونفرنس خود معصیتِ انسانیہ را بہ یک "بدن حیٌ" تشبیہ و تمام صناعت را بموقعہ یک یک عضو نشان می داد۔ از جسم و روح بحث کردہ وقتے کہ مسئلہ بفرق بینِ نبوّت و حکمت انتقال کرد، گفت، حضرتِ نبوّت موجہہ اِلٰہیہ است تاکیست بدست آوردہ نمی شود۔ یَخُصُّ اللّٰہُ بِہَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَاتِہٖ:۔ باری تعالیٰ بدرجۂ نبوت کسے را می خواند از بندگانش امتیاز و اختصاص می دہد۔ ہم چنیں ذاتِ خداوندی دانا تر است بہ ایں کہ شخصے را بہ رسالتِ خود انتخاب می نماید۔ فقط حکمتِ فکر و نظر با معلومات می تواں بدست آوردہ شود، بین نبی و حکیم ایں چنیں یک فرق نشان داد۔ نبی از خطا معصوم است۔

۵۶۰۔ اخبار وطن قسطنطنیہ ۳ اگست ۱۹۳۴ء۔ ۵۶۱۔ اخبار وطن قسطنطنیہ۔ ۲ اگست ۱۹۳۴ء

فقط حکیم خطا می تواں کرد ۔ احکامِ نبوّت چوں بالائے حکم الٰہی موسس است۔ دریں راہ بہ ہیچ یک صورتِ باطل صدور نمی کند و عمل کردن بہ ایں از فرائضِ ایمان است ۔فقط بیایم بہ مسئلۂ حکما۔ اتّباع ایں ہا اصلا جائز نیست ۔ تنہا آنہائے را کہ افضل وادلے باشند ، تفریق کردہ بہ آن افکار تبعیت می توان کردہ شد کہ ایں برائے قسمے کہ شایانِ اتّباع باشد ہم شرطِ یگانہ کردم ۔ مخالف نہ بودن آرا مذکورہ است بشرعِ الٰہی ۔"

ایں سخن ہا سیّد جمال الدین افغانی بہ سخن ہائے و نوشتہ ہائے تمام علمائے اسلامیہ موافق بود ۔ فقط تنہا شیخ الاسلام بہ سببِ رقابتے کہ بہ نسبت سید داشت ، برعلہ او برآمد کہ سیّد جمال الدین نبوت را بہ مرتبہ صناعت فرد آوردہ و برائے اثباتِ سخن و موضوع کانفرنس صنعت و صناعت بود ۔ برائے ایں ہم از نبوت بحث کردن ان را ہم بہ اعداد صنایع داخل کردن است ۔" گفتہ اشاعت کرد حتیٰ دریں خصوص بر علہ سید جمال الدین افغانی از طرف وکیل درس ہا یک رسالہ نیز تحریر گرفتہ شدہ بود ۔

ایں را رنگ رنگ روایت می کنند ۔

در اثنائے کہ جمال الدین افغانی دائر بہ صنعت و بضاعت کونفرنس مذکور را اعطامی کرد ، ایں را ہم گفت کہ "وقت ایں نیست کہ تنبل و مسکیں بہ نشنیم ۔ باید بکوشیم زیرا ہر کسے تنہا بسا بہ کوشیدن می تواند و بہر مقصدے کہ داشتہ باشد ، برسد ۔ حتیٰ حضراتِ انبیائے کرام عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام ہم وقتے کہ نہ کوشیدہ اند ، و زحمت نہ کشیدہ اند ، عقب ماندہ اند ۔"

ایں سخنِ جمال الدین از طرف شیخ الاسلام و طرفدارانِ او بہ ایں صورت

تحریف کرده شد که "انسان با کوشیدن پیغمبر می شود" و به این ترتیب بر مخالفت سید جمال الدین افغانی بر آمدند"۔ [ح ۶۲]

۴۔"سید جمال الدین افغانی در دار الفنون معلّم بود۔ تحسین آفندی در اثنائے که با این رفیق خود برابر برائے مرتبہ افکار خلق خدمت می کردند بصورت غیر منتظر، دو چار فلاکت شد۔ در وقتِ صدارت عالی پاشا یک روز سید جمال الدین افغان در دار الفنون یک درسِ عمومی می داد۔ خواجہ تحسین آفندی هم در کرسئ تدریس با او حاضر بود۔ مشارٌ الیہ این ها را بطلبہ می نمانید۔ هوائے نیمے و تنفس باعثِ اصلئ حیات می باشد"۔

تقریرات و تبیئنات خود را با تجربہ ثابت کردن خواستہ بزیر یک فانوس یک کبوتر نهاد۔ فانوس چون با هوا پر بود۔ کبوتر بالطبع طپیدن و پریدن خواست۔ در عقب این دقتے که هوائے فانوس تخلیہ کرده شد۔ کبوتر اکنوں موقوف سکونت می ایستد و اثرِ حیات نشان نمی داد۔ پس ازیں تجربۂ معروفہ که هر روز در خانہ تکرار کرده می باشد۔ انعامات و ملاحظات مهتمہ که سید جمال الدین افغان می داد از طرف خلق تفسیر یافتہ بنا بریں دار الفنون بند گردید۔ هجومے که بر سیّد جمال الدین افغان جریاں یافت، تنها به این قدر کفایت نہ کرد۔ در یکے جوامعہ شریفہ سلطان احمد ابا صوفیہ از کتاب" احیاء علوم الدین " فیلسوف اسلام امام ابو محمد غزالی که به نسبت شانِ خیلے احترام داشت، راجع به علمائے سوء یک موعظۂ آں را ایزاد کرد۔ الحاصل سیّد جمال الدین افغان که دریں کونفرس موعظۂ خود بقدرِ ذرّہ هم از حدودِ شریعت تجاوز نہ کرده بود، تکفیر کرده باشد۔ چوں

[ح ۶۲] جریده مصور۔ استانبول

مسئلہ علاّمہ مشارٌالیہ باخبر گردید، گفت "آن ہما مرا تکفیر می کنند و من ہم آنہارا" ابن سینا در وقتِ تکفیرِ او چیزہا گفتہ بود۔

در دہر چوں من یکے وآں ہم کافر
پس در ہمہ دہر یک مسلماں نبود

من ہم بہ ایں صورت یک جواب قطعی دارم۔

اکنون برائے شیخ الاسلام حسن فہمی افندی کہ یک بہانۂ خوبے پیدا شدہ بود، برائے تمام واعظان کہ در جوامع ایراد موعظہ می نمودند۔ بریں صورتِ تعمیم ایں را فہمانید کہ سید جمال الدین افغان نشرِ افکارِ فاسدہ می کند۔ در مقابلِ آن سید جمال الدین برائے مدافعہ برخاستہ۔ امّا چوں برائے حل وفصلِ آں می بایست مسئلہ با شیخ الاسلام محاکمہ می شد، لہٰذا طلبِ محاکمہ نمود۔ بنا بریں موجبِ حدّتِ شیخ الاسلام گردید۔ جراید آں وقت ازیں اختلاف دور و دراز بحث کردند۔ بعضے از جراید طرف شیخ الاسلام را و بعض ازاں طرف جمال الدین افغان را التزام کردند۔ مسئلہ بسیار وخامت پیدا کرد بدرجۂ کہ حلّ آن متوقف بہ امر صدارتِ عظمیٰ بود تا ایں کہ صدرِ اعظم عالی پاشا مفارقت سید جمال الدین را برائے چندے ماہ از استانبول لازم دانستہ بالمجبور بمشارٌالیہ تکلیف کرد۔ ازاں جائے کہ جمال الدین دریں مسئلہ ذیحق بود، اولاً در برابر ایں مغلوبیت ناحق را بسیار حدّت و شدّت نمودہ فقط بہ سببِ امتثالِ امر صدارت عظمیٰ در اوایلِ ماہِ محرم ۱۲۸۸ھ ہجری از اسلامبول بہ طرفِ مصر حرکت نمود[۶۳]

[۶۳] محمد علی توفیق بک در کتاب رسمدار زیر سرلوحۂ مقالہ "بدیعہ شعر" صفحہ ۳۶۴ شمارہ ۴

۵۔ چوں روزِ موعود رسید جمعیتے بے حساب اعیان و اشراف و علما و وزرا و سائر طبقات در دارالفنون اجتماع یافتند۔ پس سید بالائے ممبر آمد و شروع بہ تکلم نمود۔ خطابہ را چناں بفصاحت و بلاغت بہ آخر رسانید کہ مردم را مات و مبہوت بہ آن سحربیان نمود۔ روسائے اہلِ علم را بعضے آرائے سیّد در ترویج صناعت و معارف خوش نہ آمد و مطلب را بہ شیخ الاسلام رسانیدند۔ مشارٌ الیہ را نظر بہ کدورتِ سابقہ فرصت داد و راہ بہانہ بدست آمدہ تبعید سید را از سلطان استدعا نمود۔ و پس از بابِ عالی چنیں حُکم صادر گردید کہ برائے اسکات فتنہ و رفع غائلہ سید چند ماہ از اسلامبول مہاجرت اختیار کنند و پس از آرامے و سکوت مردم اگر میل نمود باز معاودت نماید" ۵۶۴

۶۔ شیخ نے ایک لیکچر وزیر سلطنت کی فرمائش پر دیا تھا۔ جس میں کہا تھا کہ خدائے تعالیٰ نے مخلوق میں کاموں کو تقسیم کر دیا ہے۔ کوئی طبیب ہے کوئی مہندس ہے کوئی صنّاع ہے۔ اس لیکچر میں اس وقت کے بعض علما شریک تھے انھوں نے اس کا یہ مطلب بیان کیا کہ جمال الدین نے نبوت کی توہین کی ہے۔ جمال الدین نے کہا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ امام غزالی کا خیال ہے اور مجھ پر تہمت ہے لیکن علما اور صوفیا کے ہجوم کی وجہ سے بعض وزرا نے شیخ کو مشورہ دیا کہ وہ چلے جائیں۔ اِن وزرا نے یہ بھی کہا کہ ہم خود لوگوں کی اصلاح چاہتے ہیں، مگر معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قوم ابھی اصلاح کے لیے تیار نہیں ہے"۔ ۵۶۵

۷۔ حاجی یونس وہبی نے جو اس وقت کے مشہور علما میں سے تھے

---

۵۶۴ تاریخ بیداری ایران۔ ۵۶۵ امیر شکیب ارسلان شامی

اور اس مجلس میں موجود تھے، شیخ کی تقریر کے غلط معنی پیدا کیے اور حسن فہمی افندی شیخ الاسلام کے ذریعے سے اُن کو سلطان تک پہنچایا گیا اور یہ سمجھایا گیا کہ شیخ کا اندازِ بیان شہنشاہیت اور مطلقیت کے بہت خلاف تھا اور ایسا تھا جس سے عامۃ المسلین کے جذبات بھڑکنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ یونس افندی نے بعد میں اپنی اس بداعمالی اور شیخ کے خلاف سازش کرنے کا اقبال بھی کیا اور وہ اپنے اس فعل سے تائب ہوئے۔[۲۶]

ان تمام بیانات سے یہ معلوم کرنا تو تقریباً محال ہے کہ شیخ کی وہ تقریر تھی کیا جس سے یہ سارا فتنہ برپا ہوا۔ البتہ یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اصلی جھگڑا شیخ اور شیخ الاسلام کے درمیان تھا اور موخرالذکر نے شیخ کو نقصان پہنچانے کے لیے ان کے خلاف کوئی الزام تراشا۔ مندرجہ بالا بیانات میں شیخ کی تقریر کے جن الفاظ کی طرف اشارے کیے گئے ہیں ان میں سے اکثر الفاظ مہمل اور بے معنی سے معلوم ہوتے ہیں۔ شیخ نے نبوت کی توہین کی، یا امام غزالی کے فلسفہ کو اپنی بحث میں پیش کیا، یا علمائے وقت پر نکتہ چینی کی، یا شہنشاہیت اور مطلقیت پر اعتراضات کیے — جو کچھ بھی انھوں نے کیا یا کہا اس کی نوعیت اور اصلیت کا تعین نہیں کیا جا سکتا اور نہ اِن بیانات سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ فی نفسہٖ وہ مسئلہ کیا تھا جس پر علما نے اعتراض کیا۔

"ردِ علی الدہرین" کے مقدمے میں بھی اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے مگر وہاں بھی سلسلۂ واقعات کی کوئی تشریح و توضیح نہیں کی گئی۔

---

[۲۶] اخبار وطن قسطنطنیہ

البتہ اگر اِن بیانات سے کوئی امر صاف طور پر سامنے آتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ قسطنطنیہ کے قدامت پسند علما سے شیخ کی ٹکر ہوئی اور اُن کو اسی وجہ سے استانبول سے رخصت ہونا پڑا۔ اس قضیے کے اسباب کی قدرِ قلیل وضاحت دو مستند بیانات سے ہوتی ہے۔

بلنٹ نے اپنے روز نامچے میں براؤن کے حوالے سے لکھا ہے کہ "جمال الدین کا نقطۂ نظر درحقیقت ان کا اپنا ہی نقطۂ نظر تھا، وہ قسطنطنیہ میں اس وسعتِ خیال کے بانی تھے جو مدحت کے دستور اساسی میں نمایاں ہوئی۔ قسطنطنیہ میں شیخ کے بڑے حامی عالی پاشا اور فواد پاشا تھے۔ شیخ الاسلام ان کے مخالف تھے۔ اور ان کے متعلق ایک دفعہ شیخ نے مجھے یہ واقعہ سنایا تھا کہ جب شیخ پہلی دفعہ قسطنطنیہ گئے تو شیخ الاسلام کے یہاں بغرض ملاقات تشریف لے گئے وہاں انھوں نے دیکھا کہ ساری دنیا شیخ الاسلام کے سامنے رکوع کی حالت میں ہے مگر شیخ نے اس کی کچھ پروا نہ کی۔ وہ بڑھے چلے گئے اور نہایت بے پروائی اور جرات کے ساتھ شیخ الاسلام کے پہلو میں جا بیٹھے۔ شیخ الاسلام جمال الدین کی اس جسارت کو کبھی نہ بھول سکے اور آخر کار ایک لیکچر کا بہانہ کرکے ان کے کفر کا اعلان کرا دیا۔ جب کُفر کا اعلان کیا گیا تو شیخ عالی پاشا کے پاس پہنچے اور مطالبہ کیا کہ ایک عام مجلس میں ان کا اور شیخ الاسلام کا مناظرہ کرایا جائے۔ مگر عالی پاشا اس درخواست کو منظور نہ کر سکتے تھے۔ صوفیا کی جماعت میں سخت شور و شغب برپا ہوا۔ اور اس لیے شیخ کو مشورہ دیا گیا کہ وہ حج کرنے چلے جائیں"۔

ے اخبار وطن۔ قسطنطنیہ

صرف ایک اور ذریعے سے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہی:-

"شیخ الاسلامِ آں وقت، حسن فہمی آفندی، خیلے مخالفِ جمال الدین افغان بود۔ ایں شخص بیچارہ از شہرت ایں ذات بابرکات بہ اندیشۂ کہ مبادا شیخ الاسلامی زدستش بگیرد، ترسیدہ دبنا بریں رقیب او بودہ۔"[۵۶]

قصہ مختصر ان اوراق کے جن پڑھنے والوں کو شیخ کے حالات سے اُن کی طبیعت کا اندازہ ہوگیا ہوگا وہ بہ آسانی یقین کرلیں گے کہ بلنٹ کا بیان شیخ الاسلام کے پہلو میں جا بیٹھنے کے متعلق غلط نہیں ہوسکتا اور شیخ کے مزاج کی حدّت اور شدّت کے باعث اس قضیے کا بڑھ جانا بھی بعید از قیاس نہیں ہی۔ نیز یہ بھی ممکن ہی کہ شیخ کا لہجہ شہنشاہیت اور مطلقیت کے خلاف رہا ہو اور اسی بنا پر شیخ الاسلام نے سلطان کو ان کے خلاف بھڑکا دیا ہو۔ ہم کو معلوم ہی کہ شیخ کی زبان ایک شمشیر بے نیام تھی اور وہ جو کچھ دل میں ہوتا تھا اس کو صاف صاف کہا کرتے تھے اس لیے اس قسم کے کسی قضیے کا پیدا ہونا ذرا بھی تعجب انگیز نہیں۔

واقعہ یہ ہی کہ قسطنطنیہ کے دورانِ قیام میں شیخ کی شخصیت کے خدو خال بالکل واضح ہوگئے۔ ان کی جرات اور بے باکی، ان کی قابلیت اور قوتِ ایمانی اور قدامت پرستوں کے خلاف اُن کے شدید جذبات، یہ سب چیزیں جو ان کی سیرت کا نمایاں جزو ہیں، قسطنطنیہ کے دورانِ قیام میں برسرِ عام آگئیں۔ دوستوں نے سمجھ لیا کہ شیخ کسی حال میں باطل کی قوتوں سے سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں اور دشمنوں نے جان

---

[۵۶] "جمال الدین افغانی" مطبوعۂ ثباتِ استانبول

لیا کہ وہ دنیا کی کسی طاقت سے مرعوب نہیں ہو سکتے۔ شیخ کو بھی اپنی زندگی میں پہلی دفعہ قدامت پسند طبقے کی قوت کا اندازہ ہو گیا اور اس زمانے کے تنگ خیال علما سے ان کا یہ پہلا تصادم ان کی زندگی کا ایک نشان راہ بن گیا۔اسی وقت انھوں نے محسوس کر لیا ہوگا کہ عالمِ اسلامی کے حالات کی اصلاح کا کام قدیم علما کی اصلاح سے شروع ہونا چاہیے۔ ان کا یہ تجربہ ایران میں ان کے کام آیا جہاں باوجود اپنی قدامت پسندی کے علما کی ایک بہت بڑی جماعت ان کے ساتھ ہو گئی تھی۔ اسی طرح "مطلقیت" اور "شہنشاہیت" کی قوت سے بھی ان کو پہلی دفعہ قسطنطنیہ میں واسطہ پڑا اور جو کچھ انھوں نے وہاں دیکھا وہ آیندہ زندگی میں ان کے سیاسی عقائد کا رہنما تھا۔

مرزا لطف اللہ کا بیان ہے کہ علاوہ شیخ الاسلام کی مخالفت کے خود سلطان اور ان کے وزرا شیخ کی سیاسی دلچسپیوں سے متوحش ہو گئے تھے اور فتنۂ یمن کے سلسلے میں ان کے طرزِ عمل کو اربابِ حکومت نے اچھی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔

"سید متعہدِ اصلاحِ آں (فتنۂ یمن) می شود بدون مخارج وقشون مشروط بر اینکہ پس از اصلاح محضرے بہ امضائے سلطان و اولیائے دولت و ملّت اصلاح آن امر را بدستِ سیّد تصدیق کنند۔"

یہ تو ناممکن تھا کہ شیخ بغاوتِ یمن اور دیگر سیاسی حالات کے متعلق خاموش رہے ہوں اور یہ بھی بالکل قرینِ قیاس ہے کہ ان کے خیالات اربابِ حکومت کو پسند نہ آئے ہوں اس لیے مرزا لطف اللہ کا یہ خیال کہ شیخ کے قسطنطنیہ سے خارج کیے جانے کا باعث علاوہ

شیخ الاسلام کی مخالفت کے خود شیخ کے سیاسی خیالات بھی تھے، غلط نہیں معلوم ہوتا۔ غرض یہ کہ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، حکومت کی طاقت سے بھی شیخ قسطنطنیہ میں آشنا ہوگئے اور اب تجربے کی ایک نئی روشنی لے کر وہ پھر مصر کی جانب متوجہ ہوئے۔

آغاز ۱۸۷۱ء میں شیخ نے رختِ سفر باندھا لیکن قسطنطنیہ میں وہ اپنی تعلیمات کے لازوال نقوش بہت سے دلوں پر چھوڑ گئے۔

مصر۔ دوسرا سفر

کہا جاتا ہے کہ قسطنطنیہ سے روانہ ہوتے وقت شیخ کے دل میں سفرِ حج کا خیال تھا لیکن اب وہ دوسرے حج اکبر کی تیاریوں میں مشغول ہوچکے تھے اور اسی کے ارادوں کو دل میں لے کر وہ ترکی سے سیدھے مصر آئے جہاں وہ ۲۲ مارچ ۱۸۷۱ء کو پہنچے اور اسی تاریخ سے مصر اور دنیائے اسلام کی سیاسی زندگی میں ان کی شخصیت پوری طرح نمایاں ہوگئی اور اسی نقطے سے ان کی شہرت بین الاقوامی اہمیت حاصل کرنے لگی۔

شیخ جس وقت دوبارہ مصر میں داخل ہوئے تو خدیو اسمٰعیل برسرِ حکومت تھا۔ سلطان ترکی کی سیادت محض برائے نام باقی رہ گئی تھی، انگریزوں اور فرانسیسیوں کے قدم آگے بڑھتے آتے تھے۔ نہر سویز کا افتتاح ہوچکا تھا اور یورپین سیاست کی یہ سب سے بڑی زنجیر مصر کے گلے میں پڑ چکی تھی۔ اسمٰعیل کی بد اعمالیوں نے ملک اور رعایا کو تباہ حال کردیا تھا جن کے کندھوں پر خدیو کی فضول خرچیوں کا ایک پہاڑ رکھا ہوا تھا۔ اس وقت مصر کا قومی قرضہ ساڑھے نو کروڑ پونڈ تھا اور اپنی حکومت کے ہر سال میں اسمٰعیل اس قرضے کو ستر لاکھ پونڈ کے اوسط



اسماعيل باشا ، خديو مصر ١٨٦٣ــ١٨٧٩

سے بڑھا رہا تھا! ۔ فلاحین قحط کے عذاب میں مبتلا تھے ۔ یورپ کے سرمایہ دار اور ساہوکار اپنے منافع اور سود کے وصول کرنے کی فکریں کر رہے تھے اور باوجود ان کے سخت تقاضوں کے اسمٰعیل دیوالیے کی فضول خرچیاں کم نہ ہوتی تھیں ۔ اس تباہ کن عہد کے آخری ۸ سال شیخ نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ۔ یہی وہ زمانہ تھا جب دولِ یورپ نے یورپین قرضخواہوں کی خاطر قرضہ کی ادائیگی کا انتظام کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کر دیا تھا اور مصر کی مالی حالت کی نگرانی انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اپنے ذمے لے لی تھی ۔ اس کمیشن کا اصلی مقصد یہ تھا کہ مصر کے محاصل پر دول کا قبضہ قایم ہو جائے ۔ اسی زمانے میں اسمٰعیل نے نہر سویز کے حصص بھی فروخت کر ڈالے ۔ اس کو سوائے اس کے کسی بات کی فکر نہ تھی کہ خرچ کرنے کے لیے کافی روپیہ کسی نہ کسی طریقہ سے ملتا رہے ۔ حصص فروخت ہو جانے کے بعد نہر سویز کے معاملات میں مصری حکومت کا کوئی دخل باقی نہ رہا اور وہ فولادی زنجیر بالکل مکمل ہو گئی جس سے دول نہ صرف مصر کو بلکہ تمام مشرقی ایشیا کو باندھنا چاہتی تھیں ۔ بلاشبہہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ خدیو اسمٰعیل کی زندگی نہ صرف اپنے لیے بلکہ دوسروں کے لیے اور نہ صرف مصر کے لیے بلکہ غیر ممالک کے لیے بھی ایک لعنت ثابت ہوئی ۔ اس طرح ۱۸۷۵ء اور ۱۸۸۲ء کا درمیانی زمانہ مصر کے مصائب کا بدترین زمانہ تھا اور یہی وقت مصر میں شیخ کی جد وجہد کا وقت تھا ۔ مصر کے اس دورِ ابتلا میں شیخ نے وہاں کی مظلوم اور خستہ حال رعایا کو مطالبۂ حقوق اور عزت نفس کا سبق دینا شروع کیا اور شیخ کے لیے اس وقت

دنیائے اسلام کی یہ تاریکی ایک زبردست پیامِ عمل بن گئی۔ وہ دیکھ رہے ہوں گے کہ ترکی جو ایک زمانے تک مسلمانانِ عالم کی نظروں اور امیدوں کا مرکز تھا، اب بسترِ مرگ پر پڑا ہوا ہے۔ روس کی فوجیں قسطنطنیہ کے دروازے پر ملّت عثمانی کی موت کا نقارہ بجا چکی تھیں۔ برلن میں دولِ یورپ کی خفیہ کانفرنس اسلامی ممالک اور خصوصاً ترکی اور مصر کی قسمت کا فیصلہ کر چکی تھی، قبرص پر برطانوی قبضہ تسلیم کیا جا چکا تھا، فرانس کو تونس پر قبضہ کر لینے کی اجازت دی جا چکی تھی، شام میں فرانس کے حقوق کو برطانیہ نے تسلیم کر لیا تھا۔ اِن حالات میں خدا جانے شیخ کا دردمند دل کس قدر بے چین ہوگا۔ ترکی کی طرح مصر میں بھی قومی مصائب اور ابتلا نے قوم پرستوں کی ایک مختصر اور کم زور جماعت پیدا کر دی تھی اور غالباً اسی ایک خفیف شعاعِ امید کے بھروسے پر شیخ نے مصر میں کام کرنے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ مصر پر دولِ یورپ کی گرفت اس قدر سخت ہوتی جاتی تھی کہ نالایق اسمٰعیل بھی اس کو محسوس کرنے لگا تھا اور گھبرا گھبرا کر قوم پرست جماعت سے امداد کا خواہاں ہوتا تھا۔ اپنے ملک کو تباہ کر ڈالنے کے بعد اب جو اس کو ہوش آچلا تھا تو وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر اس فکر میں تھا کہ کم از کم قوم پرستوں کی جماعت کو اپنا معاون بنالے اور آئینی اصلاحات نافذ کر کے اس گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالے، لیکن یورپین مدبرین اور ساہوکار بھی غافل نہ تھے، وہ جانتے تھے کہ اگر خدیو نے مصری رعایا کو آئینی حقوق دے دیے تو یا تو پارلیمنٹ بہت سے قرضوں کی ادائیگی سے انکار کر دے گی

یا کم از کم اُن کی ادائیگی میں مزید مشکلات پیدا ہو جائیں گی ۔ اس طرح اپنے روپے کو ڈوبتے ہوئے دیکھ کر یورپین ساہوکاروں نے مصر میں آئینی اصلاحات کا نفاذ روکنے کے لیے انتہائی سیاسی اثرات سے کام لینا شروع کیا ـــــ ان مشکلات میں مصر کی قوم پرست جماعت پھنسی ہوئی تھی اور اِس نازک زمانے میں جمال الدین جیسے داعیٔ حق کا مصر میں آجانا ایک فالِ نیک سمجھا گیا ۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اگر اس زمانے میں شیخ نے مصر میں قومی تحریک شروع کرکے علمائے ازہر اور قوم پرستوں کے اندر ایک نئی روح پیدا نہ کر دی ہوتی تو یقیناً اسی زمانے میں مصر کا خاتمہ ہو چکا ہوتا ۔ آیندہ سطور میں شیخ کی اس جدوجہد کو جو انھوں نے مصر میں شروع کی ،اسی نقطۂ نظر سے دیکھیے ۔

پہلی دفعہ ۴۰ دن کے مختصر قیام میں شیخ نے جو نقوش مصریوں کے قلوب پر ثبت کیے تھے وہ ایسے نہ تھے جو مٹ جاتے ۔ اسی لیے جب دوبارہ شیخ مصر میں آئے تو ان کو اپنے کام کے لیے بہت کچھ مواد تیار ملا ۔ مصر میں داخل ہونے کے چند ہی روز بعد اُن کے فضل و کمال کا شہرہ ریاض پاشا[۴۸] وزیرِ اعظم کے کانوں تک پہنچا ۔ پہلی ہی ملاقات میں شیخ کی شخصیت نے ان پر اتنا اثر جما لیا کہ خود وزیرِ اعظم کی طرف سے اصرار کیا گیا کہ شیخ زیادہ عرصہ تک مصر میں قیام فرمائیں ۔ دوسری طرف طلبائے ازہر کی جماعت متمنی ہوئی کہ شیخ مصر میں مستقل قیام کا ارادہ کر لیں ۔ خدیو نے بھی ریاض پاشا کی تحریک پر شیخ کے لیے ہزار غروش مصری ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا جو بقول براؤن "کسی خاص خدمت کے معاوضے میں نہیں

---

۴۸ ۔ دیکھیے ضمیمہ نمبر ۱۸

بلکہ ایک معزز مہمان کی عزت افزائی کی غرض سے " مقرر کیا گیا تھا۔

اپنا سجادہ بچھاتے ہی شیخ نے سب سے پہلے ازہر کی طرف توجہ کی۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ ان کی تحریک اگر ازہر میں کامیاب ہوگئی تو گویا سارے ملک میں کامیاب ہوگئی۔ ایک طرف تو وہ علما کی طاقت کو شریک حال کرکے اُس سے کام لینا چاہتے تھے۔ اور دوسری طرف ان کی نظر مصر کی نئی نسل پر جمی ہوئی تھی جو ازہر کے مصلوں کے گرد جمع تھی۔ اپنی سیاسی جدوجہد میں ہر جگہ شیخ نے علما اور نوجوان نسل سے کام لینے کی کوشش کی اور ایران میں تو ان کی کامیابی کا اصلی راز یہی تھا۔

ازہر میں شیخ کی زندگی کی جو تفصیلات حاصل ہوسکیں، وہ بہت دل چسپ ہیں۔ شروع شروع میں وہ جامعہ کے اندر ہی درس دیا کرتے تھے۔ لیکن بعد کو طلبا ان کے مکان پر جمع ہونے لگے۔ اس وقت ازہر کا نصاب تعلیم وہی قدیم نصاب تھا جو زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں اور لوگوں کی بدلتی ہوئی ذہنیت سے بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ جدید علوم کی تعلیم ایک بدعت سمجھی جاتی تھی اور مغربی علوم کی روشنی کے لیے تمام راستے بدستور بند رکھے گئے تھے۔ شیخ نے سب سے پہلے بوعلی سینا کی کتابیں نصاب میں داخل کرائیں اور ان کا درس دینا شروع کیا۔ اسی کے ساتھ وہ فلسفہ اور علم الافلاک اور تصوف پر بھی لیکچر دیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اُس زمانے میں شیخ کے شاگرد ان کے خطبات اور لیکچروں کا ایک ایک حرف قلمبند کرلیا کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ وہ خزانہ اب نایاب ہے۔

باوجودیکہ ازہر میں شیخ ہر دل عزیز تھے مگر پھر بھی بعض قدامت

پسند علما ان کی ان "بدعتوں" کو ہضم کرنے کی اہلیت نہ رکھتے تھے اور اکثر ان کے طرزِ عمل پر اعتراضات کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ جب وہ جغرافیہ کا سبق پڑھانے کے لیے ایک مصنوعی کرۂ ارض مسجد میں ساتھ لے گئے تاکہ طلبا کو زمین کی گردش اور شکل بہ آسانی سمجھا سکیں تو بعض "بزرگانِ دین" بہت چیں بہ جبیں ہوئے لیکن اس قسم کی رکاوٹوں کی پروا نہ کرکے شیخ اپنا کام کیے جاتے تھے۔ ایک نئی دنیا تھی جو وہ اپنے شاگردوں کے سامنے پیش کر رہے تھے! اس زمانے میں عام مذہبی ذہنیت کی اصلاح کے متعلق جو مطمحِ نظر ان کا تھا اور جو کام انھوں نے کیا اس کی حقیقت ان کے دوست بلنٹ کی زبان سے سننے کے قابل ہے۔ بلنٹ لکھتا ہے کہ "گزشتہ دو سو برس میں بہت سے ایسے واعظ گزرے ہیں جنھوں نے ہمیشہ یہ تلقین کی کہ اسلام کے تنزل کا بڑا سبب یہ تھا کہ مسلمانوں نے شریعتِ اسلامی کی اس طرح پابندی نہیں کی اور اسلام کی قدیم سادہ روایات کا وہ احترام نہیں کیا جو ابتدائے اسلام میں شعارِ اسلامی تھا۔ علاوہ بریں ترکی اور مصر میں ایسے مصلحین پیدا ہوئے جنھوں نے محض سیاسی اغراض کے لیے حکومت کا یورپین نقشہ بنایا۔ مگر ان مصلحین نے جو اصلاحات نافذ کیں وہ گویا بہ جبر نافذ کی گئیں اور عوام کے دلوں میں اُن کی جگہ پیدا نہ ہو سکی۔ جمال الدین کی ذہانت و جدّت یہ تھی کہ انھوں نے اسلامی ممالک میں مغربی خیالات رکھنے والوں کی ذہنیت کی اصلاح کرنے کی کوشش کی اور اس امر کی تبلیغ و تلقین کی کہ اسلام کی موجودہ حالت پر نظرِ ثانی کی جائے اور بجائے ماضی سے لپٹے رہنے کے جدید علوم کے ساتھ پرانی تہذیب کے بدلنے کی تحریک کو آگے بڑھایا جائے۔ قرآن

و حدیث سے اُن کی وسیع واقفیت نے ان کو اس کا موقعہ دیا کہ وہ یہ بتائیں کہ اگر قرآن و حدیث کے صحیح معنی پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت اسلام کے اندر وسیع تغیرات کی گنجائش موجود ہے۔ اور مشکل سے کوئی آئینی اور سیاسی اصلاح ایسی ہوگی جو شریعت کے خلاف ہو ....

مصر میں شیخ نے اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کیا کہ اسلام ہر زمانے میں انسانوں کی تمام ضروریات کا کفیل ہونے کے قابل ہے اور عہدِ جدید کی تمام ضروریات کو پورا کر سکتا ہے ....

علما کے تخیل اور ضمیر کو وہ اُن زنجیروں سے آزاد کرانا چاہتے تھے جن میں یہ لوگ صدیوں سے جکڑے پڑے تھے اور بتانا چاہتے تھے کہ اسلام ایک مردہ قالب نہیں ہے بلکہ اس کے اندر اتنی لچک ہے کہ وہ ہر زمانے کی بدلتی ہوئی ضروریات کا کفیل ہو سکتا ہے ......

لیکن یہ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ مغرب میں اصلاح کی اس تحریک کا آغاز ایک ایسے شخص سے ہوا جس نے وسطِ ایشیا کے جمود میں پرورش پائی تھی اور پھر کس قدر تعجب ہے کہ یہ اصلاحی تحریک دور و دراز دارالعلوم ازہر میں شروع ہوئی ۔..........

مصر کی اس ذہنی اور اخلاقی تاریکی کی حالت میں جمال الدین کی تعلیمات ایک عجیب روشنی لے کر ہویدا ہوئیں ...."

شیخ کے شاگردوں کے اقوال سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اُن کی تعلیمات نے کس قدر گہرے اثرات پیدا کیے تھے ۔ تلامذہ کی فہرست میں ہم ایسے مشہور لوگوں کے نام پاتے ہیں جیسے کہ محمد بک

مویلحی، ابراہیم بک مویلحی، مفتی عبدہ، ادیب اسحٰق، شیخ ابراہیم الاغانی جو سب دنیائے علم وفضل میں بہت محترم اور مفتخر تھے۔ اس میں شک نہیں کہ شیخ کے ارشد تلامذہ مفتی عبدہ، تھے جو بعد کو مصر کی قومی تحریک میں شیخ کے جانشین قرار پائے اور جنھوں نے شیخ کے مصر سے چلے جانے کے بعد ان کی مشعلِ ہدایت کو روشن رکھا۔ مفتی عبدہ کے اِن الفاظ سے شیخ کی تعلیمات کی اہمیت اور اثرات کا اندازہ ہوتا ہے:-

"ایں مفتی مشہور عصر در یک مقالۂ خود می گوید کہ پیش از دیدن جمال الدین افغان گویا چشم کور، گوشم کر و زبانم گنگ بود" ؎۵

اسی طرح ادیب اسحٰق جو مصر کے نامور اہلِ قلم تھے، شیخ کے متعلق اپنے احساسات کو یوں ظاہر کرتے ہیں کہ:-

"چیزے کہ من می دانم ہمہ آں از جمال الدین افغان آموختہ ام" ؎۶

اسی طرح شیخ کے شرکائے کار اور معاونین میں ایک بڑی جماعت ازہر کے نوجوانوں کی تھی۔ جن کے جوشِ عمل نے چند روز میں مصر کی زندگی کا نقشہ ہی بدل ڈالا۔ شیخ ان لوگوں میں سے نہ تھے جو صرف علمی صحبتوں میں خاموش بیٹھے رہتے۔ ان کی فطرت پارہ کی طرح بے چین تھی اور ان کی نظر بہت دور تک جاتی تھی اور وہ خاموش رہ کر دھیمی رفتار سے کام کرنے والے آدمی نہ تھے۔ ان کا سمندر ہر وقت ایک طوفان مانگتا تھا اور اُن کا بے قرار دل جلد سے جلد نتائج طلب کرتا تھا۔ منزل کی دوری کے احساس سے ان کا دِل بیگانہ نہ تھا، رفتار کی سستی ان کو گوارا نہ تھی، حق کے مقابلے میں باطل سے ان کا سمجھوتا ممکن نہ تھا!

؎۵ ۔ دیکھو ضمیمہ ؎۶ جریدہ مصورہ مطبوعہ ثبات استانبول

اعتدال اُن کے نزدیک بزدلی کا دوسرا نام تھا، لہجے کی نرمی اور عمل کی سستی کو وہ ارادوں کی کمزوری سمجھتے تھے، اس لیے محض ازہر کے مصلّے پر بیٹھے رہنا اور سبق پڑھانا کوئی دل چسپ کام نہ تھا۔ وہ اس مصلّے سے چند روز بعد ہی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور اُنھوں نے ملک میں ہر قسم کی جماعتیں اور انجمنیں قایم کرنی شروع کیں، جن میں سے اکثر کے مقاصد کھلے طور پر سیاسی تھے۔ ان کی قایم کی ہوئی سب سے بڑی انجمن وہ تھی جو "انجمن حیات الوطنی"، یا "محفل وطنی" کے نام سے مشہور ہے۔ اس انجمن کے مقاصد و اغراض و اعمال کی کچھ تفصیل اس موقع پر بے محل نہ ہوگی۔ شیخ کے ایک رفیق شیخ محمد محلاتی اپنی کتاب موسومہ "گفتار خوش یارقلی" (مطبوعہ مطبع علویہ نجف اشرف ۱۳۴۰ھ ہجری) میں انجمن کے کچھ حالات اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

"بہ تاسیس یک انجمنے موسوم بہ "محفلِ وطنی" عزیمت فرمود۔ نونہالانِ تازہ مصری کہ از یمنِ فیوضاتِ خورشیدِ آں بزرگوار بجائے خارِ مغیلانِ جہل وکسالت در کانونِ قلبِ شاں شاخۂ طوبائے عشقِ کلمۂ مبارکہ توحید رویانِ و در تمام عروق و شریان شاں شاخ و برگ و ریشہ دوانده حیات و ممات ملّتِ اسلام را بالحن در امتثال فرماں سید دیده دعوتِ حقہ اش را اجابت گفتند۔ مفتاح سعادت شش کروڑ نفوس اسلامی در جامعہ محفلِ وطنیٔ قاہرہ مصر بہ دستور و ریاست سید افتتاح گردید ــــــ عدد اعضا بقولے ۳۰۰ و بقولے کمتر بوده ــــــ"

مرزا لطف اللہ شیخ محمد محلاتی کے حوالے سے انجمن کے اغراض و مقاصد حسب ذیل بیان کرتے ہیں۔

"این بود اول قدمے کہ در میدان جاں بازی بعالمِ اسلام گزاشتند۔ تجملاتِ صوری و آئینیت ہائے ظاہری را از لوازم خور و خواب پوشاک وسواری وپذیرائی در بازار حراج ریختہ وجہ آں را در صندوقِ انجمن برائے دستگیری درماندگان وقضائے حوائج نوعیہ ملک و ملّتِ اسلام ذخیرہ کردند۔ ثانیاً ہریک از اعضا ملتزم شد کہ خویشتن را در مقابلِ قرآن مجید مسئول بہ داند وتلاوتِ قرآن را اقل در ۲۴ ساعت یک حزب از روئے فکر و امعان مواظبت نمودہ موادِ ذیل را عمل نماید۔

۱۔ ادائے فرائض و نوافل۔ ۲۔ امر بہ معروف و نہی از منکر۔ ۳۔ دعوت بہ اسلام۔ ۴۔ بحث با دعاۃ نصاریٰ بالّتی ہیَ احسن۔ ۵۔ احسان بہ فقرا وغیرہ وغیرہ۔

نیز بقول لطف اللہ اس انجمن کے اراکین کا فرض یہ بھی تھا کہ اپنا روزنامچہ پابندی کے ساتھ لکھیں اور ہر شب اپنے نفس سے محاسبہ کریں کہ انھوں نے دن بھر میں کتنے کام اچھے یا بُرے کئے۔ ایک مہینے میں اس انجمن نے دس ہزار تومان سرمایہ جمع کر لیا۔ اس کے اراکین کی ایک ماہ کی کارگزاری اس طرح بیان کی گئی ہے۔

۵۰۰ امریضوں کی خدمت کی گئی۔

۵۰۰ محتاجوں کی حاجت پوری کی گئی۔

۲۵۰۰۰ شرابیوں، زانیوں اور عصمت فروشوں سے توبہ کرائی گئی۔

۸۰ ایسے اشخاص جو انگریزی دفاتر یا کارخانوں میں ملازم تھے، اُن دفاتر اور کارخانوں سے کنارہ کش ہو گئے۔

۵۰۰ امرا اور روسا نے اپنا سامانِ تعیش فروخت کرکے سب

روپیہ کارِ خیر کے لیے دے دیا۔
۵، غریبوں کو تجارت کرنے کے لیے سرمایہ دیا گیا۔
۲۰۶ بازاری فقیروں کو جو واقعی مستحق تھے، خیرات دی گئی۔
۱۲۰ نصاریٰ و یہود مشرف بہ اسلام کیے گئے۔
۲۴ جلسوں میں نصاریٰ سے مذہبی مناظرہ و مباحثہ کیا گیا۔
شیخ اکثر انجمن کے جلسوں میں تقریریں کرتے تھے۔ اُن کا ایک خطبہ جس کو اصمعی نے "آثار جمال الدین" کے عنوان سے مصر میں شایع کیا تھا، عقل اور مذہب و مادہ کے متعلق ایک دل چسپ محاکمہ ہے۔ اس موقع پر اُس محاکمہ کے بعض اقتباسات کو درج کرنا بے محل نہ ہوگا۔ مثلاً فرماتے ہیں کہ

" آخرت نیک کردار مسلمانوں کے لیے دار النعیم ہے.........
دار النعیم کیا ہے۔ اس کو جنّت سمجھیے۔ اور کافروں اور سرکشوں کے لیے "دار الشقا" ہے۔ دار الشفا کیا؟ اُسے دوزخ کہ لیجیے۔.....
عقلِ انسانی مطلق الادراک ہے جس کی نہ حد ہے نہ پایاں۔ عام حیوانات سے بھی عقل ممتاز کرتی ہے جو اگرچہ تکلیف اور مصیبت کا سبب بھی ہوتی ہے.........
عالم قدیم ہے۔ اس کے لیے حدوث نہیں۔ محدّثات کی حرکت سے انواعِ عالم وجود میں آتی ہیں۔ حرکت کے انفکاک کا تصوّر ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں جا سکتا۔ زندگی نباتات و حیوانات کے تفاعلِ کیمیاوی کا ایک مظہر ہے۔ اس کے چار اسباب ہیں۔ ناموس یعنی تباینِ افراد اور حفظِ نوع اور تنازع للبقا اور انتخاب طبعی۔ انسان کی حیثیتِ مادہ

حیوانی سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور انتخاب طبعی کے ذریعہ سے انسان نے ترقی کے وہ مدارج طے کیے ہیں جن پر اس وقت اس کے قدم ہیں اور چوں کہ ترکیب انسانی بندر کی ترکیب سے مشابہ ہے اس لیے یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں کی اصل ایک ہے ...."

اس کے بعد مذہب اور مادہ کے قضیہ پر بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ پیش فرماتے ہیں کہ :-

"قرآنِ کریم اوامر و نواہی کی تعلیم کرتا ہے۔ یہی ایسے اوامر و نواہی ہیں جن کا آدمی کی معاشی زندگی سے تعلق ہے یا معاد سے تعلق ہے.......... چند مخصوص چیزوں کے سوا جو حرام کر دی گئی ہیں، ہر چیز سے تمتع کو مباح کیا گیا ہے۔ مثلاً قرآن نے نصِ صریح سے یہ نہیں معیّن کر دیا ہے کہ زمین کرہ ہے یا وہ حرکت کرتی ہے۔ اس لیے یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا انبیا کے دائرۂ عمل سے تعلق ہو۔ البتہ ہمیں یہ حکم ضرور دیا گیا ہے کہ ہم زمین و آسمان کی تخلیق پر غور کریں، زمین و آسمان پر جو کچھ ہے اس کے متعلق سوچیں۔ اس بنا پر ہم کہتے ہیں کہ ...... جب کسی چیز کا انکشاف ہوتا ہے تو علما نصوصِ کتاب کی تاویل کرنے لگتے ہیں حالانکہ نصوص کو اتنا صاف اور صریح ہونا چاہیے کہ ان کے لیے تاویل کی ضرورت ہی پیش نہ آئے ...."

مرزا لطف اللہ ایک جلسے میں شیخ کی تقریر کے حسب ذیل الفاظ نقل کرتے ہیں :-

"وپس ازاں کہ ازیں رہنمائی الٰہی اخلاف ما دور شدند و قرآن و علم و عمل آں ہا کلیتاً بر نصِ موادِ مقدسۂ قرآن قرار گرفت باہمہ حالِ نزول

رسیدند - قال اللہ تعالیٰ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ "۔ پس در موضوعِ انحطاطِ مسلمین شکوہ از اروپائیان خطا است وخرابیٔ حالِ مسلماناں از اخلاطِ فاسدۂ درونیٔ خود مسلمین است وحبل المتینِ استخلاصِ مسلماناں ازیں ہفتم طبقۂ پستی وخواری تمسک عملی بعروۃ الوثقائے قرآنِ مبین است"۔

ایک دن شیخ کا خطبہ اس قدر پُرجوش تھا کہ بقول لطف اللہ خاں

"یک ثلث اعضائے انجمن غش نمودہ وبقیہ راہم حالے نماندہ"

حتّٰی کہ شیخ کو خود ہی غش آجاتا ہے اور

"حسن عطا یک داماد خدیو مصر بوسیلہ عطریات سید واعضا را بحال می آورد"

اس قسم کا مبالغہ آمیز اندازِ بیان لطف اللہ خاں کا مخصوص شیوہ ہے اور ان کی تحریریں اس رنگ آمیزی سے بھری پڑی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے بیان کردہ واقعات کی صحت بھی اکثر مشتبہ ہوجاتی ہے اور ان کے بیان میں تاریخی سنجیدگی باقی نہیں رہتی۔

شیخ محمد محلاتی کے حوالہ سے مرزا لطف اللہ بیان کرتے ہیں کہ انجمن کی کامیابی اور نفوذ نے برطانوی مدبرین کو بہت متوحش کر دیا چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ لارڈ کرومر نے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا کہ اگر یہ انجمن مصر میں ایک سال اور قایم رہی اور جمال الدین مصر میں مقیم رہے تو برطانوی اثرات تباہ ہوجائیں گے۔

"انجمن حزب الوطنی مصر بدتر وسخت عائقی است کہ از برائے پیش رفت تصور شود وباید باکمالِ سرعت وعجلہ از برائے تفرق آن دستور سریع لازم الاجرا برسد"

اس قسم کی چند رپورٹوں اور تحریروں کے اقتباسات مرزا لطف اللہ خاں نے نقل کیے ہیں لیکن ان اقتباسات کی کوئی سند موجود نہیں اس لیے ان کا نقل کرنا عبث ہو۔ لطف اللہ خاں کی رنگین کلامی حقایق کو بے حد اُلجھا دیتی ہو مثلاً لکھتے ہیں کہ :-

"از توارد ایں رپورٹ ہائے مدہش وموحش پے درپے کہ فی الحقیقت را پورتِ اعدام اروپ بود ملت انگلشی باکمال جدیت در اعدام وتفرقہ انجمن مذکور ذرئیس آں ہمت گماشتند چرا ؟ - برائے ایں کہ دانستند کہ کہ اگر تساہل در زند و مماطلہ کنند محال است سیانت و دانش بسمارک و غلا دستون تدبر سراید وردگر یے کنکاش پارلیمان لندن وبرلن عزش توپ ہادن وتفنگ ۔ نارنجک ہوائی ۔ سرنگ دریائی ۔ قوۃ نظام المانیٰ فرم اطریش جمعیتِ روس از جلوگیری وسد بیش رفت ایں مقاصد عالیہ برایند ۔ چہ ایں نقشۂ فرخندہ از کارگاہ قوت مافوق الطبعۃ است منزل گاہِ مہندس ایں نقشہ را مکان در لامکان است ......"

صفحے کے صفحے اس رنگ آمیزی سے بھرے ہوئے ہیں۔

بہر حال یہ امر یقینی ہو کہ " انجمن وطنی کا وجود بہت جلد اغیار کی نظروں میں کھٹکنے لگا اور تبلیغ اسلام کی تحریک نے نصرانی مشن سے ٹکر کھائی ۔جب نصاریٰ اور یہودی مسلمان کیے جانے لگے تو اِن اقوام کے اندر ہل چل مچ گئی اور عیسائی مشنریوں کے شور وغل نے برطانوی مدبرین کو اس پر آمادہ کر دیا کہ انجمن کا راستہ روکا جائے ۔ صاحب تاریخ "بیداریٔ ایران " نے بھی ان حالات کی طرف اشارہ کیا ہو۔

"بہ ترتیب نشرہائے فرانسہ انجمنے تشکیل داد ۔ اصحاب فکر دوستانِ

خود را از علما و اعیان وغیرہم درآں انجمن دعوت نمود و تقریباً سی صد نفر در آں جا عضویت یافتند و بہ واسطہ تغذیہایے کہ از انگلش ہا نسبت ابنائے وطن اش شدہ بود عدو اے مفرد بہ آں ہا داشت۔ رفتہ رفتہ کارِ انجمن بالا گرفت و کونسل انگلش را بہ وحشت انداخت "

انجمنوں کی تشکیل کے علاوہ مصر میں شیخ نے سب سے بڑا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ انھوں نے ملک کے تمام طبقوں میں اور خصوصاً عوام کے اندر اخبار نویسی اور اخبار بینی کا ذوق پیدا کر دیا۔ انھوں نے لوگوں کو مطالبۂ حقوق کا یہ سب سے بڑا اور موثر راستہ بتا دیا۔ مصر کے متعلق شیخ کا یہ ایک بڑا کارنامہ ہے جس کو اُن کے اکثر مشرقی سوانح نگاروں نے نظر انداز کر دیا ہے۔ اس زمانے تک مصر میں اخبار نویسی کی یہ حالت تھی کہ صرف اسکندریہ سے ایک دو چھوٹے چھوٹے اخبار اور وہ بھی محض یورپین آبادی کو خبریں پہنچانے کے لیے نکلا کرتے تھے جن کو ملکی و قومی سیاسیات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مصر کے بازاروں میں کوئی اخبار نہ بکتا تھا۔ سرکاری عہدہ داروں کو ضروری خبریں گورنمنٹ کی طرف سے چھاپ کر دی جاتی تھیں۔ کسی آزاد اخبار کے نکالنے کی اجازت نہ گورنمنٹ دیتی تھی نہ کوئی مانگتا تھا۔ شیخ نے اس کمی کو محسوس کیا اور بہت جلد اپنے شرکائے کار کی مدد سے نہ صرف مصر کا مشہور اخبار "مصر" جاری کرایا بلکہ دو پرچے اور بھی شایستہ عربی زبان میں نکلوائے ایک کا نام "محروسہ" اور دوسرے کا نام "مراۃ الشرق" تھا۔ اِن اخبارات میں خاص خاص سیاسی مضامین یا تو شیخ خود لکھتے تھے یا محمد عبدہ اور ابراہیم الاغانی لکھا کرتے تھے۔ اِن مضامین میں ملک

کے حالات پر بہت جرأت کے ساتھ تبصرہ کیا جاتا تھا اور خدیو اور اُس کے وزرا تک نکتہ چینی سے محفوظ نہ رہتے تھے۔ ابتدا میں خدیو نے ان اعتراضات کی کچھ زیادہ پروا کی نہیں اور ان جراید کی رائے کو حقارت کی نظر سے دیکھا۔ علاوہ بریں وہ خوش بھی ہوتا تھا کہ یہ جراید یورپین دول پر حملے کرتے رہتے تھے اور خدیو یورپین دول کو مصری قومیت کے جذبات کے مظاہروں سے بہکانا اور دھمکانا بھی چاہتا تھا۔ علاوہ بریں وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ دوسرے اسلامی ممالک میں قومی تحریکیں قوی ہوتی جاتی ہیں۔ اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے ملک میں قوم پرستوں سے بگاڑ کرے اس لیے شیخ کے جاری کیے ہوئے اخبار کی اشاعت میں اس کی حکومت کچھ عرصہ تک بالکل حارج نہیں ہوئی۔ صرف ایک اخبار "ابونظارہ" حکماً بند کیا گیا۔ اس اخبار نے اپنی تھوڑی سی عمر میں مصری قوم پرستوں کی بہت کچھ خدمت انجام دی تھی: "ابونظارہ" کا محرر ایک مصری یہودی جیمس سنا تھا[1] جو پہلے کسی مصری اسکول میں استاد تھا اور ۱۸۷۰ء میں شیخ کی صحبت میں داخل ہوگیا۔ اس سے پہلے وہ شیخ کا بہت مخالف تھا مگر بعد کو وہ شیخ کے ساتھ بہت عقیدت رکھنے لگا۔ وہ اکثر شیخ کی خاص صحبتوں میں بانسری بجاکر گایا کرتا تھا۔ چونکہ سنا بہت افلاس کی حالت میں تھا اس لیے شیخ نے اس کو کچھ سرمایہ دے کر "ابونظارہ" جاری کرا دیا۔ اس اخبار کے مقاصد سیاسی تھے۔ اور وہ تفنن اور مزاح کے پیرائے میں حکومت پر سخت نکتہ چینی کیا کرتا تھا۔ خدیو، اس کے وزرا اور مقربین کا ابونظارہ کے کالموں میں

---

[1] دیکھو ضمیمہ

بہت مضحکہ اُڑایا جاتا تھا۔ اس مضحکہ کا ڈنک اس قدر تیز تھا کہ آخر اسمٰعیل اُس کی نوک کو برداشت نہ کرسکا اور ابونظارہ بند اور سنا خارج البلد کر دیا گیا۔کچھ عرصہ بعد جب شیخ پیرس میں جاکر مقیم ہوئے تو یہ اخبار بھی جاری ہوگیا۔ شیخ اس زمانے میں کبھی کبھی اس کے صفحات پر مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ مشرق اور اہلِ مشرق کے عنوان سے شیخ کا ایک مقالہ اسی "ابونظارہ" میں شایع ہوا تھا جو بعد کو شیخ کے مصری سوانح نگاروں نے اپنے رسالوں میں تمام و کمال نقل کیا۔ ان اوراق میں ہم اس مضمون کے بڑے حصّے کا ترجمہ اس لیے نقل کرتے ہیں کہ اس سے مسائل مشرق و مغرب پر شیخ کی وسعتِ نظر کا پتہ چلتا ہی۔ انحطاط مشرق کے اسباب یوں صاف صاف بیان فرماتے ہیں:۔

اس مقدمہ کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ اتنی زبردست سلطنت ایسی عظمت و شوکت، صنائع بدائع کی کثرت، مال و متاع کی افراط، تجارت کی گرم بازاری، علوم و فنون اور معارف و آداب کی ایسی حیرت انگیز اشاعت کے باوجود مشرق کے اپنے مرتبۂ عالی اور مقامِ رفیع سے پستی کے غار میں جا پڑنے اس کے باشندوں پر فقر و فاقہ مسلط ہونے ذلت و مسکنت کے غالب ہونے اور اجنبی قوموں کے قابو پا جانے کی صرف یہ وجہ ہی کہ اہلِ مشرق نے اپنی عقلوں کے نور سے اعراض کیا، اس سے استفادہ کرنا چھوڑ دیا اور اپنے اخلاق خراب کرڈالے۔ اسی لیے ان کا یہ حال ہی کہ جانور اور چوپایوں کی طرح بسر کرتے ہیں، کسی

بات پر غور و فکر نہیں کرتے ، اپنے افعال میں شر و فساد سے احتراز نہیں کرتے ، جلب منفعت کے لیے سعی اور ضرر سے اجتناب نہیں کرتے ۔ ان کی عقلوں پر نیند طاری ہی اُن کے افکار و خیالات اپنے حالات کی اصلاح سے عاری ہیں ، ان کی آنکھیں ان پستیوں کے معلوم کرنے سے معذور ہیں جو انھیں گھیرے ہوئے ہیں ، وہ اپنے قدموں سے ہلاکتوں میں گھُستے اور پستیوں کے غاروں میں گرتے ہیں ۔ اپنے نفوس کی اُن تاریک خواہشوں میں مبتلا ہوتے ہیں جو اُن کے گمراہ کُن اوہام سے رونما ہوتی ہیں ۔ وہ اُن اوہام و ظنون کی پیروی کرتے ہیں جن کی جانب ان کی طبائع کا فساد رہنمائی کرتا ہی ۔ جب تک مصیبتیں اُن کے جسموں کو مس نہیں کرتیں اُس وقت تک وہ اُن کا احساس نہیں کرتے اور جب اُن کے آلام دور ہو جاتے ہیں تو جانوروں کی طرح انھیں بھلا دیتے ہیں ۔ انھیں اپنی عقلوں کے کہنہ ہونے کا احساس نہیں ہوتا نہ آنکھوں پر جہالت کے پردے پڑ جانے کی تمیز ہوتی ہی ۔ غفلت کے غلبے کی بدولت وہ صرف اس زندگی کو زندگی سمجھتے ہیں اور بھیڑ بکری کی طرح کھانے پینے اور جیتے رہنے کو غایتِ حیات تصور کرتے ہیں ۔ طلبِ نام ، بقائے ذکر اور تحصیلِ شہرت اور افتخار کی جو لذتیں انسان کے لیے مخصوص ہیں ان سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا ۔ وہ عواقب کو نہیں جانتے مآلِ آخر کا ادراک نہیں کرتے جس

چیز کو کھو چکے ہیں اس کا تدارک نہیں چاہتے۔ جو آفات و حوادث آگے پیچھے سے اُن کی تاک میں ہیں اُن سے بچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ نہ اُن سختیوں اور دشواریوں کو سمجھتے ہیں جو زمانہ اُن کے لیے مہیا کیے ہوئے ہے۔ اسی لیے ذلت و رسوائی میں پڑے ہیں اور اس کا خیال تک نہیں کرتے کہ ہم ذلیل ہیں۔ وہ غلامی اور عبودیت کو خوشی سے گوارا کیے ہوئے ہیں اور سابقہ عظمت و رفعت کو فراموش کر چکے ہیں۔ عقل کی اس بلند چوٹی سے گرنے کے بعد جس کے بغیر انسان کو کوئی عزت اور رتبہ حاصل نہیں ہوتا۔ ان پر کمینگی اور بے وقری چھا گئی ہے۔ دلوں پر قساوت و ظلم کا تسلط ہو گیا ہے۔ ان کے نفوس میں جور و جفا نے گھر کر لیا ہے۔ ان میں عیب و خود بینی راسخ ہو گئی ہے جس کو مرتبہ اور فضیلت سے کوئی واسطہ نہیں۔ جو ذلت ان کے قلوب میں جڑ پکڑ چکی ہے اس کے باوجود وہ کبر و عظمت کا اظہار کرتے ہیں باہم نفاق و افتراق کو رواج دیتے ہیں۔ انھوں نے غدر اور خیانت کو اپنا اوڑھنا بچھونا اور حسد و نمّامی کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔ حرص و طمع ان کا لباس اور خباثت و بے حیائی ان کی شانِ امتیاز ہے۔ وہ بزدل اور ڈرپوک ہونے میں مشہور اور ادنی درجے کی خواہشوں کے پورا کرنے میں منہمک ہیں۔ بدنی لذتوں کی تکمیل میں پڑے رہتے ہیں اور اپنے آپ کو بہیمی اخلاق کا خوگر بنائے ہوئے ہیں۔ سستی و بدنظمی پہ

تیجہ کیے ہوتے ہیں۔ وہ موذی حیوانات کی صفات سے متصف ہیں۔ اُن کا قوی اپنے ضعیف کو پھاڑ کھاتا ہے۔ اور با عزّت بے عزّت کو غلام بنا لیتا ہے۔ وہ اپنے وطنوں سے خیانت کرتے اور پڑوسیوں پر ظلم کرتے ہیں۔ کمزوروں کا مال غصب کر لیتے اور عہد و پیمان کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ اپنے ملکوں کو تباہ کرنے کی آپ کوشش کرکے اور اغیار کا ہاتھ مضبوط کرتے ہیں۔ انھیں ننگ و ذلت کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ ان میں کے عالم کہلانے والے حقیقت میں جاہل ان کے امیر ظالم اور عدالت کے حاکم یا قاضی خائن ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی رہنما نہیں جو انھیں راہِ نجات دکھلائے نہ کوئی تنبیہہ کرنے اور چوکانے والا ہے کہ وہ گمراہی میں پڑنے سے باز رہیں۔ غرض وہ سب کے سب اپنے اخلاق کے فساد اور عقول کی خرابی سے ادبار و ہلاکت کے ہدف بنے ہوئے ہیں۔

اب اہلِ مشرق کے جو حالات پہلے بیان کیے گئے اُن پر غور کیا جائے تو بہ آسانی معلوم ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں نے عقل کے راستہ سے ہٹ کر اپنے آپ کو دائمی ذلت میں مبتلا کر رکھا ہے اور اپنے عدم تدبر اور عواقب و انجام پر نظر نہ کرنے کی وجہ سے خود اپنے ملکوں پر تباہی کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ ان کی قومی سلطنتیں بھی ان کی سوءِ تدبیر سے ضعیف ہو چکی ہیں اور ان کی جہالت و بد اعمالی کے نتیجہ میں خود اُن کی سازش سے انھیں کے ملکوں پر دشمن مسلط ہوگئے ہیں۔

جس زمانہ میں شاہ سلطان حسین کے عہد میں افغانی اصفہان پر چڑھ آئے تو عثمانیوں نے شاہ حسین کے خلاف ایرانی شہروں کی تقسیم پر روسی سلطنت سے اتفاق کر لیا۔ حالانکہ اگر عثمانی نگاہِ تدبر سے دیکھتے کہ روسی قوم کی کیا اصلیت ہے اور سلطنتِ عثمانیہ کی یونانی۔ رومانی۔ سروی اور بلغاری رعایا کے ساتھ ان کی کیسی سازشیں رہتی ہیں اور یہ کہ مستقبل میں اس معاہدہ سے ایک زبردست دشمن کی قوت و استحکام میں کس درجہ خطرناک اضافہ ہو سکتا ہے تو وہ کبھی روسیوں سے عہد و پیمان کا خیال دل میں نہ لاتے بلکہ ان کے مضبوط ہونے سے پہلے ان کی بنیادیں کھوکھلی کرنے کی فکر کرتے اور اس درخت کو جڑ پکڑنے سے پہلے اکھاڑ پھینکتے۔

جس وقت عباس مرزا اپنے عساکر سے روسیوں کا مقابلہ کرنے اور انھیں اپنے ملکوں سے دفع کرنے میں مصروف تھا اس زمانہ میں عثمانی ترکوں نے ایرانیوں سے جنگی چھیڑ شروع کر رکھی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکوں کی اس مداخلت کی وجہ سے ایرانیوں کی قوت کمزور ہوگئی۔ ان کے استحکام میں کمی آگئی اور روس آذربائیجان کے اکثر شہروں پر قابض ہو بیٹھا لیکن اگر عثمانی اپنی عقلوں سے مشورہ لیتے تو انھیں صاف نظر آتا کہ ایرانیوں کا ضعف اور روسیوں کی تقویت یہ دونوں ترکی سلطنت کے ارکان میں تزلزل کا باعث ہیں۔ مگر انھوں نے اپنے اوہام و خطرات کا اتباع کیا اور یہ سمجھے کہ ہم جو کچھ

کر رہے ہیں یہی اچھا ہے اس لیے انھوں نے نادانستہ اپنے آپ کو تباہ کرنے میں عجلت کی ۔ حالانکہ اُن کے سامنے عقل کی پرنور مشعل اور سیاستِ حقہ کا دستور العمل موجود تھا اور وہ اپنے اور ایرانی سلطنت کے درمیان ایک قوی دینی رابطہ کو دیکھ کر بجائے اختلاف و نفاق کے اس سے اتحاد کرکے اور روس کی قوت کو ضعیف کرکے اس کے خطرات اور طماعیوں سے محفوظ رہ سکتے تھے ۔

جس زمانہ میں ٹیپو سلطان والئ میسور کا سفیر عثمانیوں کے دربار میں آیا اور ٹیپو سلطان کی طرف سے بعض ہندوستانی شہروں کے بدلے بصرہ کے تبادلہ کی گفت وشنود کی تو عثمانیوں نے اُس پر کوئی توجہ نہ کی اور سفیر کو ناکام واپس کیا حالانکہ ٹیپو سلطان کا مدّعا اس معاملت سے صرف یہ تھا کہ ہندوستان میں عثمانیوں کا نفوذ بڑھاکر انگریزوں کا زور توڑا جائے اور عثمانی ترکوں کی طاقت بڑھائی جائے۔

عثمانیوں نے ان مستحکم تعلقات سے جو اُن کے اور ہندوستانیوں کے درمیان تھے یکسر بے اعتنائی برتی ورنہ اگر ان ممالک میں ان کا دائرۂ حکومت بڑھ جاتا تو یہاں کے تمام حکام بلا پس و پیش ان کے جھنڈے کے نیچے آجاتے۔ انھوں نے راہِ عقل سے انحراف کرنے اور سیاست کی طرف سے غفلت و تساہل برتنے کی وجہ سے اس حقیقت کو نہ سمجھا کہ ایشیا میں یورپین دول کے اقتدار کا بڑھنا خود ان کے ملکوں میں ان کے

تحکم کے ضعف کا باعث ہے اور اس طرح وہ ان ہی کے ملکوں پر دستِ طمع دراز کریں گے جیساکہ اب مشاہدہ ہو رہا ہے۔

جن دنوں افغانیوں نے ہندوستان کو انگریزوں کے قبضے سے نکالنے کے لیے ہندوستان پر حملہ کا ارادہ کیا تو فتح علی شاہ بادشاہ ایران نے انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے افغانیوں کو دھمکی دی لیکن اگر ایرانی اس وقت عقل کی روشنی میں دیکھتے تو یہ بات اچھی طرح منکشف ہو جاتی کہ ہندوستان میں انگریزوں کی قوت بڑھانا خود ان کے ملک کے لیے خطرۂ عظیم اور اُن ہی کی تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ وہ غور کرتے تو خوب جان لیتے کہ وہ اور افغانی دونوں شجرِ ایران کی دو شاخیں ہیں اور ایک ہی جڑ سے نکلی ہیں ایک ہی زمین میں پروان چڑھی ہیں ایک ہی جنسیت اور دونوں کی جامع اور حقیقی اخوت دونوں کو مجتمع کیے ہوتے ہے۔ وہ عزت و شرف میں برابر کے حصہ دار اور ذلت اور بے آبروی میں یکساں شریک ہیں۔ ان میں صرف واہی اوہام نے تفریق پیدا کردی ہے جو مذہبی بدگمانیوں سے رونما ہوتے ہیں ورنہ ان اوہام کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اگر ان میں سے ایک عقل کی طرف رجوع ہو تو سابقہ عظمت کے اعادہ اور تدارک مافات کے غرض سے اتحاد کو لازم و واجب سمجھے۔

امیر دوست محمد خاں امیر افغانستان کا بھی یہی حال رہا کہ انھوں نے آنکھیں بند کرکے اپنے ملکوں کو انگریزی حملوں کا آماجگاہ بنا دیا۔ انھوں نے انگریزوں سے مقابلہ کرنے کی غرض سے

رنجیت سنگھ سے معاہدہ کیا اور پھر انگریزی عہد و پیمان کے فریب میں مبتلا ہوکر رنجیت سنگھ کو میدانِ جنگ میں تنہا چھوڑ دیا۔ بلکہ الٹا اسے اپنی فوجوں سے دبایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رنجیت سنگھ کی فوجیں منہزم ہوئیں اور انگریز پنجاب کی تمام اراضی پر جو افغانستان سے ملی ہوئی ہیں چھا گئے۔ لیکن اگر دوست محمد خاں اس وقت اپنی عقل سے طالب ہدایت ہوتے اور اپنے افعال کے نتائج پر پہلے سے نظر کرتے تو معلوم ہو جاتا کہ انگریزی حملوں سے ان کے ملک کا محفوظ رہنا پنجابی حکومت کے باقی رہنے پر موقوف تھا۔ یہ حکومت باقی رہتی تو افغانستان اور انگریزی حکومت کے مابین ایک زبردست دیوار کھڑی رہتی۔ اس بات کو سمجھ کر افغانی پنجابی حکومت کی طرف سے بھی اسی طرح مدافعت کرتے جس طرح اپنی حکومت کی طرف سے کرتے۔

ادھر نواب بنگالہ اور نواب کرناٹک نے ہندوستان میں غیروں کی مداخلت کے لیے راستہ صاف کر دیا۔ نواب لکھنؤ نے تیموری سلطنت کو کمزور کرکے ان کے مقاصد کو تقویت پہنچائی نواب دکن نے ٹیپو سلطان کی حکومت درہم برہم کرنے کے لیے انگریزوں کو مدد دی اور راجہ برودا کو بھی دبایا۔

.... نتیجہ میں غلامی کا جوا خود اِن ہی کے کندھوں پر آپڑا۔ یہ سمجھ لیجیے کہ ایک کی بقا دوسرے کی بقا سے وابستہ ہے اور ہر ایک دوسرے کے لیے اعضائے بدن کی طرح ہے۔ جب ایک عضو میں بیماری سرایت کر جاتی ہے تو تمام اعضا میں پھیل

جاتی ہے اور سارا بدن فاسد ہو جاتا ہے۔

اور سنیے اہلِ بخارا قو قند پر روسیوں کے غلبہ سے خوش ہوئے اور ترکمانوں نے بخارا پر روسی قبضہ دیکھ کر بغلیں بجائیں۔ افغانوں اور ایرانیوں نے ترکمانوں پر ان کے تسلط سے مسرت و طمانیت کا اظہار کیا۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ اِن اطراف میں روسی قوت و غلبہ سے پیدا ہونے والے نقصانات سے غفلت برتی گئی۔ ان لوگوں کو ان کی جہالت نے اپنی خود غرضانہ مصالح میں مشغول رکھا۔ عقل سے محرومی نے ہلاکت میں ڈال دیا اور یہ سب دھوکے میں پڑ کر انتشار و زوال کی آخری حد کو پہنچ گئے۔

مدحت پاشا اور اُن کے مددگار و رفقائے کار اگر اپنی سلطنت کے آمادہ انہدام ارکان کی طرف دیکھتے اور عقلوں کی ہدایت اور اپنے تدبر کی قوت سے جان سکتے کہ بلائیں انھیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور حکومت کے ستون گرنے ہی کو ہیں تو ایسے وقت میں جب کہ اعدا تاک لگائے بیٹھے تھے سلطان عبدالعزیز معزول کو قتل کرنے کی گمراہی میں نہ پڑتے۔ مگر انھوں نے اپنے واہی اور لغو رائوں پر اعتماد کیا اور دوسرے کی فریب کاریوں میں پھنس کر اپنی قوم کے لیے ہلاکت و ادبار کو دعوت دی اور یہ سمجھے کہ ہم اصلاح کر رہے ہیں!۔

اسماعیل پاشا نے اپنے آزاد و خود مختار ہونے کی محبت میں اپنی ان بداعمالیوں کے نتائج سے آنکھیں بند کر کے جو بادشاہی کے نام کی حرص سے پیدا ہوتی تھیں دوسروں کو

مصر کی تمام دولت لٹا دی اور یورپ کے صرافوں سے سود کی گراں قدر رقموں پر جو قرضہ لیا تھا وہ بھی انھیں کی نذر کیا پھر اس سے فائدہ کیا اٹھایا۔ یہی کہ خود ملک سے معزول ہوئے۔

توفیق پاشا کے وزیروں نے اپنی جہالت، خود رائی اور اوہام باطلہ کی وجہ سے انتہائی کوشش کے ساتھ دول کو مصری ممالک میں کھینچ بلایا اور اُن ہی کو اس ملک کا مالک بنا دیا۔ اور بجائے خود یہ سمجھا کئے کہ ہم اس طرح خدیو کے دشمنوں کے خلاف مدد حاصل کر رہے ہیں۔ اگر وہ یورپین سیاست پر غور کرتے تو اپنی اپنے خدیو اور پاشا کی جانوں کے لیے اس مصیبت کو نہ دعوت دیتے اور کتے کے بھوکنے کے ڈر سے شیر کے منہ میں نہ جا پڑتے ....

اہلِ مشرق کے معاملات پر اب تک جو کچھ نقد و تبصرہ کیا گیا اس سے واضح ہے کہ اِن لوگوں نے سیاست میں ہدایت و ہوشمندی کا طریقہ اختیار نہیں کیا اور اپنی عقلوں سے ذرا بھی کام نہ لیا نہ اپنے افعال کے عواقب اور اعمال کے نتائج پر غور کیا۔ انھوں نے اپنے حال و مآل کو نورِ بصیرت سے دیکھا ہی نہیں بلکہ اپنے سطحی منافع کے آگے انجام اور اصل مصالح سے بے نیاز رہے اور گمراہی کے جنگل میں بھٹکا کیے۔ انھوں نے اپنے ہی ہاتھوں اپنے ملک تباہ کیے اور سوءِ تدبیر سے اپنے شہروں کو برباد کیا۔ اپنی فاسد کوششوں سے اپنی گردنیں اغیار کے پھندوں میں پھنسا دیں۔ ان کی اولاد کا فرض تھا کہ

وہ اپنے اسلاف کی بھڑکائی ہوئی جس آگ اور ان کی نازل کی ہوئی جن مصیبتوں میں مبتلا ہیں ان سے عبرت حاصل کرتے سوچتے اور ان بلاؤں سے بچتے۔ متحد ہونے کی سعی کرتے افتراق اور تشتت سے پرہیز کرتے اوہام و خطرات سے سرگرداں نہ ہوتے۔ مگر افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ وہ بھی ان ہی نقوشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ ان ہی غلطیوں کا اتباع کر رہے ہیں۔ عقل و ہدایت سے منحرف ہیں۔ حق اور آثارِ حق سے منکر ہیں۔ امانت ان میں سے اُٹھ چکی ہے۔ خیانت رواج پا چکی ہے۔ محبت کے رشتے کٹ چکے ہیں جنسیت کی گرہ کھل چکی ہے۔ ہر شخص اپنے آپ کو دیکھتا اور شخصی منفعت کی سعی کرتا اور یہ نہیں جانتا کہ اس کی سعادت تمام افرادِ قوم کی سعادت سے وابستہ ہے۔ وہ بغیر سب کی سعادت کے اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسی خود غرضی کا نتیجہ ہے کہ وہ فقیر بن گئے ہیں۔ اپنی معاش کے لیے سرگرداں ہیں۔ آغاز و انجام کی ہدایت سے بے خبر ہیں۔ قریب ہے وہ وقت کہ ان پر ابدی ذلت اور دائمی موت طاری ہو جائے۔ اور ان کی جنسیت و جمعیت کا شیرازہ کلیتہً بکھر جائے۔

مگر باوجود اس تمام تباہی کے ابھی تلافی کا موقع نہیں گیا۔ اب بھی تدارک کا وقت باقی ہے۔ ان کے لیے امید کے اسباب اور دروازے بند نہیں ہوئے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان میں ناامیدی گھر کر چکی ہے ان پر یاس غالب آ چکی ہے۔ ان کی ہمتیں پست اور عزائم سست ہو چکے ہیں۔ ان کے کان نصیحتوں

کے سننے سے عاری اور آنکھیں حق کے دیکھنے سے اندھی ہوگئی ہیں قلوب میں قساوت پیدا ہوگئی ہے اس لیے وہ گمراہی میں پڑتے چلے جارہے ہیں وہ اپنے سچے رہنماؤں کا خون بہاتے اور گمراہ کرنے والوں کی رایوں کی پیروی کرتے ہیں۔"

اس قدر طویل اقتباس کو اس موقع پر پیش کر دینے کا مقصد بجز اس کے کچھ نہیں کہ اس زمانہ کی اسلامی اور مشرقی سیاست کے متعلق شیخ کا نقطۂ نظر واضح ہوجائے۔ جو کچھ انھوں نے آج سے ۶۰ سال پہلے کہا تھا اس کا بڑا حصہ آج بھی بے محل نہیں ہے۔ اس مضمون میں بعض ایسے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جن کا ان اوراق کی ترتیب میں کچھ دیر بعد ذکر آئے گا۔ لیکن مضمون کے تسلسل کو خراب نہ کرنے کے خیال سے اس موقعہ پر وہ اجزا بھی درج کر دیے گئے۔

واقعہ یہ ہے کہ شیخ نے مصر میں اخبار نویسی کی ایک نئی فضا پیدا کر دی اور معاملاتِ ملکی پر بحث اور تبصرہ کا ایک ایسا راستہ کھول دیا جس سے پہلے کوئی واقف نہ تھا۔ آن کا ایک سوانح نگار شیخ کی ان دلچسپیوں کو اس طرح بیان کرتا ہے:۔

"یکے از مقربین مصر کہ ادیب اسحٰق نام داشت در کتابے کہ دراں وقت بنام "الدرر" نشر کردہ است دربارہ سید جمال الدین افغانی ایں سطور را می نویسد:۔ ایں اوقات در جریدۂ مصر مقالات بسیارے نشر کردہ برائے توسیع افکارِ عمومیہ کوشیدہ است (مظہر بن وضاح، نام مستعارآں جمال الدین است .... آں وقت در مصر احوال نوشتن تعلیق بایک اسلوب درست تقریباً وجود نداشت۔ ارباب قلم بسیار محدود بود و ایں ہم ہا عبارت

از عبداللہ پاشا محمد پاشا سید احمد پاشا فکری پاشا و وہبی پاشا بودند۔ اگرچہ بعضے ازیں ہا مسجع و مستقیم مکتوب می نوشتند و بعضے ازاں ہا کتب دینی و اخلاقی و قسماً کتب اول تالیف می کردند۔ اینک در اثنائے فقدان ادبا باغیرت و ہمت سید جمال الدین در مصر ادبا و محررین دیدہ شد۔ مرحوم شیخ عبدہ می گوید کہ۔ "از دہ سال بایں طرف دربین تمام محررین و ارباب مصر از اشخاص قدیمہ اں شخصے را نمی بینم۔ اصحاب اہل قلم مصر را کہ جوان و فقط در صنعت ایشاں پیرو استاد داند ہمہ از تلامذۂ سید جمال الدین افغانی شمار می شود و یا از تلامذہ او فیض گرفتہ اند" کونفرنسہائے کہ سید جمال الدین افغانی راجع بہ نظم و نثر و مسجع و احوال تحریر دادہ است شاعر سوریہ ادیب اسحٰق در "کتاب الدرر" خود بہ اہتمام مخصوص ضبط کردہ است در بارۂ تاثیر فیض بخشائے کہ سید جمال الدین افغانی در عالم تحریر موجود آوردہ است و ذاتے کہ استطلاع آں را لازم داشتہ باشند کونفرنسہائے مذکور را ملاحظہ بفرمایند"[۵]

شیخ کی تعلیمات کا حلقہ جس قدر وسیع ہوتا گیا اور شیخ کے قلم کی روانی جس قدر زیادہ ہوتی گئی اسی قدر ان کے اثر سے نئے نئے اہل قلم میدان میں آتے گئے۔ سعد زاغلول عبداللہ نعیم بے احسان بے اور کتنے ہی ایسے نام اس زمانے کے اخبارات میں نمایاں نظر آتے ہیں اور یہ سب شیخ ہی کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

جیساکہ گزشتہ صفحات میں بتایا جاچکا ہے شیخ کے عقائد میں سے ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ تنظیم ملت کے لیے ہر ایک ملک میں اخبار نویسی کو آلہ کار بنانا نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ چند ہی روز بعد جب شیخ مصر سے خارج البلد

[۵] جمال الدین افغانی "جریدہ مصورہ مطبوعہ ثبات استانبول ۱۸۹۶ء

ہو کر ہندوستان تشریف لائے اور عرصہ تک حیدرآباد میں مقیم رہے تو اکثر اپنے خیالات حیدرآباد کے رسالہ معلم کے ذریعہ سے شائع کرتے رہے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے فواید جریدہ کے عنوان سے ایک مضمون شائع کرایا۔ اس موقعہ پر اس مضمون کے بعض اقتباسات بے محل نہ ہوں گے۔ فرماتے ہیں کہ :۔

"لیکن اخبار وہ بے مثل صناعت ہے کہ اس کا موضوع عوام کے احوال اخلاقی قومی اور اس کی غایت اصلاح اخلاق امت وجلب سعادت دامن امان اپنی قوم بلکہ تمام قوموں کے لیے ہے۔ (۱) ایسا اس لیے ہے کہ جریدہ (اخبار نامہ) اربابِ فضایل کے فضیلت بیان کرنے میں مسابقت کرتا ہے اول تو ان کی بجا مدح کرنے کے خیال سے جو صاحب فضیلت کا حق ہے وثانیاً اس لیے کہ اس مدح کو پڑھ کر دوسروں کو فضایل حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو (۲) اور رزایل پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ چونکہ ان کے ضرر متعدی ہیں اور اس طرح وہ روکتا ہے دوسروں کو ان حرکات کے ارتکاب سے جو رزایل کرتے ہیں۔ (۳) اخلاقِ جمیلہ کے منافع کا ایسا بیان شافی کرتا ہے کہ عوام اس سے فایدہ اُٹھا سکیں اور خواص بھی بے بہرہ نہ رہیں۔ ہر روز وہ اپنا فرض انجام دیتا ہے اور بری خصلتوں اور ان کی مضرتوں کو عام انسانوں سے دل پزیر عبارتوں میں شرح وبسط کے ساتھ بیان کرتا ہے (۴) عام لوگوں کے لیے علوم کے فواید کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ ہر شخص کو یقین ہو جائے کہ امت کی سعادت

علوم حقہ اور معارف حقیقی کی وجہ سے اور بغیر ان کے نہیں ۔ اور جہل کے نقصان و خسارہ کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ ہر جاہل و غبی اعتراف کرے کہ ہر بلا اور مصیبت و نقصان جو اس کو پہنچا ہے جہل کی وجہ سے پہنچا ہے (۵) علوم کے درجات کو عالم انسانی میں ان کے فوائد کی نسبت سے قرار دیتا ہے اور ہر ایک کے لوازم کی مقدار کو دلیلوں سے ثابت کرتا ہے تاکہ نادان اپنی عمروں کو ضایع نہ کریں اور اس فائدہ سے جو حصولِ علم میں مشغول رہنے سے حاصل کیا جاتا ہے محروم نہ رہیں ۔ (۶) اور منافع کی ضرورت کو جو عالم مدنیت میں علوم کا نتیجہ ہے ثابت کرتا ہے اور دلائل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ بغیر ضاعت میں ترقی کئے رفاہیت حاصل نہیں ہوتی (۷) اور تمام معارف ضروریہ کا مثلاً جغرافیہ ،طبعیات ،فلکیات ، زراعت، حرفت ، طب ، تربیتِ منزلی ۔تنظیم بلاد۔ تربیتِ اولاد اس طرح ذکر کرتا ہے کہ عوام الناس ان سے بہرہ ور ہوں ۔(۸) فضیلت انسانیت کی تشریح کرکے اغنیا اور ارباب دولت کو اس کی طرف دعوت دیتا ہے اور مضامین لکھ کر علوم و معارف و ضایع اور قیام دارالشفا وغیرہ کی ترغیب دیتا ہے (۹) اور ہمجنسوں کو بڑھانے اور نفوس کو زندہ کرنے کی غرض سے بزرگانِ سلف و اجداد سابق کا ان کے اولادوں کے سامنے ذکر کرتا ہے اس طرح کہ وہ بھی ان کی روایات کو اپنا فرض سمجھیں (۱۰) گزری ہوئی قوموں کے احوال و اخبار کو تفصیل کے ساتھ درج کرتا ہے تاکہ صاحبانِ سیاست اپنے حال کو اس کے مطابق کریں اور اہلِ قوم ان کے حال پر

نظر کرکے اگر اہل سعادت ہیں تو اجتہاد کریں اور اصلی اسباب کو سمجھ کر اپنی ہمت بڑھائیں اور غیرت وحمیت کو متحرک کریں اور اگر اہلِ شقا ہیں تو عبرت حاصل کرکے اس کے اسباب سے اجتناب کریں ۔ (۱۱) اور حاکم کو عدل کی دعوت دیتا ہے اور اس کے فواید بیان کرتا ہے اور رعیت کی وکالت کرتا ہے اور ان کی شکایتیں حکومت تک پہنچاتا ہے اور حکام کے غل کا دفع کرتا ہے۔ اور حکام رشوت خوار کا انسداد کرتا ہے حوادث و واقعات کی تحقیقات کرکے اربابِ حل و عقد کو اطلاع کرتا ہے تاکہ اس کا علاج کرسکیں اور حکومت اور رعیت ایسے حکام کے ضرر سے محفوظ رہے (۱۲) اور اگر شخص غیر قوم کے متعلق نامناسب بات کہے تو دلیلوں اور براہین سے جو عقلمندوں کے نزدیک تلوار سے زیادہ مؤثر ہیں اپنی قوم کا دفاع واجب جانے (۱۳) اور ہر عاقل کے افکار کو تمام عقلا تک پہنچائے اور اہل دنیا کو ایک دوسرے کے خیالات سے مطلع کرے (۱۴) حکایات لطیفہ اور ظرایف واشعار بلیغ اپنے قارئین کے لیے کبھی کبھی شایع کرے (۱۵) قوم کے اجزاو اعضائے منتشر کو جمع کردے اور حیاتِ تازہ سے ان کو زندہ کرے (۱۶) اور اپنے قارئین کا سیر و سیاحت دنیا سے گھر بیٹھے دل شاد کرے (۱۷) بیماروں کو جو مزمنہ بیماریوں میں مبتلا ہوں اطبا اور ماہرین تک پہنچائے اور جاہلوں کی علما تک رہبری کرے (۱۸) قوم کے دوست کو دشمن سے تمیز کرائے اور دھوکہ اور فریب کو نہ چلنے دے۔

اور فی الجملہ اخبار ایسے انسان کے لیے جو نیکی و سعادت چاہے ایک جہاں نما دوربین ہی ایک طبیب شفیق ہی ایک سچا ناصح ہی ایک متواضع معلم ہی ادب سکھانے والا ہی اور آنکھ ہی بیدار اور چوکیدار ہی ہشیار۔ معالج ہی کامل عوام کے لیے اور تریاق شافی ہی تمام لوگوں کے واسطے اور تنبیہہ کرنے والا ہی غافلوں کو اور روح بخش ہی دلہائے مردہ کے لیے اور جگانے والا افکار افسردہ کو۔ تنہائی میں جلیس ہی۔ وحشت میں انیس ہی علما کا سرمایہ ہی۔ تاجروں کا رہبر، حکام کا مشیر معدلت گستر۔ زراعت پیشہ لوگوں کی فلاحت کا مددگار۔ صناعوں کا استاد جوانوں کا مکتب ارباب بصیرت کا نور دیدہ۔ خداوندان سیاست کا دستور پسندیدہ مدنیت کا مضبوط قلعہ اور سعادت انسانی کے لیے مضبوط پہاڑ۔

اور اخباروں کی ترقی وبلندی اور کثرت قوموں کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہوتی ہی۔ جس قدر علوم و معارف میں قوم ترقی کریگی اور مدارج مدنیت میں بڑھے گی اسی قدر اخبارات کی تعداد زیادہ ہوگی —

پس ہر امتے کہ جویانِ سعادت وخواہان رفاہیت بودہ باشد باید بداند کہ بغیرِ از جراید و اخبار ناہہائے یومیہ بمقصود اصلی ومطلوب حقیقی نخواہد رسید۔ ولاکن شرطِ آنکہ صاحب جریدہ بندۂ حق بودہ باشد۔ نہ عبد دینار و درہم۔ زیراکہ اگر بندہ دینار و درہم بودہ باشد حق را باطل۔ باطل راحق وخائین را امین وامین را خائین و صادق

را کاذب و کاذب را صادق و عدو را صدیق و صدیق را عدو و قریب را بعید و بعید را قریب و ضعیف را قوی و قوی را ضعیف و منفعت را مضر و مضرت را منفعت و حسن را قبیح و قبیح را حسن و موهوم حقیقی را موجود و موجود حقیقی را موهوم وا می نماید۔ والبته عدم این گونه جریده از وجود آں بمراتب غیر متناهیه بهتر است۔

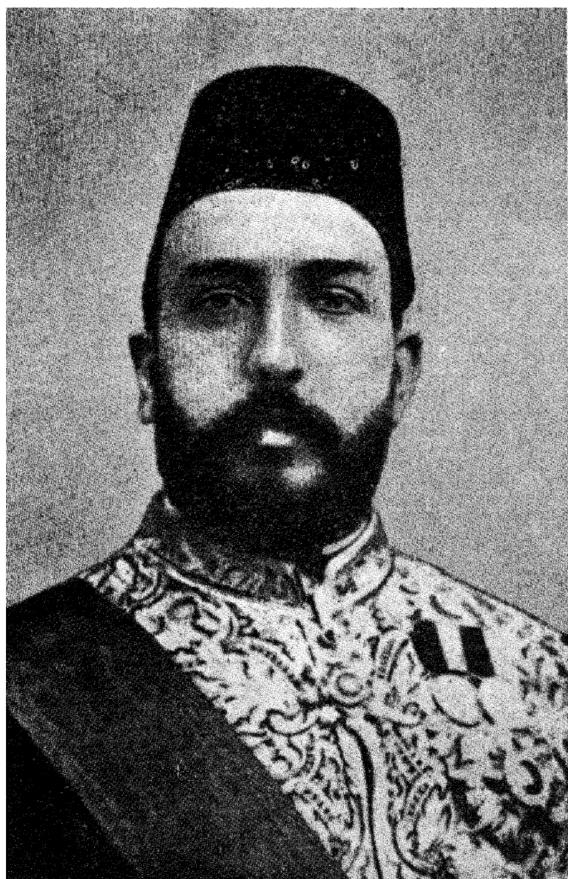
چوں فایده اخبارنامها و مزیت آنها معلوم گردید اکنوں مرا می رسد که تاسف خویشتن اظهار کرده بگویم که هندوستانی که از قدیم معادن علوم و معارف و منبع صنایع و بدایع و ینبوع حکم و فلسفه و کاں قوانین و نظامات مدنیت بوده است چرا باید جراید را در او این قدر که باید و شاید مقدار منزلت نه باشد۔ و جراید منطبعه در آں عبارت از معدودے چند باشد باکثرت عدد سکان آں که بدو صد ملیوں (۲۰ کرور) بالغ می شود و در اهالی آں مملکت را رغبتِ تامه در خواندن جراید نباشد باعظم فایده و کثرت منافع آں۔

و اما آن عذرے که بعضے از ارباب وجاهت هند در باب نخواندن جریده تقدیم کرده می گویند که جراید مطبوعه دریں ممالک مطالب نافعه و مقالاتِ مفیده را حاوی نیست لهٰذا طبع بقرأت آں رغبت نمی نماید البته آں عذر مقبول نخواهد افتاد۔ زیرا که معلوم است که نزد هر صاحب بصیرتے که اتفاق صناعت و احکام حرف و تانّق در اعمال و تحسین افعال برحسب رغبت و میل عموم امّت می باشد پس نقص را باید در افکار عمومیه دانست نه در اخبار نامها۔

اگر عموم اہالی را رغبتے کامل و میلے صادق از برائے خواندن جراید حاصل می شود بے شبہ صاحبان جراید صرف افکار نمودہ آنچہ در خیابان عقول داشتہ باشند برائے خواہش افراد امت بمنصبہ شہود جلوہ خواہند داد۔ بلکہ فکر خویش را با افکار دیگراں شریک کردہ ہر روزے مقالہائے شیریں از برائے تربیت و تہذیب عموم انشا خواہند نمود۔ ایں است مجمل آنچہ می خواستم در فضیلت جراید بیان کنم۔ (در معلم شفیق دسمبر ۱۸۷۸ء)

یہ ظاہر ہی کہ جب شیخ ایک طرف ازہر کے طلبا اور نوجوانوں کے حلقوں میں اور دوسری طرف اخبارات کے ذریعہ سے عوام کے اندر قوم کے سوتے ہوئے قویٰ کو متحرک کر رہے تھے تو برطانوی ادارے کی بہت بری نظریں ان پر پڑ رہی ہوں گی۔ شیخ کا وجود جو ہر طرح برطانوی مصالح اور مقاصد کے خلاف تھا یقیناً برطانوی "دخل" کے اہلکاروں کے اندر مخالفانہ جذبات پیدا کر رہا ہوگا۔ اگر خدیو اسمٰعیل اپنے ذاتی اغراض کو مدنظر رکھ کر اور اپنے یورپین قرض خواہوں کو دھمکانے کے لیے قوم پرست جماعت کا قایم رکھنا ضروری نہ سمجھتا تو شاید آٹھ برس تک شیخ کا مصر میں مقیم رہنا ہی مشکل ہوتا۔

مگر شیخ اسمٰعیل کے حالات سے بہت مایوس تھے اور در پردہ توفیق بے سے تعلقات پیدا کر رہے تھے۔ اس زمانہ میں توفیق عام طور پر قوم پرستوں کا ہمدرد اور معاون سمجھا جاتا تھا اور شیخ کی جماعت کو یہ امید تھی کہ اگر اسمٰعیل کسی طرح معزول ہو جائے اور توفیق اس کا جانشین قرار پائے تو غالباً قوم پرستوں کی امیدیں بھی سرسبز ہو سکیں۔ شیخ کا اثر اب مصر میں اس قدر کافی قایم ہو چکا تھا کہ نہ صرف مذہبی صحبتوں میں ان کے اجتہادات واجب التعظیم



توفيق باشا خديو مصر

١٨٩٢–١٨٧٩

سمجھے جاتے تھے بلکہ سیاسی جماعتیں بھی اپنی مشکلات کو شیخ کے مصلّے کی طرف لاتی تھیں۔ سطح کے اوپر اسمٰعیل حقوق طلب جماعت کی آواز سے متاثر نظر آتا تھا اور اس نے اس جماعت کو خوش کرنے کے لیے آئینی اصلاحات کے متعلق اپنا ایک اعلان بھی شایع کرا دیا تھا مگر شیخ جانتے تھے کہ یہ سب دھوکہ ہے اس لیے شیخ کے خلوت خانہ میں اسمٰعیل سے نجات پانے کی بہت سی تدابیر پر غور کیا جا رہا تھا۔ اس صحبتِ راز کے بعض مشوروں کا پتہ مفتی عبدہ کے بیانات سے چلتا ہے۔ اگر اسی عرصہ میں برطانوی حکومت نے اسمٰعیل کے معزول کئے جانے پر اصرار کرکے سلطان سے معزولی کے احکام جاری نہ کرا دیے ہوتے تو تعجب نہیں کہ قوم پرست جماعت اسمٰعیل کے خلاف کوئی کارروائی کرتی۔ معزولی کا حکم تو درحقیقت "دخل" کی طرف سے دیا گیا تھا لیکن سلطان نے اپنی سیادت کا نام قایم رکھنے اور اپنی ذلت پر پردہ ڈالنے کے لیے ایک فرمان بھی جاری کر دیا۔ اسمٰعیل کی معزولی نے اس کو قوم پرستوں کے حملے سے بچا لیا۔ ورنہ مشورے تو یہاں تک ہوئے تھے کہ اسمٰعیل کو کسی دن قتل کرا دیا جائے۔

القصہ جب اسمٰعیل کا اقبال جواب دے چکا اور دول نے اس کی معزولی کا فیصلہ کر لیا تو باالآخر ۲۶ر جون ۱۸۷۹ء کو اس کے بجائے خدیو توفیق نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔

توفیق کے تقرر نے قوم پرستوں کی اُمیدوں کو تازہ کر دیا۔ لیکن اس وقت تک شیخ کو شاید یہ معلوم نہ تھا کہ توفیق بھی تختِ حکومت پر قدم رکھتے ہی کچھ سے کچھ ہو جائے گا۔ اور یہ کہ تختِ حکومت حاصل کرنے کی امیدوں میں وہ قوم پرستوں کو محض دھوکہ دے رہا تھا۔ توفیق کی مسند نشینی

کو ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا کہ اس کا اصلی رنگ ظاہر ہو گیا۔ وہ جن اثرات کی وجہ سے اس مرتبہ پر فائز ہوا ان ہی اثرات کی طرف جھکنے لگا، وہ خیالات اور ارادے جن کا وہ قوم پرستوں پر اکثر اظہار کیا کرتا تھا یکسر بدل گئے لیکن وہ زیادہ عرصہ تک اپنی اس دو رنگی کو قایم نہ رکھ سکتا تھا اور جب قوم پرستوں نے ایفائے وعدہ پر زور دینا شروع کیا اور دوسری طرف دول کے نمایندوں نے دباؤ ڈالنا شروع کیا تو وہ مجبور ہوا کہ اپنے اصلی رنگ میں پوری طرح ظاہر ہو جائے چنانچہ سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ شریف پاشا کو جو شیخ کی جماعت کے رُکن تھے وزارتِ عظمیٰ سے برطرف کرکے ان کی جگہ ریاض پاشا کو جو قنصل خانوں کا نیاز مند تھا قلمدانِ وزارت سپرد کر دیا۔ چنانچہ اسی ایک واقعہ نے ہوا کا رُخ بخوبی ظاہر کر دیا اور قوم پرستوں کی تمام امیدیں جو رفیق کے ساتھ وابستہ تھیں ختم ہو گئیں۔

اس کے بعد شیخ کی باری تھی۔ توفیق کے لیے اُن کا قیام مصر میں یقیناً تکلیف دہ ہوتا اور خارجی قونصل خانے بھی چاہتے تھے کہ شیخ کو جلد سے جلد نکال دیا جائے۔ چنانچہ توفیق نے ان کے خارج البلد کیے جانے کا حکم جاری کر دیا۔

اس سلسلہ میں ایک واقعہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ۔

"روزے یک لورد انگلس در مصر در حالیکہ سید جمال الدین افغانی ہم حاضر بود افغان ہارا تحقیر کرد و بنا بر علیہ سید یک چوکی برداشتہ یک ضربہ قوی بفرق آن لارد اور دہ بود۔ بعد ازاں از مصر مفارقت نمود۔" [۵]

لیکن کسی دوسرے سوانح نگار کے بیان سے اس بیان کی تصدیق

---

[۵] ۔ دیکھو ضمیمہ نمبر [۵] جریدہ مصورہ مطبع ثبات استانبول

نہیں ہوتی۔ بہر حال فوری سبب جو کچھ بھی ہوا ہو مصر سے شیخ کا اخراج اس طرح عمل میں آیا کہ۔

"ایک دن شب کے دو بجے ایک دستہ فوج نے ان کی فرودگاہ بمقام خان خلیل کا محاصرہ کر لیا ان کو سوتے سے جگایا گیا۔ وہ صرف جلابہ (لمبا کرتہ) پہنے سو رہے تھے۔ اُسی حالت میں اُن کو اسپشل ٹرین میں بٹھا کر سوئز بھیج دیا گیا۔ جوں ہی یہ خبر مشہور ہوئی تو سخت ہیجان پیدا ہوگیا۔ اور قریب تھا کہ شورش ہو جائے۔ ایرانی سفیر نے سید صاحب کی خدمت میں تین ہزار پونڈ یہ کہہ کر پیش کئے کہ آپ اپنی بے سروسامانی کو اس رقم سے دور کیجئے۔ مگر شیخ نے اس رقم کے لینے سے انکار کر دیا۔"[۱]

ایرانی سفیر کے متعلق یہ واقعہ اس طرح بھی بیان کیا گیا ہے کہ جب اس نے سوئز جاکر یہ رقم شیخ کی خدمت میں پیش کی تو شیخ نے نہایت تحقیر کے لہجہ میں فرمایا کہ "اس رقم کو تم ہی اپنے پاس رکھو۔ مجھ سے زیادہ تم کو اس کی ضرورت ہے۔ شیر تو جہاں جاتا ہے اپنے لیے خود غذا پیدا کر لیتا ہے۔"

عثمان غالب افسر پولیس نے توفیق کے حکم سے شیخ کی ایک ہزار کتابیں بھی ضبط کر لیں اور اس طرح بے سرو سامانی کی حالت میں وہ ستمبر ۱۸۷۹ء[۲] میں مصر سے رخصت ہوئے۔

مرزا لطف اللہ خان نے اپنے بیانات میں بعض بہت ہی سخت ٹھوکریں کھائی ہیں حتیٰ کہ تاریخی واقعات کو بالکل غلط بیان کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب اعرابی پاشا کو مصر میں شکست ہوگئی اور انگریزی فوج نے

[۱] ابوسعید العربی در "جہانِ اسلام"، قسطنطنیہ [۲] بلنٹ در "روزنامچہ"

نے فتح پائی اس وقت شیخ کو بھی مصر سے نکلوا دیا گیا ۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ شیخ اعرابی پاشا کی قضیہ سے پہلے ہی مصر سے نکالے جا چکے تھے اور جس وقت اعرابی کا قضیہ شروع ہوا ہے تو وہ حیدرآباد اور کلکتہ میں موجود تھے ۔ بہر حال مرزا لطف اللہ کی یہ غلطیاں اس قابل بھی نہیں کہ اُن پر ان اوراق میں زیادہ بحث کی جائے ۔

شیخ کے ساتھ ہی ساتھ مفتی عبدہ بھی مدرسہ کی ملازمت سے برطرف کرکے قاہرہ سے خارج البلد اور نظر بند کردیے گئے ۔ استاد اور شاگرد دونوں کی امیدیں یوں دفعتاً مایوسی سے بدل گئیں ۔ لیکن دونوں نے محسوس کرلیا کہ یہ کھیل جس کو سیاست کہتے ہیں ایک دھوکہ کا کھیل ہے ۔ قصّہ مختصر یہ کہ شیخ اس دفعہ مصر سے رخصت ہوئے تو ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئے ۔ ان کا کام گویا اس ملک میں ختم ہو گیا تھا ۔ اور اپنی تحریک کا جو بنیادی پتھر انھوں نے وہاں نصب کردیا تھا اسی پر بعد کو اُن کے جانشینوں اور عقیدتمندوں نے ایک بہت بڑی عمارت بنالی جو باوجود مصر کی بدنصیبیوں کے اب تک اپنی جگہ قایم ہے ۔

ممالک اور اقوام کی تاریخوں میں ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ ایک غیر ملک اور نسل کا آدمی کسی اجنبی ملک کو اپنا ملک اور کسی اجنبی قوم کو اپنی قوم بناکر اور اس طرح ہر قسم کی قربانیاں کرکے اُس ملک کی خدمت کرے اور اس کا رہنما بن جائے ۔ سوائے پیغمبروں کے یہ سعادت بہت کم انسانوں کو حاصل ہوتی ہے اور اگر ہوتی ہے تو اُن لوگوں کو جو کسی نہ کسی حیثیت سے پیغمبری سے قریب ہوتے ہیں !۔

مصر کے قوم پرستوں کا قاید اوّل نہ مصری تھا نہ مصر میں پیدا ہوا

نہ وہاں اُس نے پرورش پائی تھی نہ وہ مصری قوم کی قدیم روایات سے آشنا تھا۔ وہ ایک جنگجو نیم وحشی افغان قوم کا فرد تھا جس نے اپنے دور دراز وطن سے مصر آکر آزادی اور حریتِ اسلامی کا علم بلند کیا اور اس طرح مصریوں کی قومی زندگی میں نفوذ حاصل کیا کہ وہ مصر کا بزرگ ترین رہنما اور داعی بن گیا۔ درحقیقت شیخ کی جد و جہد کی بنیاد نسل اور وطن اور قومیت سے بالاتر تھی۔ ان کا یہ خیال تھا کہ کوئی بھی اسلامی یا مشرقی ملک ہو اُس کی ترقی میں تمام دنیائے اسلام کی تقویت مضمر ہے۔ وہ دنیائے اسلام کو ایک جسم تصور کرتے تھے اور اسلامی ممالک کو اُس جسم کے اعضائے رئیسہ۔ اس لیے اُن کے خیال میں جو عضو بھی قوی ہو جائے اس کی قوت سارے جسم کی قوت میں اضافہ کرتی تھی۔ یہی نقطہ تھا جس پر شیخ نے اپنے "پین اسلامزم" کی بنیاد قایم کی تھی۔ لیکن شیخ کا پین اسلامزم بھی درحقیقت ایک بزرگ تر مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ تھا۔ جو لوگ شیخ کو صرف بہ اصطلاح سیاست۔ اتحادِ اسلامی کا داعی سمجھتے ہیں وہ محض نصف حقیقت سے آشنا ہیں۔ جیسا کہ شیخ کی زندگی کے حالات سے معلوم ہوتا ہے وہ مغربی اقوام کی ملک گیری اور مشرق پر مغرب کے تفوق کو حد درجہ خطرناک سمجھ کر مغربی استعماریت کے مخالف اور دشمن تھے اور اسی مخالفت اور دشمنی کو نتیجہ خیز بنانے کا ایک ذریعہ پین اسلامزم تھا جس کی دعوت وہ اسلامی ممالک کو دے رہے تھے۔ شیخ کی تقریروں اور تحریروں کے اقتباسات سے جو کسی دوسری جگہ درج کیے گئے ہیں یہ حقیقت بخوبی واضح ہوتی ہے۔

مصر میں شیخ کے کارناموں کو مختصراً تین حصوں میں تقسیم کیا

جا سکتا ہے۔

(۱) **جامعہ ازہر اور علما کی اصلاح اور بیداری** ۔ شیخ نے اپنے اجتہادات سے علما اور مذہبی طبقوں کے خیالات و توہمات میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ فلسفۂ جدید کے بعض اجزا کو اپنی تعلیمات کا جزو قرار دے کر انھوں نے مصری قوم کی نوجوان نسل کے اندر بیداری اور قوتِ عمل پیدا کر دی ۔ ان کی نظر کو وسیع اور ان کے خیالات کو بلند کر دیا۔ ایسے نوجوان پیدا کر دیے جو جدید تمدن اور سائنس کے مقابلہ میں اپنے وقار کو قایم رکھ سکتے تھے اور ساتھ ہی علوم جدیدہ سے ناآشنا نہ رہے تھے۔ شیخ نے مصر میں خالص اسلامی مذہبیت کے ساتھ عہد جدید کی ترقیوں کی روح پیدا کر دی ۔ اُن کی بہت سی "بدعتوں" کو قدامت پسند طبقہ ناپسند کرتا تھا لیکن باوجود مخالفت کے انھوں نے مذہب کو ازہر کے محراب اور ممبر سے باہر لا کر دکھا دیا کہ اسلام دنیا کی زندگی کے ہر شعبہ میں عملی حیثیت سے کامیاب ہو سکتا ہے۔ قدامت پسند علما قایل ہو گئے اور نئی نسل نے پورے جوش کے ساتھ لبیک کہا ۔

(۲) **اخبار نویسی کے ذریعہ سے جد و جہد** ۔

پہلی دفعہ مصر کی تاریخ میں شیخ نے پیش قدمی کرنے والے اخبار اور اخبار نویس پیدا کیے اور ملک میں مطالبہ حقوق انسانیت کی ایک ایسی آواز بلند کر دی جو آج بھی کسی قوّت کے دبائے نہیں دب سکتی ۔ قطع نظر دوسری خدمات کے بجائے خود تنہا یہی ایک کارنامہ شیخ کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

(۳) **فلاحین اور عامۃ الناس کی بیداری** ۔

تقریروں تحریروں مواعظ اور مختلف تبلیغی تدبیروں سے شیخ نے



عربی پاشا

عامۃ الناس کے دلوں میں مطالبۂ حقوق کا وہ جذبہ پیدا کر دیا جس سے آج بھی مصر کی قومی زندگی کا چراغ روشن ہے۔ یہ شیخ ہی کی تعلیمات کا ادنیٰ کرشمہ تھا کہ ۱۸۸۲ء میں ایک غریب فلاحین سپاہی نے وزیر جنگ کے عہدہ تک ترقی کی۔ عَلَم الکبریہ اعرابی کی مقاومت[۵۸] اور بعد کے تمام انقلابات اسی تخم سے پیدا ہوئے تھے جو شیخ نے مصر کی سرزمین پر ڈالا تھا۔ گو کہ اعرابی کی شورش سے براہِ راست شیخ کا یا مفتی عبدہ کا کوئی تعلق نہ تھا بلکہ جیسا کہ شیخ نے عُروہ العرثقی میں لکھا وہ اس وقت اعرابی کے اس طرزِ عمل کو دانشمندانہ بھی نہ سمجھتے تھے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اعرابی کی تحریک اسی عام قومی تحریک کا ایک شاخسانہ تھی جس کا بانی مصر میں شیخ کے سوا کوئی نہ تھا۔ فلاحین کی زندگی میں شیخ نے جو مشعلِ حیات روشن کر دی تھی اُسی کی روشنی اعرابی کو بھی حاصل ہوئی تھی۔ بلنٹ نے اپنی کتاب "سیکریٹ ہسٹری آف دی اکوپیشن"

میں اس حقیقت کو بخوبی واضح کر دیا ہے۔

جس طرح مصر میں اعرابی کی تحریک شیخ کی تعلیمات کا ایک عکس تھا اسی طرح سوڈان میں مہدی سوڈانی[۵۹] کا خروج بھی شیخ کے لگائے ہوئے درخت کی ایک مضبوط شاخ تھا۔ خود شیخ نے اپنے ایک خط میں بلنٹ کو بتایا ہے کہ مہدی سوڈانی کی جماعت میں شیخ کے بہت سے معتقدین شامل تھے۔ شیخ کے مصر جانے سے پہلے مصری فلاحین کی حالت بھیڑ بکریوں کی حالت سے بہتر نہ تھی مگر شیخ نے اُن مُردوں کو زندہ کیا۔

اس طرح مصر کی ہیئت قومی کا کوئی جزو ایسا نہ تھا جو شیخ کے اثرات

[۵۸] دیکھو ضمیمہ نمبر ۲۳۔ [۵۹] دیکھو ضمیمہ نمبر ۲۴

سے دور رہا ہو اور بلاشبہ مصری قومیت کا نقشِ اول شیخ ہی کا بنایا ہوا تھا۔ وہاں اب بھی اہلِ نظر شیخ اور شیخ کے "پیام" کو بھولے نہیں ہیں۔ مگر آج ہمارے ہندوستان کو دیکھئے تو یہاں بڑے بڑے علامہ بھی شیخ کے نام سے واقف نہیں!۔

ہندوستان۔ پانچواں سفر

مصر کو خیرباد کہنے کے بعد شیخ نے پہلے حجاز جانے کا قصد کیا۔ مگر پھر ہندوستان کی طرف روانہ ہوگئے۔ مصر کے دورانِ قیام میں برطانوی حکومت ان سے ناخوش ہوگئی تھی اور وہ یہ ضرور جانتے ہوں گے کہ ہندوستان میں اُن کو برطانوی حکومت کی نگرانی میں رہنا پڑے گا پھر تعجب ہے کہ انھوں نے ہندوستان آنے کا کیوں قصد کیا۔ جس قدر واقعات پیشِ نظر ہیں اُن سے شیخ کی اُن مصلحتوں کا کوئی علم نہیں ہوتا جن کی بنا پر وہ بجائے کسی دوسرے ملک کو جانے کے ہندوستان آئے۔ کیا وہ ہندوستان آنے پر مجبور کئے گئے؟ کیا وہ افغانستان جانے کے خیال سے اس طرف آئے؟ یا اُن کے کچھ ایسے خاص احباب ہندوستان میں تھے جن کی وجہ سے انھوں نے اس طرف کا رُخ کیا؟۔ بہر حال وہ آخر ۱۸۷۹ء میں پانچویں دفعہ ہندوستان تشریف لائے اور غالباً بمبئی سے براہِ راست حیدرآباد تشریف لیگئے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات کے بعد ہندوستان پر موت کی خاموشی طاری تھی اور اُس وقت نہ یہاں اخبارات تھے نہ سوانح نگار جو شیخ کی زندگی کے حالات کو قلمبند کرتے۔ اس لیے حیدرآباد میں شیخ کی زندگی کے جو حالات معلوم ہوسکے۔ وہ زیادہ تر زبانی اور سماعی ہیں۔ شیخ کے خاص خاص احباب اگر اُس زمانہ میں یہاں تھے تو ظاہر ہے کہ اُن کے

لبوں پر مہریں لگی ہوئی تھیں۔ مصر سے علم و فضل کی جو شہرت لے کر شیخ یہاں آئے تھے اس کے کانٹے ان کے مخالفین کی آنکھوں میں کھٹک رہے ہوں گے اور اس کا کوئی پھول نظروں میں نہ سماتا ہوگا۔ شیخ کا کم و بیش دو برس تک اس ملک میں قیام ہمارے لیے ایک بند کتاب ہے اور اُن کے سوانح نگاروں کو ان دو برسوں کے متعلق جو کچھ مواد ملتا ہے اُس کے ذرائع صرف یہ ہیں:-

۱- بلنٹ کا "روز نامچہ" چند ورق

۲- بلنٹ کی کتاب "انڈیا انڈر رپن" چند ورق

۳- رسالہ "معلّم شفیق"[۵] اور "معلّم"[۵] کے چند صفحات

۴- "رد نیچریہ"[۵] چند صفحات۔

۵- حبل المتین کلکتہ

۶- "اودھ اخبار" لکھنؤ

۷- "مشیر قیصر" لکھنؤ

بس! یہ کائنات ہے جو شیخ کی زندگی کے متعلق ہندوستان والوں کے پاس ہے۔ وہ بھی زیادہ تر دوسروں کی دی ہوئی۔ حیدر آباد میں اب ایسے لوگ باقی نہیں جنھوں نے شیخ کی صحبتیں دیکھی ہوں۔ بہت تلاش اور جستجو کے بعد صرف ایک صاحب ایسے ملے جو کبھی کبھی شیخ کی صحبتوں

---

۵ - سنہ میں حیدر آباد سے جاری ہوا ایڈیٹر مولوی محب حسین مرحوم

۵ سنہ میں حیدر آباد سے جاری ہوا ایڈیٹر محمد سجاد مرزا ایم۔ اے

۵ "رد دہریان" فارسی ہے، صفحات مطبوعہ بمبئی ۱۲۹۸ھ:- اردو میں بھی ترجمہ ہوچکا ہے۔ عربی ترجمہ مفتی عبدہ نے "ردّ علی الدھرین" کے نام سے کیا تھا۔ جو ۱۳۰۳ھ ہجری میں بیروت سے شایع ہوا۔

میں بیٹھے تھے افسوس ہے کہ اُن کے پاس کوئی تحریر یا کاغذ ایسا نہیں تھا جو شیخ کی زندگی سے تعلق رکھتا ہو۔ جب راقم الحروف ان سے ملا تھا تو یہ صاحب بہت ضعیف ہو چکے تھے اور بہ اقتضائے عمر اُن کا حافظہ بہت ضعیف تھا۔ تاہم جو کچھ وہ زبانی بتا سکے اس کا ضروری خلاصہ حسب ذیل ہے۔

"شیخ جب حیدرآباد آئے تو محی الدولہ نواب رسول یار جنگ[۵۵۳] کے مکان پر مقیم ہوئے۔ عموماً فارسی یا عربی بولا کرتے تھے۔ ترکی اور فرانسیسی زبانیں بھی جانتے تھے۔ مزاج میں غصہ تھا۔ حیدرآباد کے علما فضلا بکثرت ان کی صحبت میں شریک ہوتے تھے۔ مولوی عبدالصمد صاحب اور مولوی ابراہیم[۵۵۴] صاحب سے اکثر علمی مباحثے ہوتے رہتے تھے۔ ایک دن مولوی ابراہیم صاحب سے "جزو لایتجزٰی" پر بحث ہوئی اور شیخ نے اس قدر عالمانہ تقریر کی کہ سب لوگ حیران رہ گئے۔ نیچری فرقہ کے بہت خلاف تھے۔ چنانچہ ایک مضمون "مقالہ" انگھوریاں باشوکت و شان" کے عنوان سے مولوی محب حسین[۵۵۵] صاحب کے رسالہ "معلم" میں شائع کرایا۔ جب مضمون لکھنے والے تھے تو ایک دن احباب سے دریافت کرنے لگے۔ کہ یہاں سب سے کم درجہ قوم کون سی ہے۔

۵۵۳ - دیکھو ضمیمہ

۵۵۴ جھنجانہ کے رہنے والے ایک مشہور عالم و فاضل شخص تھے اور مدرسہ اعزا حیدرآباد کے صدر مدرس تھے۔ دو بھائی تھے غدر کے زمانہ میں دونوں اپنے وطن سے بھاگ گئے ایک حجاز چلے گئے اور ایک حیدرآباد آئے اور یہیں مقیم ہو گئے۔

۵۵۵ مولوی صاحب موصوف کے صاحبزادے زندہ ہیں انھیں کی عنایت سے مجھے معلم کا پورا فایل میسر آیا جس سے شیخ کے مضامین نقل کیے گئے۔

لوگوں نے بتایا کہ اس کو اگھوری کہتے ہیں یہ سن کر نیچریوں کے متعلق اسی لفظ کو پسند کیا اور اپنے مضمون کا یہی عنوان قرار دیا۔

شیخ کے علم وفضل کا حیدرآباد میں اس قدر شہرہ ہوا کہ سرسالارجنگ اوّل نے اُن سے ملنے کی خواہش کی اور مولوی مسیح الزماں خاں اُستاد حضورِ نظام کو ان کے پاس یہ پیام لے کر بھیجا۔ شیخ جاکر سرسالارجنگ سے ملے اس ملاقات کا سالارجنگ اعظم پر یہ اثر ہوا کہ انھوں نے مولوی مسیح الزماں خاں اور دیگر اکابر کے ذریعہ سے یہ تحریک کرائی کہ شیخ حیدرآباد میں بہ سلسلۂ منصب و ملازمت اقامت اختیار کریں۔

شیخ نے ایک دن نواب رسول یار جنگ سے کہا کہ "مجھے کوئی کیا نوکر رکھے گا میرا دماغ بگڑا ہوا ہے۔ میرے لیے ایسی کونسی خدمت ہے جو تجویز ہوگی" پھر ایک دن تنہائی میں نواب صاحب کو سمجھانے لگے کہ "بات یہ ہے کہ حیدرآباد میں حسد بہت کیا جاتا ہے۔ میری ترقی کو دیکھ کر بہت سے لوگ حاسد بن جائیں گے۔ اور پھر مجھے ذلت کے ساتھ یہاں سے نکلنا پڑے گا اور انگریزوں کو بھی میرے خلاف بھڑکایا جائے گا۔" ان ہی خیالات کی بنا پر انھوں نے باوجود نواب سالارجنگ کے سخت اصرار کے منصب و ملازمت سے انکار کر دیا۔

شیخ کا ملازم عارف بھی پڑھا لکھا آدمی تھا اور فارسی اور عربی میں گفتگو کرسکتا تھا۔ اکثر شب کو احباب کے رخصت ہونے کے بعد شیخ اس کو بلالیتے تھے۔ وہ چائے تیار کرکے لاتا تھا۔ شیخ چاء پیتے جاتے تھے اور کسی علمی مسئلہ پر اُس سے گفتگو کرتے جاتے تھے۔ شیخ کے عقاید سنیوں کے عقاید تھے۔ نماز بھی وہ سنیوں کے طریقہ پر پڑھتے تھے۔ نواب

رسول یار جنگ نے ان سے فرمائش کی کہ ایک عربی کی لغت مرتب کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے لغت کی ترتیب کا کام شروع بھی کر دیا تھا مگر وہ نامکمل رہ گیا۔"

یہی صرف ایک معتبر بیان ہی جو شیخ کے متعلق حیدر آباد میں حاصل ہو سکا اس کے علاوہ جو کچھ ہی وہ خارجی ذرایع سے میسر ہوا ہی۔

بلنٹ اور لیڈی این بلنٹ نے جابجا اپنے سفرنامہ ہندوستان میں شیخ اور ان کے احباب کا ذکر کیا ہی۔ جب یہ دونوں ہندوستان آئے تھے تو شیخ یہاں سے جا چکے تھے مگر یہ دونوں اُن کے اکثر احباب سے ملے۔ بلنٹ لکھتا ہی کہ حیدر آباد میں سیّد علی بلگرامی کو شیخ کی قابلیت کا بہت معترف پایا مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے تھے کہ

" شیخ اس قدر زیادہ سوشلسٹ اور تیز مزاج تھے کہ کسی اصلاحی کام کی تکمیل نہ کر سکتے تھے " اور اس میں شبہ نہیں کہ ایک حد تک یہ رائے بالکل صحیح تھی۔ شیخ کا خمیر دوسری قسم کا تھا۔ وہ تحریکیں پیدا کر کے فضا کو بدل سکتے تھے، نقشے بنا سکتے تھے معمار اور کاریگر مہیا کر سکتے تھے، لیکن یہ ناممکن تھا کہ وہ خود کسی ایک مرکز پر جم کر کسی ایک ہی کام میں مصروف ہو جاتے۔ ان کی زندگی کا مقصد اس قدر وسیع تھا کہ اس کے کسی ایک جزو کو لے کر وہ بیٹھ رہیں یہ ممکن نہ تھا۔

بلنٹ اور لیڈی بلنٹ کے روزنامچہ کے بعض ایسے اقتباسات جن کا تعلق شیخ سے ہی بہت دلچسپ ہیں۔

یکم دسمبر ۱۸۸۳ء .... شام کو رسول یار جنگ ملنے آئے .... انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں جمال الدین جیسا ایک عالم بھی نہیں مل سکتا۔

---

۵ دیکھو ضمیمہ نمبر ۲۶

۱۰ر دسمبر ۱۸۸۳ء :- رسول یار جنگ نے دو گھنٹہ کا سفر میرے ساتھ کیا۔ کہنے لگے کہ اسی فاصلے تک میں جمال الدین کو بھی رخصت کرنے آیا تھا۔

۲۴ر دسمبر ۱۸۸۳ء :- مولوی ایم۔ اے۔ جمال الدین کے قسم کے آدمی ہیں۔ جمال الدین سے نے اِن کے خیالات مسلمانوں کی اصلاح کے متعلق بدل دیے ہیں۔ (یہ صاحب ہائی کورٹ میں مترجم ہیں) اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ جمال الدین کلکتہ کے مسلمانوں سے بہت مایوس ہوئے تھے۔ یہ لوگ گورنمنٹ کے خوف سے اُن سے بات تک نہ کرتے تھے۔ جمال الدین نے ان لوگوں کو بہت خود غرض اور حبِ وطن سے خالی پایا۔ جمال الدین کی رائے امیر علی کے متعلق اچھی نہ تھی۔ عبد اللطیف کو وہ ڈرپوک سمجھتے تھے۔ اور بقیہ مولویوں کو حد درجہ جاہل۔

.... ۲۷ر دسمبر ۱۸۸۳ء کلکتہ میں مولوی ایم۔ اے کے یہاں جمال الدین کے معتقدین سے ملا۔ یہ لوگ جمال الدین کی پرستش کرتے تھے۔ یہ سب ابو نظارہ اور النحل پڑھتے ہیں۔ مگر بہت غریب ہیں........

یکم جنوری ۱۸۸۳ء :- وہ سب نوجوان ہیں طلبا اور پرجوش نوجوان۔ مجھے اندیشہ ہے کہ سب انگلستان سے دلی نفرت رکھتے ہیں...... مذہب کے متعلق اُن کے خیالات وسیع تھے۔ درحقیقت وہی خیالات تھے جو جمال الدین کے ہیں۔....... جمال الدین کے پانچ دوست ملنے آئے۔ وہ سب نوجوان طلبا ہیں اور انگلستان سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ سب ابو نظارہ پڑھتے ہیں۔ ان میں سے صرف ایک انگریزی جانتا تھا۔ یہ لوگ نہایت صفائی سے ہر مضمون پر گفتگو کرتے تھے۔ مجھے اُن کی یہ صاف گوئی بہت پسند آئی۔........

۵ جنوری ۱۸۸۳ء "ایک نوجوان طالب علم سید ایم۔ ملنے آئے اور مجھ سے یونیورسٹی کے تجویز کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ انھوں نے کہا کہ تمام مسلمان طلبا اس کام میں مدد کریں گے اگر سید جمال الدین بھی میری کوشش سے اس یونیورسٹی کے پروفیسر بنا دیے جائیں .... یہ طلبا جمال الدین کی پرستش کرتے ہیں......"

یونیورسٹی کی تجویز کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ حیدر آباد کے قیام کے زمانہ میں شیخ کو یہ خیال پیدا ہؤا تھا کہ مسلمانوں کے لیے ایک یونیورسٹی ایسی بنائی جائے جس میں تعلیم سب مادری زبان میں دی جایا کرے۔ آج حیدر آباد میں دوسرے اہلِ نظر کے ہاتھ سے یہ تخیل کسی حد تک جامۂ عمل پہن چکا ہے۔ لیکن شیخ کی وسعتِ نظر کو دیکھیے کہ آج سے پچاس سال پہلے وہ اُسی تجویز کو پیش کر رہے تھے جو آج ہر شخص کی رائے میں ایک اہم قومی کام ہے۔ قیام حیدر آباد کے زمانہ میں شیخ نے اس تجویز کے متعلق پُر زور مضامین لکھ کر شایع کرائے۔ اور جب بلنٹ ہندوستان آنے لگے تو پیرس میں اُن سے خواہش کی کہ وہ لارڈ رپن کو اس طرف متوجہ کریں۔ چنانچہ بلنٹ نے ہندوستان آکر حیدر آباد و کلکتہ وغیرہ کے اہل الرائے اصحاب سے مشورہ کیا اور پھر لارڈ رپن کے سامنے یہ تجویز پیش کی اور سر سالار جنگ کو بھی اپنی رائے سے متفق کر لیا۔ جس وقت حضورِ نظام پہلی مرتبہ ویسرائے سے ملنے کلکتہ گئے تو بلنٹ وہاں موجود تھے اور وہیں انھوں نے سالار جنگ ثانی اور دوسرے امرا سے مجوّزہ یونیورسٹی کے متعلق گفتگو کی۔ بلنٹ لکھتے ہیں کہ وہ سب آمادہ اور رضامند تھے اور اُن کی رائے تھی کہ یہ تجویز باقاعدہ صورت میں حضور نظام کے سامنے پیش کی جائے۔ چنانچہ. ....

۲۵ جنوری ۱۸۸۳ء کو بلنٹ نے یہ تجویز معہ ایک خط کے جو حضور نظام

کے نام تھا نواب سالار جنگ کو بھیجدی۔ بلنٹ کے "روز نامچہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے لارڈ رپن سے گفتگو کرنے کے بعد یہ تجویز حضور نظام کی خدمت میں بھیجی تھی۔ چنانچہ اس تجویز کی نقل بلنٹ کے انڈیا انڈر رپن India under Ripon کے ضمیمہ میں درج کر دی گئی ہے۔ حضور نظام کی طرف سے اس تجویز کا جو جواب دیا گیا وہ بھی اُسی کے ساتھ موجود ہے۔ اس جواب کے بعض فقرات نقل کرنے کے قابل ہیں۔

"حیدر آباد دکن ۱۳ر فروری ۱۸۸۴ء۔

"........... ہز ہائینس نے لارڈ رپن سے جب وہ یہاں مختصر زمانہ کے لیے تشریف لائے تھے اس معاملہ کے متعلق گفتگو کی تھی اور ہز ایکسلنسی اس تجویز کو پسند کرنے اور اُس کی حمایت کرنے کے لیے تیار تھے۔ ہز ہائینس اس تجویز کو مسلمانوں کی ترقی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں اور وہ خوش ہوں گے اگر دوسرے مقامات کے مقابلہ میں حیدر آباد کو اس یونیورسٹی کا مرکز بنا دیا جائے۔ چونکہ یہ تجویز آپ ہی نے شروع کی ہے اور آپ ہی نے اس کے متعلق ملک کے دوسرے حصوں میں اہل الرائے اصحاب کی آرا معلوم کرنے کی تکلیف برداشت کی ہے اس لیے ہز ہائینس کی خواہش یہ تھی کہ آپ تجویز کو مکمل کرنے کے لیے چند روز اور اس ملک میں ٹھہرتے۔ بہر حال اگر آپ کی دوسری مشغولیت آپ کو پھر ایک دفعہ حیدر آباد آنے کا موقعہ دے سکے تو ہز ہائینس اس معاملہ میں آپ کی امداد حاصل کر کے خوش ہوں گے۔ ہز ہائینس کو مسرت ہے کہ ہز ایکسلنسی وائسرائے نے بھی اُن سے اس کام میں امداد کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

آپ کا مخلص۔ سالار جنگ"

معلوم ہوتا ہے کہ بلنٹ کے ہندوستان سے جلد چلے جانے کی وجہ سے یہ تجویز آگے نہ بڑھ سکی اور ختم ہوگئی۔لیکن شیخ کا تخیل جس چیز کو پچاس برس پہلے دیکھ رہا تھا وہی چیز پچاس برس بعد کسی نہ کسی طرح عملی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ بلنٹ کے بیانات سے اور نیز دوسرے ذرائع سے اور خود شیخ کی تقریروں اور تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی زیادہ توجہ ہندوستانی نوجوانوں کے خیالات کی اصلاح اور نشوونما کی طرف رہی اور نوجوانوں ہی پر شیخ کے اثرات زیادہ تر قایم ہوئے۔ علما اور خواص کی جو حالت اس وقت تھی اُس سے شیخ مایوس ہو چکے تھے اور اس لیے وہ اپنی ساری قوت نئی نسل پر صرف کر رہے تھے۔ ان کے ایک سوانح نگار نے تو یہاں تک لکھدیا کہ۔

"سید جمال الدین وقتے کہ بس جوانے در ہندوستان بود چنانکہ بحرکت مشہور اختلالیہ بومبار داخل بود۔ ہم چناں پاکسانے کہ در مصر حادثۂ اعرابی پاشا حاضر کردہ بودند برابر کار می کرد" ؎

لیکن یہ بیان بہت دور از قیاس ہے۔اول تو شیخ کلکتہ میں صرف چند ہی روز ٹھہرے اور دوئم اُن پر حکومت کی سخت نگرانی قایم تھی بلکہ فی الواقعہ وہ نظربندی کی حالت میں تھے۔پس یہ کسی طرح ممکن ہی نہ تھا کہ وہ کسی خفیہ سازش میں شریک ہو سکتے۔ اس کے علاوہ شیخ کی فطرت سازشوں اور خفیہ کارروایوں سے بہت بعید تھی۔ ان کی زندگی میں کوئی چیز کبھی راز بن کر نہ رہی۔ اگر اس بیان میں زرا بھی کوئی اصلیت ہوتی تو ہم خود شیخ کی زبان سے ضرور کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ سُن لیتے۔ بات کا چھپانا اور

؎

زبان کو روکنا جانتے ہی نہ تھے۔ خود ان کے اقوال سے ہم کو معلوم ہو کہ اس دفعہ ہندوستان میں وہ سیاست سے بالکل علیحدہ رہے۔ البتہ عام حالات کے متعلق جو خیالات وہ رکھتے تھے ان کا وہ بلا تردد اظہار کیا کرتے تھے۔ لیڈی این بلنٹ نے اپنے "روز نامچہ" میں اکثر وہ باتیں لکھدی ہیں جو شیخ ہندوستان کے متعلق کہا کرتے تھے مثلاً۔

"۱۳ر ستمبر ۱۸۸۳ء (پیرس)۔ ہمارے ہوٹل پہنچنے کے بعد ہی جمال الدین آگئے ان سے معلوم ہوا کہ وہ فرانسی زبان پڑھ رہے ہیں۔ اور اُن کا قصد جاڑوں بھر پیرس رہنے کا ہو۔ ولفرڈ (بلنٹ) شیخ کی رائے سلطان اور ہندوستان کے متعلق معلوم کرنا چاہتے تھے۔ شیخ نے کہا عبدالحمید خان کے زمانہ سے پہلے، ہندوستان میں کوئی شخص بھی سلطان کے متعلق کچھ نہ جانتا تھا نہ ان سے کوئی تعلق رکھتا تھا۔ لوگ بس اتنا ہی جانتے تھے کہ کسی دور دراز مقام پر ایک مذہبی پیشوا ہو۔ اب بھی لوگوں کا یہ خیال نہیں ہو کہ سلطان کو ہندوستان میں کوئی مادی قوت حاصل ہو جائے۔ ہندوستان میں عام طور پر یہ خیال ہو کہ روسی حملہ کریں گے اور انگریزوں کو نکال دیں گے اور یہ کہ یہ واقعہ جلد پیش آنے والا ہو۔ ہندوستان میں روسی جاسوس نہیں ہیں۔ شاید کبھی کوئی جاسوس آجاتا ہو۔ مگر وہ ٹھہرتا نہیں۔ اب روسی مَرو تک آچکے ہیں۔ وہاں بہت جلد روسی حکومت قایم ہو جائے گی۔ اور پھر ہندوستان میں بھی روسی جاسوس آیا کریں گے۔

ولفرڈ نے ہندوستان میں البرٹ بل اور لوکل گورنمنٹ ایکٹ کے اختلاف کے متعلق شیخ سے معلومات حاصل کرنی چاہی۔ جمال الدین کا بیان یہ تھا کہ مسلمانوں کو آمادہ کرنا بہت مشکل ہوگا اس لیے کہ وہ اس

بات سے ڈریں گے کہ کہیں اُن کو پھانس کر پھر اُن کا راز انگریزوں پر نہ کھول دیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ برطانوی ہندوستان گورنمنٹ ہند کے جاسوسوں سے بھرا ہوا ہے۔ جن میں بہت زیادہ ہندو ہیں۔ یہ حالت ہندوستانی " انقلاب کے زمانہ سے ہے۔ (شیخ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو " انقلاب " کے نام سے یاد کیا کرتے تھے)۔

.... شیخ نے کہا کہ ہندوستان میں گورنمنٹ ہمیشہ مختلف اقوام کے درمیان نا اتفاقی پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ خصوصاً ہندو اور مسلمانوں کے درمیان۔ اور بہ ظاہر اس کو کامیابی بھی ہوتی ہے.....

...... شیخ سے میری گفتگو دیر تک ہوتی رہی......"

نامناسب نہ ہوگا اگر اس موقعہ پر ہم ہندوستان کے متعلق شیخ کے خیالات کا صحیح عکس پیش کرنے کی غرض سے اُن کے بعض ایسے مضامین کے مختصر اقتباسات درج کر دیں جن کا تعلق ہندوستان کے معاملات سے ہے۔ ہندوستان کے متعلق شیخ کی دلچسپیوں کا کافی اندازہ ان اقتباسات سے ہو سکے گا۔

اسی زمانہ میں جب کہ شیخ حیدرآباد میں مقیم تھے اور اہلِ ہند کے قومی مسائل پر غور و فکر میں ان کا وقت گزر رہا تھا رسالہ معلم (حیدرآباد) میں اُن کا ایک مقالہ " فلسفہ " وحدت جنسیت و اتحاد لغت " کے عنوان سے شایع ہوا جس میں شیخ نے اجتماعی زندگی کے بعض اہم مسائل کے متعلق اپنے احساسات کو اس ملک کے سامنے پیش کیا تھا۔ ان کے الفاظ آج بھی اتنے ہی صحیح اور برمحل ہیں جتنے کہ ۱۸۸۲ء میں تھے لیکن شاید اُس وقت اِن باتوں کے سمجھنے والے ایسے نہ تھے جیسے آج ہیں۔ شیخ نے علوم جدیدہ

کی تعلیم مادری زبان میں دینے پر زور دیتے ہوئے لکھا تھا کہ :۔

"ہندوستان کے حالات پر نظر کرکے کہوں کہ اہلِ ہند میں سے وہ لوگ جو نورِ بصیرت کی چوٹی پر آگئے ہیں اور جنسیت کے معنی سمجھنے لگے ہیں اور اس کے فائدوں سے واقف ہو گئے ہیں اور مستقبل پر نظر رکھتے ہیں اور تدبر کی خوردبین سے قوموں اور قبایل کے حالات کا راز دیکھتے ہیں کیوں اس اہم مسئلہ پر غور نہیں کرتے اور کیوں اس ضروری کام کو انجام نہیں دیتے اور کیوں اس کا اہتمام نہیں کرتے ۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ جنسیت کی بقا کا انحصار اس پر ہے کہ مدارس میں تعلیم وطنی زبان میں ہو ۔ کیا یہ امر باعثِ تعجب نہیں کہ علوم جدیدہ نے سارے عالم پر قبضہ کر لیا ہے اور فنون نے کرۂ زمین کا احاطہ کر لیا ہے ۔ لیکن حال یہ ہے کہ اس میں سے کسی اچھی چیز کا زبانِ ہندی میں ترجمہ نہیں کیا گیا ۔ کیا اہلِ ہند اس نکتہ سے غافل ہو گئے کہ اگر ان کی قومی زبان میں علوم نافعہ ان کی قومی مدنیت کا جزو نہ بنیں گے تو ان کی قومیت کو پائیداری حاصل نہ ہوگی ۔ کیا یہ خبر نہیں کہ عقلا کے ذمہ پہلا فرض یہ ہے کہ وطن کی زبان کی توسیع کریں ۔ پھر کیوں علومِ جدیدہ کو قومی زبان میں اور خصوصاً اردو میں جو بمنزلہ عام ملکی زبان کے ہے ترجمہ کرکے کیوں دوسری زبانوں سے جیسی کہ سنسکرت، مرہٹی اور بنگالی ہیں مدد نہیں لیتے اور کیوں وقتِ ضرورت اپنی زبان کی کمی پوری کرنے کے لیے لغتِ انگریزی سے مدد لیتے ہیں ۔ بہت زمانہ ہوگیا قوم انگریز جو علوم نافعہ اور فنونِ مفیدہ کی استاد ہے ملک ہندوستان میں حکمرانی کر رہی ہے ۔ پس کس وجہ سے دانشمندانِ ہندوستان اُس سے فایدہ حاصل نہیں کرتے اور اُس کے علوم سے اپنے وطن

کے لیے ایک ذخیرہ حاصل نہیں کرتے - اور کیونکر ممکن ہے کہ ان علوم جدیدہ سے اپنے وطن کے لیے ذخیرہ حاصل کریں جب تک کہ اُن علوم کو زبان وطنی میں ترجمہ نہ کرلیں اور کیونکر ممکن ہے کہ علوم ملک میں عام ہو جائیں جب تک کہ وہ اس ملک کی زبان میں رایج نہ ہوں اور وہ علوم جو بیگانہ زبانوں میں ہوں کیونکر پایدار ہو سکتے ہیں اور کسی کو فخر کرنے کا کیا موقعہ ہے اگر اس کے کتب خانے میں غیر زبان کی ہزار ہا کتابیں ہیں حالانکہ قوم کے فایدہ کی ایک کتاب بھی ملکی زبان میں موجود نہ ہو - کیا کوئی عاقل دوسروں کے فخر کو اپنا فخر سمجھ سکتا ہے اور کیا سوائے اپنی جنس کے دوسرے کی جنس پر کوئی عقلمند فخر کیا کرتا ہے...... اگر کوئی (دیباچہ ہا، یعنی پہلوان پنبہ یہ کہے کہ جدید علوم کا مقصود ایک ہی ہے خواہ وہ وطنی زبان میں ہوں یا غیر زبان میں اور مفید علوم سب انگریزی زبان میں موجود ہیں اور انگریزی قوم عرصہ سے تمام ہندوستان پر حکمراں ہے اور غالب کی متابعت اور مماثلت ہر حال میں لازم ہے اس لیے ہم ہندوستانیوں کو چاہیے کہ غالب قوم سے منافع حاصل کرنے اور فوایدحاصل کرنے کے لیے اپنی ہستی کا لباس اتار ڈالیں اور تعین قومیت کی قید کو اٹھا دیں اور یکبارگی غالب قوم کے وجود میں فنا ہو جائیں اور علوم معارف کو فاتح قوم کی زبان میں حاصل کریں اور ان کی زبان کو ہر چیز پر ترجیح دیکر وطنی زبان کے بجائے استعمال کریں بلکہ تمام امور میں ایسا ہی کریں - پس ایسے شخص سے کہنا چاہیے کہ اولاً اگر یہ خواہش غالب کی طرف سے ہو تو اس کو غالب کے تعلی اور نخوت کے حدِ اعتدال سے گزرنے پر محمول کیا جا سکتا ہے - لیکن اگر مغلوب اس بات کو اپنی زبان

پر لائے تو بلاشک اُس کا منشا سوائے خوشامد اور تملق کے کچھ نہیں....

یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ زبان انگریزی کی تعلیم کو بالکل بند کر دیا جائے بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ زبان انگریزی کا حاصل کرنا چند وجوہ سے ہندوستانیوں پر لازم ہے"۔ نمبر ۵

ان وجوہ کو بیان کرتے ہوئے اپنے مقالہ کو ختم کرنے سے پہلے شیخ امت انگلیسیہ سے مخاطب ہوتے ہیں اور ہندوستان کے متعلق اس کو مشورہ دیتے ہیں کہ :۔

"جو کچھ یہاں تک کہا تھا اُس کا روئے سخن ہندوستانیوں کی طرف تھا۔ اب انگریزوں کی قوم سے جو بڑی قوم ہے کہتا ہوں کہ مغربی قوموں کی حرص و طمع اندازہ سے باہر ہو گئی ہے۔ دولتِ روسیہ نے ایک قدم مرو کی طرف بڑھایا اور ایک ہاتھ استانبول کے دروازہ کی طرف۔ اور دولت فرانسہ نے ٹیونس کو ہضم کرکے اب طرابلس اور مصر کی طرف نظر کی ہے اور دولت اطالیہ بھی مصر و طرابلس کی فکر میں ہے اور دولتِ جرمن بھی کبھی جزیرہ کریٹ کی طرف نظر کرتی ہے اور کبھی ساحل شام پر مستعمرات کی بنا قایم کرتی ہے........ انگریزوں کو ہندوستان کی حفاظت کے لیے بہت قوی وسایل جن سے آرام دل حاصل ہو محض استحکامات جبل الطارق و قبرس و باب المندب و عدن و جزیرہ سقوطرہ و کیپ و درہ خیبر و درہ بولان و شہر قندھار سے حاصل نہ ہو سکیں گے..........بلکہ حفاظتِ کامل اور حراست و اطمینانِ خاطر و سکونِ قلب اُس وقت حاصل

۵۔ فلسفہ وحدت وجنسیت" از رسالہ معلم ترجمہ از فارسی۔ مکمل مضمون کتاب کے آخری حصّہ میں درج کیا گیا ہے۔

ہو گا جب کہ اپنی حکومت کے استحکامات کو ہندیوں کے قلوب میں مستحکم کر دیں ۔ یہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ہندوستانی زبان کو حکومت کی زبان قرار دیں"۔ ؎

آج جس موضوع پر اخبار و رسایل کے ہزار ہا صفحات کالے کیے جاتے ہیں پچاس برس پہلے اُسی موضوع کا ہر پہلو شیخ کے پیش نظر تھا اور اُس زمانہ میں جب ملک کی کوئی سیاسی یا قومی جماعت ـــ نہ علی گڑھ اور نہ کانگریس ـــ قومی زندگی کی اس ضرورت کو محسوس کرتی تھی ۔ شیخ اس کے لیے اپنے قلم اور زبان کی طاقت صرف کر رہے تھے ۔

جیسا کہ ان صفحات میں جابجا واضح ہوگا شیخ کی عادت تھی کہ جو کچھ کہتے تھے صاف صاف کہتے تھے ۔لگی لپٹی نہ رکھا کرتے تھے ۔ بلکہ بعض اوقات اُن کے الفاظ کی سختی حدِ اعتدال سے بھی گزر جاتی تھی ۔ ہندوستان کے علما اور قدیم طریقۂ تعلیم دینوی کے متعلق وہ اکثر اپنے خیالات صاف صاف ظاہر کیا کرتے تھے چنانچہ لکھتے ہیں کہ :۔

"........ صاحبو ! فی زمانہ مسلمانوں کی تعلیم کا طریقہ شروع سے آخر تک بگڑا ہوا ہے ۔مثلاً عربی کو لیجئے ۔ عربی تعلیم کا مفہوم علم نحو کو حاصل کرنا سمجھا جاتا ہے علم نحو کے حاصل کرنے کا اصل منشا اور مقصد یہ ہے کہ صحیح طور پر زبان کا بولنا اور لکھنا پڑھنا آجائے اور بس ۔ لیکن مسلمان طلبا کا تمام وقت اُس کی لایعنی بحثوں میں اور فلسفیانہ افکار میں صرف ہو جاتا ہے اور عمر بھر عربی پڑھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ تو عربی میں دو جملے صحیح بول سکتے اور نہ لکھ سکتے ہیں حتیٰ ایں کہ دو سطر بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے ۔

؎ "فلسفۂ وحدت وجنسیت" از رسالہ معلم"

علم معانی و بیان جس کو ادبیات کہتے ہیں اور جس کی تحصیل سے انسان منشی خطیب اور شاعر ہو سکتا ہے اس کا یہ حال ہے کہ تمام عمر پڑھنے کے بعد روز مرہ کی گفتگو پر بھی طالب علم قادر نہیں ہوتا۔ علم منطق جو میزانِ افکار کہا جاسکتا ہے اور انسان کو حق و باطل اور صحیح و فاسد کا امتیاز کرنے پر قادر کرتا ہے اس کا اثر مسلمان سلطنتوں پر یہ ہوا کہ ان کے دماغ محکمۂ خرافات اور واہیات سے مملو پائے جاتے ہیں۔ اور اُن کے اور بازاریوں کے افکار میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ علم حکمت جس کا تعلق موجودات خارجہ کے اُصول کی بحث سے ہے اس میں مسلمانوں کی یہ کیفیت ہے کہ "صدری" اور "شمس بازغہ" پڑھ لیا اور خود کو حکیم سمجھنے لگے حالانکہ دائیں بائیں کا فرق نہ معلوم ہوا اور اتنی بھی صلاحیت پیدا نہ ہوئی کہ معلوم کریں کہ خود کیا ہیں کون ہیں اور ان کو دنیا میں کیا کرنا چاہیے۔ کبھی بھولے سے نہ پوچھا کہ یہ تار برقی کیا ہے یہ بخاری کشتی کیا چیز ہے ریل کیسے بنتی ہے اور چلتی ہے۔

صاحبو! میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب میں اُن لوگوں کا خیال کرتا ہوں جو چراغ لیے شام سے صبح تک "شمسِ بازغہ" کا مطالعہ کرتے ہیں اور کبھی اس بات پر غور نہیں کرتے کہ چراغ کی چمنی نکال دی جائے تو کیوں چراغ دھواں دینے لگتا ہے اور چمنی لگا دینے سے کیوں دھواں موقوف ہو جاتا ہے۔ تُف ہے ایسے حکما پر اور تُف ہے ایسی حکمت پر۔ حکیم وہ ہے جو حوادث اجزائے عالم پر غور کرے نہ کہ اندھوں کی طرح راستہ چلے جن کو منزلِ مقصود سجھائی نہیں دیتی۔

مسلمانوں کا علم فقہ حاوی ہے تمام حقوق بلدیہ اور دولیہ پر۔ پس

چاہیے کہ مردِ فقیہ صدر اعظم یا سفیر کبیر ہو سکے حالانکہ ہم اپنے فقہا کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے گھروں کا انتظام کرنے سے بھی قاصر ہیں۔ اور اپنی نا قابلیت کو قابلِ فخر سمجھتے ہیں۔

علم شریعت درحقیقت حکمت و قوانین سے واقف کرتا ہے اور مختلف احکام کے علل منفعت و مضرت کو ظاہر کرتا ہے لیکن حالت یہ ہے کہ ہمارے شارعین و علما قوانینِ مدنیت کے سمجھنے سے محض عاری ہیں۔ بہر حال ہمارے علما کی حالت ایک باریک فتیلہ کی سی ہے جس پر ایک کمزور شعلہ ٹمٹما رہا ہو جو نہ تو اپنے اطراف روشنی پہنچا سکتا ہے اور نہ دوسروں تک اس کی روشنی پہنچ سکتی ہے۔ عالم اگر حقیقی عالم ہو تو اس کی مثال ایک نور کی سی ہو سکتی ہے کہ جس کی روشنی تمام عالم پر پھیلتی ہے اگر تمام عالم کو منور نہ کرے تو اقلاً اپنے گھر یا اپنے قریہ یا اپنے شہر کو وہ روشن کر سکتا ہے۔ یہ ہمارے علما کیسے ہیں کہ چراغ تلے اندھیرے کی مثال ان پر صادق آتی ہے۔

افسوس اور عجب تو یہ ہے کہ ہمارے علما نے علم کی دو قسمیں قرار دے رکھی ہیں۔ ایک کو علم مسلمانان اور دوسرے کو علم فرنگ کہتے ہیں۔ اور اس طرح بعض مفید علوم کے حاصل کرنے سے لوگوں کو منع کرتے ہیں۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ علم وہ شریف شے ہے جو کسی طریقہ سے مخصوص نہیں... ...... کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ مسلمان ان علوم کو جو ارسطو اور افلاطون سے منسوب ہیں غایت رغبت کے ساتھ سیکھتے ہیں لیکن اگر غالیلہ (گلیلو) اور کپلر کے علوم کی جانب اُن کی توجہ مبذول کرائی جائے تو اُس کو کفر سمجھتے ہیں! حق وہ ہے جو دلیل اور برہان رکھے۔ جو علما علوم اور معارف

کے حاصل کرنے کے لیے منع کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ہم حفاظت اسلام کر رہے ہیں۔ حالانکہ فی الحقیقت وہ اسلام کے دشمن ہیں۔ وہی مسلمان اسلام کے محافظ ہو سکتے ہیں جو علوم و معارف مختلفہ سے آشنا اور واقف ہوں............. الحاصل مسلمانوں کی اصلاح اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ہمارے روسار دین خود اپنی اصلاح نہ کریں اور علوم و معارف سے خود بہرہ ور نہ ہوں۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پہلے خرابی و تباہی ہمارے علمائے دین میں واقعہ ہوئی اور ان سے یہ عام امت میں سرایت کرتی گئی ـ ـ ـ ـ ـ ـ" ؎۵

پھر فرماتے ہیں کہ :-

"......... و باید دانست کہ مراد ما از عالم آں عالم است کہ معارفِ آں گمراہان طریق سعادت را ہادی و رہنما باشد۔ و دانشش دلہائے مردہ را حیات و زندگانی تازہ عطا کند و سخنہایش بیماراں ذل و مسکنت را شفا بخشد۔ و عبارتش چوں مقناطیس اجزائے منتشرہِ امت را جمع کند و حکماتش صیقل دہد نفوس را از کدورت....... نہ آں عالم است کہ در ظلمت کدہ وحشتناک اوہام نشستہ علی الدوام بہ ہمہمہ و دمدمہ مشغول و افساد را اصلاح گمان می کند۔ و خودرا نمی داند و راہ بری دعوی می نماید۔ نہ آں عالمے کہ در گورستان ہائے کہنہ وخشیت گماں ہا و ویرانہ ہائے سہمناک در می دہد و بخرابی و دمار و ہلاک مژدہ می رساند.......نمبر ۵

؎۵ "المعلم" حیدر آباد جلد دو نمبر ۱ ۵۹ "تعلیم و تربیت" "معلم شفیق" جنوری ۱۸۸۴ء

اس کے بعد تعصبِ مذہبی پر یوں تبصرہ فرماتے ہیں کہ:۔

"...... چوں کلام بدیں جا رسید می خواہم بہ ہزار تاسف بگویم کہ مسلمانانِ ہندوستان میل حمایت دین یعنی تعصبِ دینی را بسیار بہ نہج بد بکار بردہ اند کہ موجب بغض علوم و معارف و سبب تنفر از صنائع و بدائع گردیدہ است و چناں گمان کردہ اند کہ انچہ منسوب بہ مخالفین دیانتِ اسلامیہ بودہ باشد باید از روئے تعصب دینی آں را مکروہ و منحوس داشت۔ اگرچہ علوم و فنون بودہ باشد و حال آنکہ از روئے تعصب دینی برایشاں واجب چناں بود کہ ہر جا فضیلتے و کمالے و علمے و معرفتے بہ بینند خود ہا را حق دار وے دانستہ در استحصال آں سعی ہا و کوشش ہا بکار برند و نگزارند کہ مخالفینِ دیانتِ حقہ اسلامیہ در فضیلتے از فضایل و در کمالے از کمالات برایشاں سبقت گیرند۔ افسوس ازیں سوء استعمال تعصب دینی کہ عاقبت آں بہ تباہی و اضمحلال منجر خواہد شد می ترسم کہ سوء استعمال دینی مسلمانانِ ہند بجائے برسند کہ یکبارگی مسلمانان دست از حیات شستہ۔ زندگانی را ترک کنند بجہت آں کہ مخالفینِ ایاتِ اسلامیہ ازیں عالم زندگانی می کنند۔ لاحول ولا قوۃ اِلّا باللّٰہ العلی العظیم..."[نمبر۵]

پھر عنوان قایم فرماتے ہیں:۔ مجہولِ مطلق و معلوم مطلق" اور لکھتے ہیں کہ

"...... آیا عیب نمی باشد از برائے عالمِ دانا و حکیم بینا کہ جمیع عالم را فنونِ جدیدہ و اختراعات نو و انشاءہ تازہ فرا

۵؎ " اسباب حقیقت و سعادت و شقائے انسان" در رسالہ شفیق معلم۔

گرفتہ باشد و عالم از حالے بہ حالے دیگر منقول شدہ باشد و او سر از خوابِ غفلت ندارد آیا لایق است محقق راکہ سخن ہا در مجہول مطلق براند و معلوم مطلق را نداند۔ و در ماہیات موہومہ موشگافی ہا کند و از معرفت امور ظاہرہ باز ماند۔ ایں است مجمل انچہ می خواستم در ایں معنی بیان کنم .... نمبر ۹۲ھ

اُس زمانہ کے ہندوستانی علمائے کرام کے متعلق شیخ کے خیالات ان چند اقتباسات سے بخوبی واضح ہو جاتے ہیں اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج سے پچاس برس پہلے علما کے جس جمود پر شیخ اظہار افسوس کر رہے تھے کم و بیش وہی آج بھی موجود ہے۔ ان باریک فتیلوں سے وہی "کمزور شعلہ" آج بھی ٹمٹا رہا ہے بلکہ چراغ تلے کا اندھیرا اب پہلے سے بھی کچھ زیادہ ہے "ظلمت کدہ وحشتناک اوہام" میں اب بھی بہت سے یہ بزرگ بیٹھے ہوئے ہیں جس طرح شیخ نے انھیں بیٹھے دیکھا تھا "مجہول مطلق" اور "معلوم مطلق" کا بُعد آج بھی اسی قدر ہے جس قدر پچاس سال پہلے تھا۔ مذہبی تعلیم کا طریقہ آج بھی وہی ہے جس پر شیخ معترض تھے۔

مسلمانوں اور ان کے علما کی تنگیٔ نظر کا شکوہ کرتے ہوئے شیخ ایک عالمگیر رابطہ اسلامی کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ

" اس صاف اور ظاہر اصول میں غور و فکر کرنے کے بعد تم کو اس کا سبب معلوم ہو جائے گا کہ مسلمان اتحاد و اتفاق کی اس مذہبی تعلیم و تلقین کے باوجود کیوں ایک مدت سے اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے یا محسوس کرتے ہیں تو اس کی

۹۲ھ۔ "فوائد فلسفہ" در رسالہ معلم شفیق۔

طرف اقدام نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مدت سے ان دینی عقاید کے سوا جو عمل مشترک سے بالکل الگ ہیں اور کوئی جزو ان کے درمیان "جامع" باقی نہیں ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج اُن میں باہمی تعارف تک نہیں اور وہ ایک دوسرے سے بہت بری طرح جدا ہیں۔ اور اُن کا تو کیا ذکر خاص علمائے کرام جن کے فرائض میں عقاید کی حفاظت اور لوگوں کی ہدایت داخل ہے آج ان کا یہ حال ہے کہ ان میں کوئی باہمی مواصلت و مراسلت نہیں۔ ترکی عالم حجازی عالم کے حالات سے بالکل بے خبر ہے ہندی عالم افغانی عالم سے قطعاً غافل ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ایک ہی ملک کے علما بھی باہم کوئی ارتباط و مواصلت نہیں رکھتے۔ پھر جس طرح یہ بیگانگی و جدائی طبقۂ علما میں ہے ٹھیک اسی طرح اسلامی سلاطین و امرا میں بھی ہے۔ کیا یہ تعجب انگیز امر نہیں کہ عثمانی حکومت کی سفارت مراقش میں اور مراقشی حکومت کی سفارت عثمانی حکومت میں نہیں ہے۔ کیا یہ نادر واقعہ نہیں ہے کہ دولتِ عثمانیہ کا کوئی صحیح رابطہ افغانی امارت کے ساتھ نہیں پایا جاتا۔ یہی تفریق اور پراگندہ حالی ہے جس کی بنا پر آج یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت کو دوسری جماعت اور ایک شہر کے باشندوں کو دوسرے شہر کے باشندوں کے ساتھ کوئی علاقہ اور تعلق نہیں ہے آج ان میں ایک ہلکی قسم کا صرف یہ احساس باقی رہ گیا ہے کہ ہاں فلاں ملک اور فلاں شہر میں بھی کچھ لوگ اُن

کے ہم عقیدہ اور ہم مذہب رہتے ہیں۔

.... جب تم قرآنِ مجید کی اُن آیتوں کو غور سے دیکھوگے جن میں بہترین فضایلِ اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے اور پھر مسلمانوں کی اس حرص اور دل بستگی پر غور کروگے جو ان کو کتاب اللہ پر عمل، سنتِ رسول اللہ کی تقلید اور اپنے دین اور مذہب کے احترام اور رسول و اصحاب رسول کی تعظیم کے ساتھ ہے تو تم خود بخود یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جاؤگے کہ اگر علمائے دین اپنے ان وظائف و فرایض کے ادا کرنے پر جو ان پر صاحبِ شرع کے وارث ہونے کی حیثیت سے عاید ہوتے ہیں آمادہ ہو جائیں تو کوئی قوت نہیں جو اُمت اسلامیہ کے احیا اور اس کی فضیلت کے اعادہ کی راہ میں روک بن سکے۔ بے شبہ علمائے راسخین فی العلم اور بالغ نظر مسلمان یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں جو کچھ مصیبتیں مسلمانوں پر آئی ہیں وہ اللہ کی طرف سے ان بے اعتدالیوں کی سزا ہیں جو انھوں نے پچھلے دنوں میں کی تھیں۔ پس علمائے کرام کی ہمت، ان کی غیرت دینی اور حمیتِ ملی سے امید ہے کہ وہ شگاف کے پھیلنے سے پہلے اس کے جوڑنے اور مرض کے مستحکم ہونے سے پہلے اس کے علاج و مداوا کی طرف کافی توجہ کریں گے۔ ان کو چاہیے کہ وہ عام مسلمین کو احکام اللہ اور سنت نبوی کی پیروی پر ابھاریں اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مطابق ان کے باہمی رشتہ اخوت و الفت کو مضبوط و مستحکم

کرنے کی کوشش کریں۔ نیز یہ کہ لوگوں کے قلوب پر جو یاس اور نا امیدی چھاگئی ہے اس کو محو وفنا کرنے کے لیے اپنی تمام جدوجہد کام میں لائیں اور لوگوں کو یہ بتائیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نا امید ہونا انسانی قلب کی ایک بیماری ہے اور اس کے عقاید کی کجی ہے جس سے مسلمان یقیناً ہر طرح پاک اور بے عیب ہیں۔[۵]

مگر شیخ کے خیالات ایک طرف تو مذہبی تعلیم کے رائج الوقت طریقہ کے خلاف اور علمائے وقت سے برگشتہ تھے اور دوسری طرف علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کے بھی موافق نہ تھے۔ وہ مغربی علوم کی تعلیم کو مسلمانوں کے لیے ضروری سمجھتے تھے مگر نہ اس طریقہ سے جو سرسید نے تجویز کیا تھا۔ سرسید احمد خاں اور ان کی تعلیمی تحریک کے متعلق بھی شیخ نے دوران قیام ہندوستان میں جو خیالات وقتاً فوقتاً ظاہر کیے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نہ صرف سرسید کی تعلیمی تحریک پر معترض تھے بلکہ ان کے قومی اور سیاسی اصولوں کے بھی خلاف تھے۔ اور اس قدر خلاف تھے کہ قلم کی انتہائی شدت اور سختی کے ساتھ ان پر تبصرہ کرتے تھے۔ چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں :-

(۱) سرسید اور ان کی قومی تحریک۔ ...... عجب ترین ہمہ امور وغریب ترہمہ چیزہا ایں است کہ جاہلے خود را دانا شمارد وکورے خود را بینا انگارد وخبیث النفسے خویش را مطہر ومقدس پندارد ایں اکمہاں را اگر گوش شنوا بودے می باشد کہ بقوتِ بیان وبفصاحتِ لسان وبعبارات واضحہ وبتقریرات صریحہ وبضروب امثال وبحکایات گزشتہ وحال وبہ انواع کنایات

۵ - معارف مئی ۱۹۲۲ء

و به اصنافِ اشاراتِ حقیقت روشن و ماہیت کُنهش ایشاں را بر ایشاں فہمایند و از فساد طویت و تباہی نیتِ انان را خبردار کرد بلکہ می شد ایشاں را بریں داشت کہ اقرار کنند کہ جمیع حرکات و سکنات وہمہ افکار و نیات ایشاں ناستودہ است وہمہ افعال و اعمالِ آناں موجب تباہی وخرابی است ۔ و ایں کرانِ مادرزاد اگر چشم بودے ممکن بود کہ نقاشان بینا ورسامانِ دانا و پیکر تراشانِ توانا بدست یاری وضاعتِ نیروی و فطانت قبیح و سیرت وشناعت سریرت ذرشتی خصایل و نادرستی خیال و جہالت و ضلالت و حماقت و دنایت ایشاں را بصورتے مصور نمودہ و بہ ہیکلے مجسم گردانیدہ بر ایشاں نشان بدہند تا انکہ ہر حال و قال خود ہا واقف گردند و لے بسیار افسوس بسیار افسوس کہ ایں کورانِ مادرزاد را نہ گوش است نہ ایں کرانِ مادرزاد را چشم ، اگر ایں کوراں وایں کراں را حاسہ لمس می شد البتہ حوادث و آفاتِ دہر و مصائب و بلیات روزگار و دشواری ہا وشکنجہ ہائے زمانہ ایشاں را بہ غیادت و نے عقلے وخباثت و بے ادراکی و شرارت و کج اندیشیٔ خود ہا آگاہ می گردایند ۔ لیکن صد اسف کہ ایں کوراں وکراں چوں عضو مشلول قوت لامسہ ہم ندارند .... و ایں بوزنہ ہا دعوی انسانیت می کنند ..... فساد کار ایں اگھوریاں بخوبی ظاہر نہ شدہ است چوں ظاہرانش مزوق است اندکے صبر باید شراب زہر آلود اولاً مستی می بخشد پس ازاں جگر را پارہ پارہ می کند ۔ اگھوریاں

را یار و صدیقے نیست و طریقت و مذہبے ہم ندارند .... بریں حال باید گریست و لے خندہ مجال نمی دہد و قامت تا چہ، بے شرمی تا کجا ...."[۹۳]

(۲) سرسید کی تفسیر قرآن "........شنیدم کہ شخصے از ایشاں در حالتِ کبرسن و کثرتِ تجربات سیاحت ممالکِ فرنگ را نمودہ و پس از کدو جد بجہت اصلاح مسلماناں تفسیرے بر قرآن نوشتہ است ....ظاہر شد کہ مقصود ایں مفسر ازیں سعی در ازالہ اعتقادات مسلمانان خدمتِ دیگران و تولید و طرق و خول در کیش ایشان است ۔ لاحول ولا "[۹۴]

(۳) سرسید کا اصولِ تعلیم "........اگر یک بچہ ز فرانسہ گرفتہ و بلاد جرمن فرستادہ شود و دراں بلاد آں بچہ تربیتِ استاد قوی، عادت جرمن ہا را فرا گیر و محبت ایشاں در دلِ او متمکن شود و قوم و ملتِ او را در نظرش منفور و حقیر گردد و ایامی تواں چناں گمان کرد کہ آں بچہ خادم و جلہ نفشان امت فرانسویہ است و آیا آں شخصے کہ آں بچہ را بدیں نوع تربیت کرد متیوان آں را محب فرانسہ نامید ...."[۹۵]

اس عبارت میں اگر فرانس کی جگہ ہندوستان اور جرمن کی جگہ انگلستان اور آن شخصے کی جگہ سرسید احمد خاں لکھدیا جائے تو شیخ کا مفہوم صاف

[۹۳] ۔"شرح حال اگھوریان" رسالہ معلم شفیق

[۹۴] ۔"تفسیر و مفسر" اخبار دار السلطنت کلکتہ

[۹۵] ۔"شرح حال اگھوریاں" رسالہ معلم شفیق

اور واضح ہو جاتا ہے۔
آگے لکھتے ہیں۔
(۳) "سرسید اور انگریزی مفاد"......... اللہ۔ اللہ۔ کدام عقل ایں چنیں امرے را تصوّر می کند کہ بیگانہ جنسیت و قومیت دیگراں را قوت و پاسداری بہ دہد کہ می پندارد کہ شخصے خانہ خود را خراب کردہ باوجود آں خانہ دیگرے را تعمیر کند۔ اگر بیگانگاں چیرہ دست آگاہ شوند کہ خانہ از برائے تاسیس جنسیت و تقویت قومیتِ دیگرے برپا شدہ است آیا آں خانہ را از بیخ و بُن کندہ بہ باد فنا خواہند داد و یا آنکہ بنارا محکم و مشید خواہند نمود و معمار آں را خلعتِ فاخرہ دادہ بہ رتبۂ عالیش سرفراز خواہند کرد۔

.... و از برائے اشتباہ کاری و پردہ پوشی در مجمع ہا و محفلہا مقالہ ہائے القامی کردند تا آنکہ دریں روز ہا (زناستودہ مرگ خاں) صبر نمودہ خیر خواہی را تفسیر کرد و مقصد حقیقی ہم قطار ہائے خود تصریح نمود و پردہ از روئے کار برداشت و حل معمی نمود۔ حقیقۃً حقیقۃً ہماں یادگاریکہ یونانیاں از برائے دیو جانس ساختہ بودند باید از برائے ہمیں خیر خواہ نیز ساختہ شود۔ چہ معنی دارد سگ از برائے استحصال استخوانے تملق می کند و دُمے حرکت می دہد و سر بر پائے معطی نہادہ چہ خودے باشد چہ بیگانہ بجہتِ اظہار خلوص نیت روز ہا درمی دہد۔ انسان از سگ ہم کمتر است، لاحول و لا۔ انسان را چناں می زیبد کہ در تملق و خضوع ہزار مرحلہ بہ سگ ہا

بیشی گیرد واگر دُم ندارد ریش ہم کم ازاں نیست ۔ ناستودہؔ مرگ خاں ہمیں نکتہ را فہمیدہ ازاں بود کہ آواز بر آورد ریشے حرکت دار و نان ہائے خوردہ را حلال کرد ۔ خدا کند کہ ایں تشکر سبب مزید نعمت گردد ۔ ......

یہ اقتباسات شیخ کی شعلہ بیانی اور طرزِ استہزا کا ایک ادنیٰ نمونہ ہیں " ستودہؔ مرگ خاں " کے پردہ میں شیخ کے ہدفِ ملامت جو صاحب ہیں وہ سر سید کے خاص احباب اور شرکا کار میں سے ایک تھے ۔ اِن صاحب کے خلاف شیخ نے عروۃ الوثقی میں بھی بہت کچھ لکھا ہے لیکن چونکہ خود شیخ نے ان کا اصلی نام پوشیدہ رکھا ہے اس لیے ضرور نہیں کہ ہم اُس کو بے نقاب کریں ۔ بہر حال جو کچھ شیخ نے ان صاحب کے متعلق لکھا وہ نمونہ ہے اُن خیالات کا جو اس جماعت کے متعلق شیخ رکھتے تھے مثلاً تضحیک و استہزا کا ایک اور نمونہ دیکھیے : .... جمیع مردہا

ہزار سالہ و دو ہزار سالہ و ہمہ استخواں ہا بوسیدہ دریں روز ہا سر از قبرہا درخمہا بر آوردہ و آواز ہا بسیار بلند ندائے الحیات ، البعث ، البعث ، النشور ، النشور ، می زنند ۔ اما اگھوریان خیر خواہ بقوتِ تمام الموت ، الموت ، الہلاک ، الہلاک ، الفنا ، الفنا ، دوامہ می نمایند ۔ بر حال آن قومے کہ خیر خواہ آں اگھوری است بباید گریست ....

ہندوستان میں دو سال کے قریب قیام کر کے شیخ اہلِ ہند کے حالات سے بخوبی واقف ہو گئے تھے ۔ وہ جانتے تھے کہ اِن کا شیرازہؔ قومی کیوں بکھرا

۹۶ء "شرح حال اگھوریاں" رسالہ معلّم شفیق

ہوا ہے۔ کمزوریاں کیا کیا ہیں۔ اور ان کو کس طرح رفع کیا جاسکتا ہے۔ ذاتی طور پر اُن کا عقیدہ تھا کہ کسی قوم کو بیدار کرنے اور اُس کے اندر قومیت کا احساس پیدا کرانے کے لیے جراید اور اخبار کا اجرا بہت ضروری ہے۔ مصر میں وہ اس تدبیر کے کامیاب نتائج دیکھ چکے تھے اور ہندوستان کے موجودہ اخبارات کی زبوں حالی کو بھی اچھی طرح دیکھ رہے تھے۔ اس لیے وقتاً فوقتاً مضامین لکھ کر ہندیوں کو اس طرف توجہ دلاتے رہتے تھے۔ چنانچہ ایسے مضامین کے بعض اقتباسات ہم گزشتہ صفحات میں درج کر چکے ہیں۔

ایک موقعہ پر ہندی نوجوانوں کو اس طرح مخاطب فرماتے ہیں:

.... تم اس سرزمین کے ہونہار ہو جو ایک زمانہ میں قوانین اور آداب کے لیے شہرہ آفاق تھی۔ اور دنیا ان امور میں اس کی خوشہ چینی کرتی تھی۔ مثلاً قوانین ملتِ روما (کوڈ روما) کو دیکھو جو تمام فرنگی کوڈوں کی ماں کہلاتی ہے اس کے اکثر اقوال تمہارے چاروں ویدوں اور شاستر سے لیے گئے ہیں اسی طرح شعر و سخن اور فلسفہ میں تمہارے اسلاف کا وہ درجہ تھا کہ یونانیوں نے اُن کی شاگردی کی۔ مثلاً ایک نامی گرامی شاگرد فیثاغورس گزرا ہے جس نے یونان میں علم و معارف کے وہ سب پھول بکھیرے جو اس نے ہند کے گلشنِ علوم سے چنے تھے۔ خاکِ ہند وہی ہے اور تم نوجوان جو اب موجود ہو اسی مٹی اور پانی کے بنے ہوئے ہو۔ میرے لیے یہ باعثِ مسرت ہے کہ تم خوابِ گراں سے بیدار ہو کر اپنے آباؤ اجداد کے ورثہ کی جانب رجوع اور ان کے بوئے ہوئے درختوں کے پھل چُننے

کے لئے کمربستہ ہوگئے ہو۔۔۔۔۔۔“ ۵ ہ

یہ آخری اقتباس نہ صرف ہندی نوجوانوں کے متعلق شیخ کے خیالات کو واضح کرتا ہے بلکہ ایک بات اور بھی ان الفاظ سے مترشح ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ گو شیخ زیادہ تر اسلام کی خدمت میں مشغول رہے لیکن جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے وہ ہندو اور مسلمان کے درمیان کوئی امتیاز قایم نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اپنا "پیام" یکساں دونوں قوموں کے سامنے پیش کرتے تھے اور از راہِ تعصب مذہبی ہندو قوم کی قدیم تہذیب اور روایات کو نظر انداز نہ کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہندوستان کی قسمت ہندو اور مسلمانوں دونوں کی بیداری اور ترقی سے وابستہ ہے۔ اس نکتہ کو انھوں نے عروۃ الوثقیٰ کے بعض مضامین میں بھی اچھی طرح واضح کیا ہے

ہندوستان میں شیخ کی اقامت کے یہ دو سال اسی قسم کی مصروفیت میں گزرے اور حتی الامکان شیخ سیاسی جدوجہد سے بالکل الگ رہے یا کم از کم بہت اعتدال کے ساتھ تھوڑا بہت کام کرتے رہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مصر سے خارج البلد ہو جانے کے بعد ہی اس ملک کی سیاسیات سے شیخ کے تعلقات خطرناک سمجھے جا رہے تھے۔ چنانچہ ۸۲ء میں جب مصر میں قومی تحریک نے ایک انقلابی صورت پیدا کی اور فلاحین کے اندر ایک عام بیچینی رونما ہوئی جس کے رہنما اور نمایندے اعرابی پاشا تھے تو ہندوستان میں برطانوی حکومت کی نظریں شیخ پر پڑنے لگیں۔ اعرابی پاشا خود فلاحین میں سے تھے اور بہت ادنیٰ حیثیت سے ترقی کر کے وہ بالاخر وزارت جنگ کے اعلیٰ عہدہ تک پہنچے تھے۔ اس زمانہ میں اعرابی سے زیادہ کوئی شخص مصری

۵ہ اقتباس از تقریر در کلکتہ۔ (اخبار دار السلطنت)

قوم میں ہر دلعزیز نہ تھا اور وہ گوکہ شیخ کے تلامذہ میں سے نہ تھے لیکن فلاحین کی اُسی تحریک کا ثمر نورس تھے جو شیخ نے پیدا کی تھی ۔

۸۲-۱۸۸۱ء میں جب بلنٹ مصر گئے تو انھوں نے اعرابی کی تحریک کو بہت تقویت پہنچائی لارڈ کرومر نے لکھا ہے کہ:۔

"انھوں نے (بلنٹ نے) اپنی شاعرانہ فطرت کی وجہ سے اپنے کو پورے جوش و خروش سے اعرابی کی تحریک میں ڈالدیا۔ اور وہ اعرابی کے دوست مشیر۔ رہنما۔ فلاسفر اور شریک کار بن گئے۔ مسٹر بلنٹ نے دیکھا کہ جس تحریک سے اُن کا واسطہ پڑا ہے وہ کسی حد تک بلاشبہ ایک قومی تحریک ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" ؎

اعرابی چونکہ خود ایک فوجی آدمی تھا اس لیے اس کی تحریک فوج میں سب سے زیادہ کارگر ہوئی اور انگریزی "دخل" کے لیے فوجی اثرات کا مصری معاملات پر حاوی ہونا بہت ہی دہشتناک تھا۔ اعرابی اور ان کی جماعت کی وجہ سے فوج میں بےچینی پیدا ہوچکی تھی اور ہر طرف سے یہ مطالبہ کیا جارہا تھا کہ سرکاری محکموں اور خصوصاً فوج میں سے یورپین عنصر کو خارج کیا جائے۔ دول اور خصوصاً برطانیہ اور فرانس کے درمیان اس صورتِ حالات پر قابو پانے کے متعلق مشورے ہو رہے تھے اور آخر کار جنوری ۱۸۸۲ء میں ان دونوں حکومتوں کی طرف سے وہ متفقہ یادداشت مصری حکومت کو بھیجی گئی جو اسکندریہ کے بلوہ اور طلل الکبر کے ہنگامہ کی اصلی بنیاد تھی۔ اس یادداشت میں برطانوی اور فرانسیسی "دخل" کو زیادہ موثر اور قوی کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ فوج اور پولیس اور مالیات

؎ ۔ مصر جدید۔

کو کلیتاً برطانوی اور فرانسیسی نگرانی میں لینے کی تجویز ایسی نہ تھی جس کو مصری قوم پرست ایک لمحہ کے لیے بھی قبول کر سکتے۔ دارالامراء میں زیادہ تر ایسے لوگ موجود تھے جو فوج کے زیر اثر تھے اور خود اعرابی وزیر فوج تھا۔ خدیو توفیق اس وقت قوم پرستوں کے اثر سے باہر اور دوسری طرف ملا ہوا تھا لیکن علانیہ اعرابی کی مخالفت کرتے ڈرتا تھا۔ اُسی زمانہ میں اعرابی کو پتہ چلا کہ اس کے قتل کرنے کی سازش کی گئی ہے اور اُس سازش میں فوج کے کچھ افسران بھی شامل ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ گرفتار کر لیے گئے۔ فوجی عدالت نے ان لوگوں کو خارج البلد کیے جانے کا حکم دیا لیکن خدیو نے برطانوی اور فرانسیسی حکومت کے مشورہ کے مطابق ان افسران کی سزائیں تخفیف کر دی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وزارت اور خدیو کے درمیان تعلقات منقطع ہو گئے۔ فوجی جماعت میں اس وقت ایک گروہ ایسا موجود تھا جو خدیو کو معزول کر کے مصر میں ایک جمہوریہ قایم کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اعرابی پاشا کے متعلق فرانس اور برطانیہ نے یہ طے کر لیا کہ ان کو جس طرح ہو سکے مصر سے نکال دیا جائے۔ چنانچہ مئی ۱۸۸۲ء میں سرکاری طور پر یہ مطالبہ مصری گورنمنٹ سے کیا گیا کہ اعرابی فوراً مصر سے چلے جائیں۔ اور وزارت استعفیٰ دیدے۔ وزارت نے استعفیٰ دیدیا لیکن خدیو کو ایک تحریر بھیجی جس میں اُس پر صاف صاف یہ الزام لگایا گیا کہ اس نے دول کے مطالبات کو قبول کر کے اپنے وعدوں کے خلاف اجنبی قوم کی مداخلت کو منظور کر لیا ہے۔ اب تمام ملک میں ایک آگ لگ چکی تھی اور ہر طرف سے مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ اعرابی کو وزارتِ جنگ کے عہدہ پر بحال کیا جائے۔ حتیٰ کہ ۲۸ مئی کو تمام مذاہب کے پیشوا اور علما کا ایک وفد خدیو کے پاس گیا

اور مطالبہ کیا کہ اعرابی کا وزارتِ جنگ کے عہدہ پر دوبارہ تقرر کیا جائے۔ بمشکل خدیو نے اس مطالبہ کو منظور کیا۔ لیکن خدیو کا فیصلہ فرانس اور انگلستان کے منشا کے خلاف تھا۔ اس لیے اب اعرابی کی قوت کو بزورِ شمشیر توڑنے کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ لارڈ کرومر اعرابی کے دوبارہ تقرر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ :-

"تاہم انجام اب دور نہ تھا اور ہر روز یہ امر زیادہ واضح ہوتا جاتا تھا کہ سوائے فوجی قوت کے اور کسی طرح اعرابی کو دبایا نہ جا سکیگا۔ اور یہ کہ اگر کوئی دوسرا فوجی قوت استعمال کرنے پر راضی نہ ہوگا تو پھر انگلینڈ ہی کو یہ کام کرنا پڑے گا......." ۵

دو تین مہینہ کے اندر مصر کے حالات میں عجیب انقلاب پیدا ہوا۔ ملکی اور غیر ملکیوں کے درمیان سخت کشمکش پیدا ہوگئی اور وسط جون تک ۱۴ ہزار عیسائی مصر سے ترکِ اقامت کرکے جا چکے تھے اور چھ ہزار اور جہازوں کے انتظار میں تیار تھے۔ بعض مقامات پر ملکی اور غیر ملکی عناصر کا تصادم بھی ہو چکا تھا۔ جولائی میں انگلستان نے فیصلہ کیا کہ اپنی بحری اور فوجی طاقت اعرابی کے خلاف استعمال کرے۔ چنانچہ اسکندریہ پر برطانوی جہازوں نے گولہ باری کرکے اس کے استحکامات کو منہدم کر دیا اور مصری فوج کو شہر خالی کر دینا پڑا۔ لیکن تمام شہر میں بلوہ ہوگیا اور کئی دن تک شہر کے مختلف حصوں میں آگ لگی رہی۔ بالآخر برطانوی فوج نے اسکندریہ پر قبضہ کر لیا اور یہ سب کچھ جس وقت ہو رہا تھا اس وقت قسطنطنیہ میں سلطان ترکی جن کی سیادت مصر پر ابھی برائے نام قایم تھی اور قاہرہ میں خدیو جو مصر کے

---

۵ - مصر جدید۔

حاکم کہے جاتے تھے عضوِ معطل ہو گئے تھے۔ اسکندریہ پر گولہ باری کرنے کے بعد برطانوی فوج نے اعرابی پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اعرابی نے اپنے اہلِ ملک کے نام ایک اعلان شائع کیا جس میں اُس نے لکھا کہ۔

"مصریوں اور انگریزوں کے درمیان ایک ناقابلِ صلح جنگ جاری ہے اور وہ تمام لوگ جو اس وقت اپنے ملک کے ساتھ دغا بازی کریں گے نہ صرف فوجی قانون کے مطابق سخت ترین سزا کے مستوجب ہوں گے بلکہ دنیا میں آیندہ ہمیشہ کے لیے ملعون ہو جائیں گے......." ؎

القصہ ۱۳ ستمبر کو طل الکبیر پر وہ آخری معرکہ پیش آیا جس نے اعرابی اور مصر کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ اعرابی کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار کر لیا گیا۔ اور بقول لارڈ کرومر کے یہ ثابت ہو گیا کہ۔

"مصریوں کے لیے جو پالیسی اعرابی نے ۱۸۸۲ء میں اختیار کی وہ ایسی تھی کہ نہ وہ اُس وقت قابل عمل تھی نہ اب ہے" ؎

اعرابی کی گرفتاری اور جلا وطنی کے ساتھ ہی مصر کی یہ ملکی پالسی ختم ہو گئی اور اس طرح انگلستان کو مصر میں نہ صرف ایک فوجی بلکہ ایک سیاسی فتح حاصل ہوئی۔ جس وقت مصر میں یہ واقعات پیش آ رہے تھے شیخ کو دفعتاً حیدر آباد سے انگریزی نگرانی میں کلکتہ پہنچا دیا گیا۔ اور وہ وہاں نظر بندی کی حالت میں رکھے گئے۔ بلنٹ اپنے روزنامچہ میں شیخ کی نظربندی کا بڑا سبب یہ بتاتا ہے کہ۔

"۱۱ ستمبر کو قصر عابدین کے سامنے جو قومی مظاہرہ ہوا تھا اس کے سلسلہ میں اعرابی نے فخریہ یہ کہ دیا تھا کہ وہ ہندوستان میں بھی انگریزوں

؎ ۔ مصر جدید ۔ از کرومر ؎ ۔ مصر جدید ۔ از کرومر

کے خلاف بغاوت کرا سکتا ہے۔"

اعرابی کے اس قول کے معنی غالباً یہ سمجھے گئے کہ شیخ کے ذریعہ سے مصری قوم پرست ہندوستان میں بھی انگریزوں کے خلاف بغاوت کرانے کی فکر میں ہیں۔ اسی اندیشہ کی بنا پر شیخ کلکتہ میں اُس وقت تک نظر بند رکھے گئے جب تک کہ مصر میں شورش ختم نہ ہو گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کی نظر بندی محض سرکاری نگرانی سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ وہ نہ کسی جیل میں رکھے گئے نہ سرکاری مہمان تھے بلکہ حاجی مرزا عبدالکریم شیرازی کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے اور بہ ظاہر آزادی کے ساتھ لوگوں سے ملتے جلتے رہتے تھے۔ صحیح طور پر یہ معلوم نہیں کہ وہ کس قدر عرصہ تک کلکتہ میں مقیم رہے بہر حال مصر میں شورش ختم ہو جانے کے بعد شیخ کو کلکتہ سے روانگی کی اجازت مل گئی۔

اغلباً آخر ۱۸۸۲ء میں شیخ کلکتہ سے روانہ ہوئے لیکن اس وقت سے ۱۸۸۳ء کے موسم بہار تک جب وہ لندن پہنچے اُن کی نقل و حرکت کا صحیح پتہ نہیں چلتا۔ بلنٹ لکھتا ہے کہ مفتی عبدہ نے بیان کیا کہ ہندوستان سے شیخ پہلے امریکہ گئے اور وہاں سے لندن۔ بعض دوسرے سوانح نگاروں نے بھی یہی قیاس کیا ہے کہ وہ پہلے امریکہ گئے جہاں انھوں نے امریکن قومیت حاصل کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئے۔ مرزا لطف اللہ خاں کا بیان بھی مبہم ہے۔

"از ہند بہ امریکہ رفت یا ابتدا بہ لندن می رود۔"

ایک دوسرا سوانح نگار لکھتا ہے کہ۔

"و پس از اقامت یک چند روز بہ نیت رفتن امریکہ از ہندوستان

جدا شدہ اما بعد ہا از رفتن امریکہ ہم صرف نظر کردہ بہ لندن رفت۔ [۴]

لیکن ایک زیادہ تفصیلی بیان "تاریخ افغانستان" کے مترجم کاہر جو اپنے والد کے حوالہ سے (جو شیخ کے شاگرد تھے) لکھتے ہیں کہ:

"نظربندی سے آزاد ہوکر سید صاحب ۱۲۹۹ھ ہجری میں کابل روانہ ہوئے اور تقریباً چار ماہ وہاں رہے۔

امیر عبدالرحمن خاں نے آپ کی بڑی قدر کی کیونکہ سیّد صاحب نے گذشتہ جنگوں میں ان کے بھائی محمد اعظم خاں کی مدد کی تھی۔ سید صاحب چاہتے تھے کہ افغانی حکومت دستوری اصول پر قائم کی جائے لیکن امیر صاحب چونکہ دستوری حکومت کا قیام پسند نہ کرتے تھے اس لیے انھوں نے سید صاحب سے کہا کہ افغانستان ایک چھوٹا ملک ہے مناسب ہے کہ کسی بڑی اسلامی سلطنت میں دستوریت کی بنیاد ڈالی جائے۔ جب سید صاحب کو افغانستان میں کامیابی نہیں ہوئی تو وہ ہندوستان کے راستہ سے یورپ روانہ ہوئے۔ قیام کابل کے زمانہ میں میرے والدِ محترم پہلی بار ان سے ملے اور چار ماہ تک ایک شاگرد کی حیثیت سے ان کے ساتھ رہے۔ پھر والد صاحب ہندوستان آئے اور سید صاحب سے دوبارہ بمقام گوالیار ملاقات ہوئی۔ پانچ چھ روز گوالیار میں ٹھہرنے کے بعد سید صاحب گنہ گئے اور وہاں سے سیپر اور بیورہ ہوتے ہوئے سیہور آئے اور ایک روز سیہور قیام کرکے دوسرے دن بھوپال آئے۔ اس سفر میں جمال الدین ایک پیر کی حیثیت سے رہے۔ گوالیار میں بہت سے لوگوں کو اپنا مرید بنایا۔ بھوپال میں قاضی عبدالحق صاحب کے مہمان رہے۔ پھر بمبئی کا قصد کیا اور وہاں سے

---

[۴] "جریدہ مصورہ" مطبوعہ ثبات استانبول۔

سیدھے لندن روانہ ہوئے۔ زمانۂ قیام بھوپال میں آپ کی کچھ شہرت نہیں ہوئی کیونکہ اس زمانہ میں وہاں جماعت اہل حدیث کا بہت زور تھا اور اُس عہد کے ظاہربیں اشخاص جمال الدین جیسے مدبّر کے اقوال سمجھنے کی قابلیت نہ رکھتے تھے۔ لہٰذا سید صاحب نے خاموشی سے یہ سفر ختم کر دیا ....
یہ تمام واقعات ۱۲۹۹ھ ہجری کے ہیں ...."

اس بیان کی تصدیق کسی دوسرے بیان سے نہ ہو سکی۔ لیکن چونکہ دوسرے وقائع نگاروں نے شیخ کے متعلق اس زمانہ کے واقعات قلمبند نہیں کئے۔ اس لیے صرف یہی ایک بیان ہے جس سے کلکتہ اور لندن کے درمیانی زمانہ کے متعلق کچھ تفصیلات حاصل ہوتی ہیں۔ راوی غیر معتبر نہیں ہیں۔ اور جس طرح انھوں نے خود اپنے والد کے شیخ سے ملنے اور شیخ کے بھوپال آنے کا تذکرہ کیا ہے اُن کا طرزِ بیان قرینِ قیاس ضرور معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال اگر یہ بیان صحیح ہے تو شیخ نے افغانستان اور ہندوستان کا ایک آخری سفر کیا اور اس کے بعد پھر وہ مغرب سے مشرق کی طرف کبھی واپس نہ آئے۔ بلکہ زندگی کے اختتام تک ان کی آواز مغربیوں کے سیاسی مرکزوں پر بلند ہوتی رہی۔ افغانستان ہندوستان اور مصر کے حالات سے مایوس ہو کر اب وہ چاہتے تھے کہ وہاں کچھ کام کریں جہاں مشرقی اقوام کی قسمت کے فیصلے کئے جاتے ہیں!

دور ثالث و آخر

Veuilly, je vous prie, être
l'interprète de mes respectueux
hommages ainsi que de ceux
du Cheick Mohamed Abdo
auprès de Madame Blunt.

A vous.

جمال الدين الحسيني الافغاني

لندن و پیرس

۱۸۸۳ء کے موسم بہار میں شیخ لندن پہنچے لیکن وہ وہاں کچھ زیادہ عرصہ نہ ٹھہرے بلکہ چند ہی روز ٹھہر کر دنیا کے سیاسی مہاجرین کی اُس جائے پناہ کو چلے گئے جس کا نام پیرس ہے۔ وہ طے کر چکے تھے کہ پیرس میں بیٹھ کر اسلامی ممالک کی آزادی کے لیے پروپیگنڈہ کریں گے۔ یہ ناممکن تھا کہ شیخ کسی جگہ جاتے اور خاموش بیٹھ رہتے۔ چنانچہ پیرس کے روزناموں اور رسالوں میں شیخ کے مضامین وخیالات کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوگیا اور بہت جلد اُن کا نام اہل علم وسیاست کی محفلوں میں لیا جانے لگا۔ عالم فرانسوی رینانؔ نے اسی زمانہ میں اسلام کے متعلق ایک بحث چھیڑی تھی۔ شیخ کب چپ رہنے والے تھے۔ اُن کے جوابات "ژورنل دی با"
اور ریویو سائینٹفک میں شائع ہوئے۔ اس وقت فرانس کی علمی دنیا میں یہ دو پرچے چوٹی کے پرچے سمجھے جاتے تھے۔ شیخ کے مضامین کی انھوں نے بہت قدر کی۔ شیخ نے اپنے مضامین میں مغربی دنیا کے سامنے اسلام کے متعلق

ے۔ دیکھو ضمیمہ

گویا ایک نیا زاویۂ نظر پیش کیا ؎

بحث کا موضوع رینان کا یہ دعویٰ تھا کہ اسلام کی تعلیمات جدید سائنس و علوم کے عمل کے مخالف ہیں۔

رینان نے ۲۹ر مارچ ۱۸۸۳ء کو پیرس کی سوربون ر دار الفنون میں فرانس کی سائنٹفک ایسوسی ایشن کے روبرو وہ لیکچر دیا تھا جو اس بحث کی بنیاد قرار پایا۔ ان کا عنوان "اسلام اور علم" تھا رینان نے اس لیکچر میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ "ابتدا میں گو کہ اسلام نے اسلامی ممالک میں سائنس کی ترقی کو نہیں روکا مگر بعد کو اس نے علوم کی تحریک کو سرسبز نہ ہونے دیا بلکہ اس کو سخت نقصان پہنچایا۔" شیخ نے ژورنل دی بامیں رینان کے اس بیان کی تردید کی اور ثابت کیا کہ اس باب میں اسلام سے زیادہ خود عیسائیت کا طرزِ عمل قابلِ اعتراض ہے۔ رینان نے جواب الجواب میں لکھا کہ "اگرچہ کہ دونوں مذاہب میں سائنس کے خلاف اسپرٹ موجود تھی تاہم عیسائی ممالک نے کسی حد تک اپنے تئیں اُس اسپرٹ سے آزاد کرا لیا مگر اسلام ایسا کرنے سے قاصر رہا۔ گو یہ امید ہے کہ روشن خیال مسلمان بالآخر اس قسم کی آزادی حاصل کرلیں گے۔"

رینان کا وہ لیکچر اور بعض دوسرے علما کا جواب اور جواب الجواب اردو زبان میں بھی شائع ہو چکا ہے لیکن اس رسالہ کے مؤلف کو بھی شیخ کا وہ جواب دستیاب نہ ہو سکا جس میں رینان کے خیالات پر تنقید کی گئی تھی اور جس کے

؎ "اسلام اور علم" کے عنوان سے شیخ کے یہ مضامین کالمان لیوی نے تصانیف رینان کے مجموعہ میں شائع کئے ہیں۔ نیز رینان کا لیکچر اور شیخ کے جوابات حسن آفندی عاصم نے بزبان عربی مصر میں شائع کئے۔

جواب میں رینان نے شیخ کے منصفانہ اور عالمانہ طرزِ استدلال کا اعتراف کیا تھا۔ بہر حال رینان کے آخری جواب کا ایک اقتباس اس بحث کے بعض اہم اجزا کو واضح کر دیتا ہے۔ رینان لکھتا ہے کہ۔

"ایک حیرت انگیز ذہانت کے افغانی شیخ نے اپنے اثنائے قیام پیرس میں میرے خطبہ پر رسالہ دیبا کی اشاعت مئی ۱۸۸۳ء میں بعض اعتراضات کیئے ہیں جن کا جواب دوسرے ہی دن اسی رسالہ میں میں نے دیا تھا جو حسب ذیل ہے۔"

"سوربون میں میری پچھلی تقریر پر شیخ جمال الدین نے نہایت منصفانہ اعتراضات کیئے ہیں جو اُس دل چسپی کے ساتھ جس کے یہ مستحق ہیں پڑھے گئے۔ اس روشن خیال ایشیائی کے ضمیر کو اس کے اصلی اور مخلصانہ مظاہر میں مطالعہ کرنے کے لیے اس سے زیادہ سبق آموز طریقہ اور کوئی نہیں ہے۔ چاروں طرف سے عقلیت کی تائید میں بالکل مختلف صداؤں کو سُننے سے آدمی اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اگر مذہب انسانوں کو متفرق کر سکتا ہے تو عقل ان کو متحد کرنے والی ہے۔ نفسِ انسانی کا اتحاد ایک زبردست اور اطمینان بخش نتیجہ ہے جو ٹھنڈے دل سے غور و فکر کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ جب کہ اِن نام نہاد مافوق الفطرۃ الہامات کے معاندانہ دعوے تہ کر کے ایک کونے میں رکھ دیے جائیں۔ مذہبی جوش اور توہمات کے خلاف تمام دنیا کے متدین فلاسفہ اور عقلا کی جماعت دراصل ایک ناقابلِ درک اقلیت ہے۔ لیکن یہی جماعت ہمیشہ قایم رہنے والی ہے۔ کیونکہ یہ صداقت پر مبنی ہے

اور اس کا انجام آخر میں کامیابی اور فتح و نصرت ہو گا جب کہ اُن کے مخالفین کے اساطیر ایک طویل حالت تشنج میں ختم ہو کر رہجائیں گے۔

تقریباً دو مہینے پیشتر شیخ جمال الدین سے میری ملاقات ہوئی جس کے لیے میں اپنے رفیق ایم۔ نامتم کا ممنون ہوں اور زیادہ تر اُن ہی کے ساتھ میری گفتگو نے مجھے اپنے لکچر کے لیے علمی روح اور مذہب اسلام کے باہمی تعلق کا موضوع انتخاب کرنے پر آمادہ کیا۔ شیخ جمال الدین ایک افغانی ہیں جو اسلام کے تعصب سے یکسر خالی اور تمامتر مبرا ہیں۔ وہ ہندوستان کی سرحد بالائی ایران کی اُن طاقتور نسلوں میں سے ہیں جن میں اسلام کے سطحی لباس کے اندر آرین روح اب تک پوری قوت کے ساتھ جھلک رہی ہے۔ یہ اس صداقت کا زبردست ثبوت ہے جس کا ہم نے کئی بار اظہار کیا ہے کہ مذاہب کی قدر و قیمت کا اندازہ اُن نسلوں کی قدر و قیمت سے کرنا چاہیے جو ان مذاہب کو اختیار کیے ہوئے ہوں۔ ان (شیخ) کی آزاد خیالی اُن کی شریفانہ اور وفادارانہ خصلت نے ان کی موجودگی میں مجھے یقین دلایا کہ میرے پرانے ملاقاتیوں میں سے ایک ابن سینا ایک ابنِ رشد یا ان زبردست ملحدین میں سے جو پانچ صدیوں تک نفسِ انسانی کی نمایندگی کرتے رہے ہیں کوئی ایک دوبارہ زندہ ہو کر میرے سامنے آگیا ہے۔ یہ تضاد مجھے خاص طور پر اُس وقت نظر آیا جب کہ میں نے ایران کے علاوہ دوسرے اسلامی ممالک کے مشاہدہ سے اس حیرت انگیز مشابہت کا مقابلہ کیا۔ ان ممالک کی (جہاں علمی (سائنٹیفک) اور فلسفیانہ شوق اِس

قدر نایاب شئے ہے، مذہبی فتوحات کے خلاف نسلی احتجاج کی ایک بہترین مثال شیخ جمال الدین ہے جو ایسے موقع پر پیش کی جاسکتی ہے۔ وہ ان باتوں کی تصدیق کرتے ہیں جو یورپ کے مستشرقین نے بار بار کہی ہیں۔ یعنی یہ کہ جاپان کو چھوڑ کر صرف افغانستان ہی تمام ایشیا میں ایک ایسا ملک ہے جو اکثر ان ترکیبی عناصر کا حامل ہے جس کو ہم ایک قوم کہتے ہیں۔

شیخ کے فاضلانہ مضمون میں مجھے صرف ایک نقطہ نظر آتا ہے جس پر ہمیں صحیح طور پر اختلاف ہے۔ یعنی ان عظیم الشان مجموعہ واقعات میں جن کو فتوحات اور سلطنتیں کہتے ہیں تاریخی تنقید کی بنا پر ہم جو امتیازات کرتے ہیں اُن کو شیخ تسلیم نہیں کرتے۔ سلطنت رومہ نے جو کئی باتوں میں عربی فتوحات کے ساتھ مشترک تھی لاطینی زبان کو سولھویں صدی تک تمام مغربی دنیا میں نفسِ انسانی کا آلہ بنا دیا۔ البرٹس اعظم راجر بیکن اور اسپینوزا نے جو کچھ لکھا ہے وہ لاطینی زبان میں ہے بایں ہمہ وہ ہمارے نزدیک لاطینی نہیں۔ انگریزی ادبیات کی تاریخ میں بیڈ . . . اور آلکوین . . . . کا جو درجہ ہے وہی درجہ فرانسیسی ادب میں گریگوری آف تورس اور ابیلارڈ کو حاصل ہے۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ ہم تاریخ تمدن میں رومہ کے کارنامہ کو بہ نسبت عربوں کے کچھ کم سمجھتے ہیں۔ مگر ضرورت اِس بات کی مقتضی ہے کہ انسانیت کے ان مآخذ کا تجزیہ کیا جائے۔ جو کچھ لاطینی زبان میں لکھا گیا ہے اس میں رومہ کی عظمت نہیں ہے اور جو کچھ یونانی زبان میں قلمبند

کیا گیا ہے وہ ہیلانی کا کارنامہ نہیں کہا جاسکتا۔ اسی طرح جو کچھ کہ عربی میں تحریر کیا گیا ہے وہ عربوں کی پیداوار نہیں ہے جو کچھ کہ عیسائیت نے ملک و وطن کے لیے کیا ہو وہ عیسائیت کا نتیجہ نہیں ہے۔ اسی طرح جو کچھ اسلامی ممالک میں کیا گیا ہو وہ اسلام کا ثمرہ نہیں ہے۔ یہ ایک اصول ہے جس کو اسلامی اندلس کے مورخ کامل موسیو رینہارڈ ڈوزی نے جس کے ماتم میں اس وقت یورپ کا علمی طبقہ سوگوار ہے نہایت عقلمندی سے چسپاں کیا ہے۔ امتیازات کے یہ طریقے نہایت ضروری ہیں اگر ہم تاریخ کو غلط فہمی اور عدم صحت کی ایک گتھی نہ بنانا چاہتے ہوں۔

میری ایک بات جو شیخ کو غیر منصفانہ معلوم ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ میں نے اس خیال کو مکمل صورت میں پیش نہیں کیا یعنی یہ کہ تمام الہامی مذاہب علوم ثابتہ (سائنس) کی مخالفت پر مجبور ہیں اور اس لحاظ سے عیسائیت کو اسلام کے مقابلہ میں زیادہ مفتخر ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ گلیلو کے ساتھ کیتھولک مذہب نے ایسا مشفقانہ برتاؤ نہیں کیا جیسا کہ اسلام نے ابن رشد کے ساتھ کیا۔ گلیلو نے ایک کیتھولک ملک میں اس مذہب کی موجودگی میں صداقت کو پالیا جیسا کہ ابن رشد نے ایک اسلامی ملک میں اسلام کی موجودگی میں عمدگی سے فلسفیانہ غور و خوض کیا۔ اگر میں نے اس نقطہ پر زیادہ زور نہیں دیا تو سچ پوچھیے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے خیالات اس معاملہ میں اس قدر آشکارا ہو چکے ہیں کہ مجھے ایسے لوگوں کے سامنے جو

میری آراء سے بخوبی واقف ہیں اس کو دہرانے کی ضرورت نہ تھی۔ میرا قول جس کے اعادہ کی بار بار ضرورت نہیں ہے یہ ہے کہ نفس انسانی کو اگر اپنے ہی لازمی عمل کے لیے جدوجہد کرنا ہے تو اس کو مافوق الفطرۃ عقاید سے دور رہنا چاہیے۔ جو علوم ثابتہ کی تعمیر و ترکیب ہے۔ اس سے مراد کوئی شدید تخریب یا متعجلانہ شکست و ریخت نہیں ہے نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ ایک عیسائی عیسائیت اور ایک مسلمان اسلام کو خیرباد کہہ دے۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ عیسائیت اور اسلام کے روشن خیال طبقے ایک ایسی رواداری اختلاف کی حالت پر آجائیں کہ جس سے مذہبی عقاید میں کوئی ہرج واقع نہیں ہوتا۔ تمام عیسائی ممالک میں تو یہ مقصد نصف کے قریب حاصل ہو چکا ہے۔ اور ہمیں امید کرنی چاہیے کہ اسلام میں بھی یہی حالت رونما ہو جائے گی۔ اور اس روز میں اور شیخ متحد الخیال ہو کر ایک دوسرے کو مبارک باد دیں گے۔

میں نے یہ نہیں کہا کہ تمام مسلمان بلا امتیاز نسل سب کے سب جاہل ہیں اور ہمیشہ جہالت میں غرق رہیں گے۔ البتہ میں نے یہ کہا ہے کہ اسلام سائنس کے راستہ میں بڑی مشکلات پیدا کر دیتا ہے اور بدقسمتی سے وہ پانچ چھ صدیوں تک اپنے زیر اقتدار ممالک میں اس کو دبا دینے میں کامیاب بھی رہ چکا ہے۔ نیز یہ کہ ان ممالک کے لیے یہی سبب انتہائی تنزل کا ہے۔ میں یقیناً اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ اسلامی ممالک میں احیاء علوم اسلام کی وجہ سے نہ ہوگا بلکہ یہ اسلام کی کمزوری ہی سے ظہور

پذیر ہوگا جیسا کہ بالتحقیق عیسائی ممالک میں ازمنۂ وسطیٰ کے جابرانہ کلیسا عیسوی کی بربادی ہی زبردست ترقی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی بعض لوگوں کو میرے خطبہ میں یہ خیال مذہب اسلام کے حلقہ بگوش افراد کے خلاف نظر آیا ہے لیکن یہ کسی طرح سے صحیح نہیں ہے۔ در اصل خود مسلمان پہلے پہل مذہب اسلام ہی کے زخم خوردہ ہیں۔ میں نے ایک سے زائد مرتبہ اپنی سیاحت کے دوران میں ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو عوام الناس کو جابرانہ اقتدار کے ساتھ مذہبی تحکّم میں رکھتے ہیں۔ لہٰذا مسلمان کو اس کے مذہب سے علیحدہ کرنا اس کی ایک بہت بڑی خدمت ہوگی۔ ان اسلامی آبادیوں کو جن میں کئی عمدہ عنصر موجود ہیں اسلام کے جوئے سے سبکدوش کرنے کی خواہش رکھنے سے میں نہیں مانتا کہ مجھے ان کی جانب کوئی معاندانہ خیال ہے اور چونکہ شیخ جمال الدین چاہتے ہیں کہ میں مختلف مذاہب کا آپس میں توازن بھی قایم رکھوں تو میں ہرگز تسلیم نہیں کر سکتا کہ میں یورپین ممالک کا بدخواہ ہوں اگر میں یہ خواہش ظاہر کروں کہ عیسائیت کا اقتدار ان پر سے کم ہو جائے ......

ان مختلف نقاط پر آزاد خیالوں میں کوئی شدید اختلاف نہیں ہے۔ کیونکہ خواہ اسلام کے موافق ہو یا نہ ہو لیکن سب کے سب اسی علمی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مسلمانوں میں اشاعت تعلیم کی ضرورت ہے اور یہ بالکل صحیح ہے۔ اگر تعلیم سے سیرۃ کی وہ سنجیدہ تعلیم مراد لی جائے۔ جس سے عقل کی تربیت ہوتی ہے اگر اسلام کے مذہبی مقتدا اس بہترین کام میں حصہ لیں گے تو مجھے بڑی مسرت ہوگی۔

لیکن صاف صاف کہوں تو مجھے شبہ ہے کہ وہ ایسا نہ کریں گے۔ ممتاز شخصیتیں جن میں شیخ جمال الدین جیسی نامور ہستیاں بہت تھوڑی ہوں گی ایسی نکلیں گی جو اسلام سے اپنا تعلق ترک کردیں گی جیساکہ ہم نے اپنے تئیں مذہب کیتھولک سے علیحدہ کرلیا ہے۔ وقت آنے پر بعض ممالک مذہب قرآنی کے ساتھ ہاتھ سے نکل جائیں گے لیکن مجھے شک ہے کہ احیائے علوم کی تحریک سرکاری طور پر اسلامی امداد کے بغیر حاصل ہوسکے۔ یورپ کی احیائے علیہ کبھی کیتھولک مذہب کی امداد سے نہیں ہوئی اور اس وقت بھی ــــ اور ہمیں تعجب کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے ــــ کیتھولک مذہب بنی نوع انسان کی عقلیت کے مکمل حصول کے خلاف یعنی نام نہاد الہامی عقاید سے علیحدہ ایک غیر جانبدارانہ حالت کے خلاف جدوجہد کررہا ہے۔

ایک اعلیٰ قانون کے طور پر انسانوں کے لیے آزادی اور عزت کو سب پر مقدم رکھنا مذاہب کو نہ مٹانا بلکہ فطرت انسانی کے آزادانہ مظاہر کے طور پر ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا۔ ان کی تصدیق نہ کرنا اور زیادہ تر یہ کہ اُن کے معتقدین کے خلاف جو ان مذاہب کو ترک کرنے پر آمادہ ہوں ان کی مدافعت نہ کرنا یہ سب باتیں متمدن سوسائٹی کے فرائض میں داخل ہیں۔ اسی طرح ادبیات یا ذوق طبیعت کی مانند مذاہب کو آزادانہ مطالعہ کے لیے پیش کرنے سے ان کی تبدیل ہیئت ہوجائے گی اور اس طرح وہ سرکاری اور مادی قیود سے آزاد ہوجانے کے بعد بالکل علیحدہ ہوکر اپنی خامیوں کا بہت سا حصہ کم کردیں گے۔ بالفعل اگرچہ یہ سب

پذیر ہوگا جیسا کہ بالتحقیق عیسائی ممالک میں ازمنۂ وسطیٰ کے جابرانہ کلیسا عیسوی کی بربادی ہی زبردست ترقی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی بعض لوگوں کو میرے خطبہ میں یہ خیال مذہب اسلام کے حلقہ بگوش افراد کے خلاف نظر آیا ہے لیکن یہ کسی طرح سے صحیح نہیں ہے۔ در اصل خود مسلمان پہلے پہل مذہب اسلام ہی کے زخم خوردہ ہیں۔ میں نے ایک سے زائد مرتبہ اپنی سیاحت کے دوران میں ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو عوام الناس کو جابرانہ اقتدار کے ساتھ مذہبی تحکّم میں رکھتے ہیں۔ لہٰذا مسلمان کو اس کے مذہب سے علیحدہ کرنا اس کی ایک بہت بڑی خدمت ہوگی۔ ان اسلامی آبادیوں کو جن میں کئی عمدہ عنصر موجود ہیں اسلام کے جوئے سے سبکدوش کرنے کی خواہش رکھنے سے میں نہیں مانتا کہ مجھے ان کی جانب کوئی معاندانہ خیال ہے اور چونکہ شیخ جمال الدین چاہتے ہیں کہ میں مختلف مذاہب کا آپس میں توازن بھی قایم رکھوں تو میں ہرگز تسلیم نہیں کر سکتا کہ میں یورپین ممالک کا بدخواہ ہوں اگر میں یہ خواہش ظاہر کروں کہ عیسائیت کا اقتدار ان پر سے کم ہو جائے ......

ان مختلف نقاط پر آزاد خیالوں میں کوئی شدید اختلاف نہیں ہے۔ کیونکہ خواہ اسلام کے موافق ہو یا نہ ہو لیکن سب کے سب اسی علمی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مسلمانوں میں اشاعت تعلیم کی ضرورت ہے اور یہ بالکل صحیح ہے۔ اگر تعلیم سے سیرۃ کی وہ سنجیدہ تعلیم مراد لی جائے۔ جس سے عقل کی تربیت ہوتی ہے اگر اسلام کے مذہبی مقتدا اس بہترین کام میں حصہ لیں گے تو مجھے بڑی مسرت ہوگی۔

لیکن صاف صاف کہوں تو مجھے شبہ ہے کہ وہ ایسا نہ کریں گے۔ ممتاز شخصیتیں جن میں شیخ جمال الدین جیسی نامور ہستیاں بہت تھوڑی ہوں گی ایسی نکلیں گی جو اسلام سے اپنا تعلق ترک کردیں گی جیساکہ ہم نے اپنے تئیں مذہب کیتھولک سے علیحدہ کرلیا ہے۔ وقت آنے پر بعض ممالک مذہب قرآنی کے ساتھ ہاتھ سے نکل جائیں گے لیکن مجھے شک ہے کہ احیائے علوم کی تحریک سرکاری طور پر اسلامی امداد کے بغیر حاصل ہو سکے۔ یورپ کی احیائے علیہ کبھی کیتھولک مذہب کی امداد سے نہیں ہوئی اور اس وقت بھی ــــ اور ہمیں تعجب کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے ــــ کیتھولک مذہب بنی نوع انسان کی عقلیت کے مکمل حصول کے خلاف یعنی نام نہاد الہامی عقاید سے علیحدہ ایک غیر جانبدارانہ حالت کے خلاف جدوجہد کررہا ہے۔

ایک اعلیٰ قانون کے طور پر انسانوں کے لیے آزادی اور عزّت کو سب پر مقدم رکھنا مذاہب کو نہ مٹانا بلکہ فطرت انسانی کے آزادانہ مظاہر کے طور پر ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا۔ ان کی تصدیق نہ کرنا اور زیادہ تر یہ کہ اُن کے معتقدین کے خلاف جو ان مذاہب کو ترک کرنے پر آمادہ ہوں ان کی مدافعت نہ کرنا یہ سب باتیں متمدن سوسائٹی کے فرائض میں داخل ہیں۔ اسی طرح ادبیات یا ذوق طبیعت کی مانند مذاہب کو آزادانہ مطالعہ کے لیے پیش کرنے سے ان کی تبدیل ہیئت ہو جائے گی اور اس طرح وہ سرکاری اور مادی قیود سے آزاد ہو جانے کے بعد بالکل علیحدہ ہوکر اپنی خامیوں کا بہت سا حصہ کم کردیں گے۔ بالفعل اگرچہ یہ سب

خیالی باتیں معلوم ہوتی ہیں لیکن مستقبل میں یہ سب سچی ثابت ہوں گی۔ آزادی کے دور میں ہر مذہب جو بہت سے عمل اور ردِ عمل کے بعد انسانی سوسائیٹیوں پر اپنا تسلط جمانے والا ہوگا وہ کیونکر اسی طرح مرکب حالت میں رہ سکے گا۔ اس مسئلہ پر چند سطروں میں بحث نہیں ہوسکتی۔ میں نے اپنے خطبہ میں صرف ایک تاریخی مسئلہ کو چھیڑنا چاہا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ جمال الدین نے متعدد دلائل پیش کئے ہیں۔ میرے ان دو اصولی نظریوں کی تائید میں کہ۔

۱۔ اپنی پچھلی نصف زندگی میں اسلام نے علمی تحریکات کو اسلامی سرزمین میں پیدا ہونے سے نہیں روکا۔

۲۔ بعد کی نصف زندگی میں اس نے اپنی بدقسمتی سے اپنی ملکی حدود میں علمی تحریک کا گلا گھونٹ دیا۔......"

رینان کے جواب الجواب کے اس قدر طویل اقتباس کو پیش کرنا اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ اول تو اس بحث کی تنقیحات کسی قدر واضح ہوجائیں جن کے متعلق یورپ کے ایک بہت بڑے عالم اور فیلسوف کے نظریات کی شیخ نے تردید کی تھی اور نیز اس لیے بھی کہ شیخ کے علم و فضل کے متعلق یورپ کے ایک بہت بڑے عالم کے خیالات کا ایک عکس ناظرین دیکھ لیں۔ شیخ کے علم و فضل کی یہ اقبالمندی ناقابلِ انکار ہے کہ یورپ میں قدم رکھتے ہی شیخ کا پہلا مقابلہ رینان جیسے صاحب علم و فضل سے ہوا۔ اور اس مقابلہ میں حریف کو شیخ کی فضیلت کا اقرار کرنا پڑا۔

اس بحث کے سلسلہ میں اخبار السیاسہ (مصر) کی اشاعت مورخہ

۲۲ ، مارچ ۱۸۸۳ء کا ایک مضمون بھی ہماری معلومات میں کسی قدر اضافہ کرتا ہی - جریدہ مذکور نے رینان اور جمال الدین افغانی " کے عنوان سے اُن مطالب پر بحث کی ہی جو مشرق و مغرب کے اُن دو فیلسوف علما کے درمیان زیرِ تنقید رہے - لیکن مندرجہ بالا اقتباس کو پیش کر دینے کے بعد اب اِس مضمون کے مزید اقتباسات کو نقل کرنے کی ضرورت نہیں -

القصہ اس میں شک نہیں کہ فرانس کے سب سے بڑے عالم اور فلسفی سے شیخ کے اس مباحثہ نے ان کی شخصیت پیرس کے علمی حلقوں میں بہت جلد نمایاں کر دی -

لیکن جو خیال شیخ کو پیرس لایا تھا اس کی تکمیل ایک سال کی کوششوں کے بعد ہو سکی - بعض شہادتیں اس امر کی موجود ہیں کہ شیخ کو اپنے کام کے لیے مصر اور ہندوستان سے مالی امداد مل رہی تھی لیکن یہ معلوم کرنا مشکل ہی کہ کون لوگ امداد دے رہے تھے - تاہم ہندوستان کے متعلق تو یہ قیاس بیجا نہیں کہ زیادہ روپیہ ان کو حیدر آباد سے ملتا ہوگا - شیخ خود جس بے سرو سامانی کی حالت میں تھے وہ ظاہر ہی - یورپ میں یا ترکی و ایران میں اس وقت تک ان کے اثرات ایسے نہ تھے کہ وہاں سے کوئی معقول امداد مل سکتی اُن کی نظر کے سامنے ایک وسیع میدان عمل تھا - اور یقیناً اس کام کے لیے انھوں نے اپنے تمام ممکن ذرایع سے روپیہ فراہم کیا ہوگا -

شیخ کے پیرس پہنچنے کے چند ہی روز بعد اُن کے رفیق اور شاگرد مفتی عبدہ بھی وہاں پہنچ گئے نیز نوجوان سعد زاغلول بھی اُسی زمانہ میں پیرس آگئے تھے ، اور پھر شیخ کے ایک خاص معاون اور شریک کار مرزا باقر ایرانی لندن سے شیخ کے پاس چلے آئے - اس طرح پیرس میں شیخ کے گرد و پیش ایک

معقول جماعت جمع ہوگئی۔ اس جماعت میں زیادہ تر اسلامی ممالک کے وہ قوم پرست مہاجرین تھے جو اپنے ممالک سے نکالے گئے تھے یا بھاگ آئے تھے۔ شیخ نے اب عروۃ الوثقیٰ کے نام سے ایک انجمن قائم کی جس کے ماتحت انھوں نے اپنا ہفتہ وار جریدہ عروۃ الوثقیٰ جاری کیا۔ پروفیسر براؤن نے لکھا ہے کہ عروۃ الوثقیٰ کا پہلا پرچہ مئی ۱۸۸۴ء میں شایع ہوا۔ مگر میرے پاس اُس کا پہلا پرچہ اور آٹھ[۱] اور اصل پرچے موجود ہیں جو مجھے اتفاقاً بلنٹ کے کتب خانہ میں مل گئے تھے۔ اِن پرچوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عروۃ الوثقیٰ کا پہلا پرچہ ۱۳ مارچ ۱۸۸۴ء کو شایع ہوا۔ اس جریدہ کے اصلی پرچے اب تقریباً ناپید ہیں۔ اکتوبر ۱۸۸۴ء میں اٹھارہ پرچوں کی اشاعت کے بعد ہی یہ اخبار بند ہوگیا۔ لیکن ان اٹھارہ پرچوں نے بھی یورپ اور ایشیا کے بہت سے دفاتر خارجہ اور قنصل خانوں کی نیندیں خراب کر دیں۔

جن اغراض و مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر عروۃ الوثقیٰ جاری کیا گیا تھا اُن کی تشریح خود شیخ ہی کے الفاظ میں دیکھنی چاہیے:۔

"جب کسی قوم میں ضعف اور غفلت کا غلبہ ہوتا ہے تو کوئی اجنبی قوم اُس پر برسرِ اقتدار ہو جاتی ہے۔ تاآنکہ اُس کا ظلم بے پناہ اس قوم کے اندر ایک روحِ تازہ پیدا کر دیتا ہے۔ اور وہ محسوس کرتی ہے کہ اس کی گئی ہوئی قوت پھر حاصل کی جا سکتی ہے

---

[۱] جو پرچے میرے پاس ہیں اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ ۱۳ مارچ ۲۰ مارچ ۲۷ مارچ ۳ اپریل ۵ جون ۱۹ جون ۱۰ جولائی۔

[۲] عروۃ الوثقیٰ کے مضامین کتابی شکل میں حسین محی الدین الجبال ایڈیٹر ابابیل نے ۱۹۱۰ء میں مصر سے شایع کیے۔

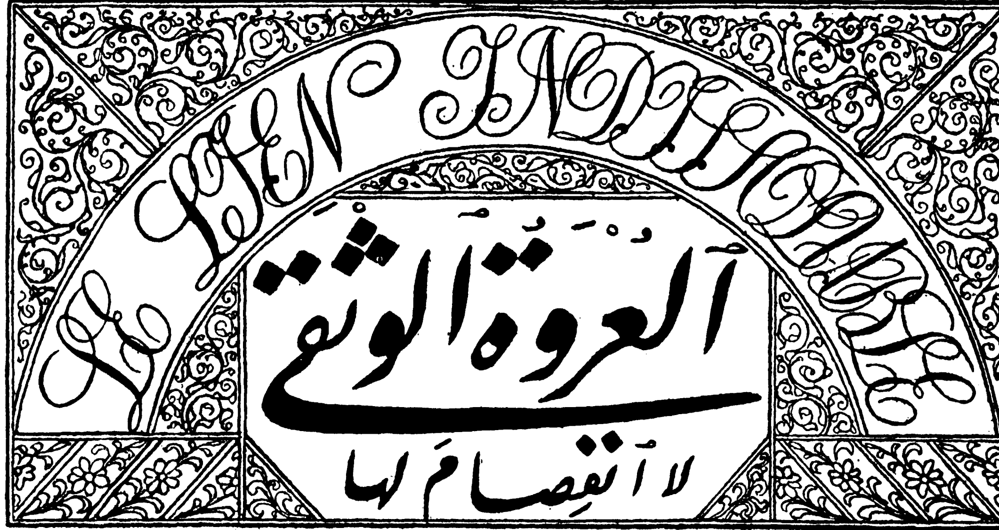
العدد الاول — السنة الاولى

مدير السياسة
جمال الدين الحسيني الافغاني
DIRECTEUR POLITIQUE
GEMAL-ED-DIN EL-AFGHAN

ترسل الجريدة الى جميع الجهات الشرقية مجانا

قد عينت اجرة للبريد خمسة فرنكات في السنة لمن تسمح بها نفسه





جريدة سياسية ادبية

تصدر يوم الخميس

المحرر الاول
الشيخ محمد عبده
REDACTEUR EN CHEF
CHEICK MOHAMED ABDO

من شاء ان يبعث الينا بتحارير او رسائل في اي موضوع كان رغبة نشرها في الجريدة او التنبيه على امر مهم فليرسلها الى ادارة الجريدة بهذا العنوان
6, rue Martel, à Paris



يوم الخميس في ١٠ جمادى الاول سنة ١٣٠١ — ١٣ مارس سنة ١٨٨٤

بسم الله الرحمن الرحيم . ربنا عليك توكلنا واليك انبنا واليك المصير. هذا ما تمده العناية الالهية من قول الحق متعلقا باحوال الشرق وعلى الله المتكل فى نجاح العمل .

خفيت مذاهب الطامعين ازمانا ثم ظهرت . بدات على طرق ربما لاتنكرها الانفس ثم التوت . اوغل الاقوياء من الامم في سيرهم بالضعفاء حتى تجاوزوا بيداء الفكر وسحروا البابهم حتى اذهلوهم من انفسهم وخرجوا بهم عن محيط النظر وبلغوا بهم من الضيم حدا لاتحتمله النفوس البشرية .

ذهب اقوام الى مايسوله الوهم ويغري به شيطان الخيال التي تنبعث لدفع ما لايطاق اذا قام بتدبيرها قيم عليها ومدبر لسيرها لايكفي في توقيف سريانها او محو آثارها قهر ذاك القيم واهلاك ذلك المدبر فان العلة ما دامت موجودة لاتزال آثارها تصدر عنها فان ذهب قيم خلفه آخر اوسع منه خبرة وانفذ بصيرة . نعم يمكن تخفيف الاثر او ازالته بازالة علته ورفع اسبابه

جرت عادة الامم ان تانف من الخضوع لمن يباينها في الاخلاق والعادات والمشارب وان لم يكلفها بزائد عما كانت تدين به لمن هو على شاكلتها فكيف بها اذا حملها ما لاطاقة لها به . لا ريب انها تستنكره وان كانت تسكبره وكلما عقولها وشدوا عليها بما لاتألفه فحارت البابها والزموها بما ليس في قدرتها فاستعصت عليه قواها وخضدوا من شوكة الوازع تحت اسم العداله ليهيئوا بكل ذلك وسيلة لنيل المطمع فكانت الحركة العرابية العشواء فاتخذوها ذريعة لما كانوا له طالبين فاندفع بهم سيل المصاعب بل طوفان المصائب على تلك البلاد وظنوا بلوغ الارب ولكن اخطاء الظن وهموا بمالم ينالوا

لم تكد تخمد تلك الحركة في بادى النظر حتى خلفتها حركة اخرى وفتح باب كان مسدودا وقام قائم بدعوة لها المكانة الاولى في نفوس المسلمين بل هى بقية آمالهم ولا ندري الان ماذا تستعقبه هذه الحركة الجديدة وربما يوجد من يدري ان

اگر اتحاد و اتفاق سے کام لیا جائے اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو بظاہر عسیر الحصول ہو۔

نفوس انسانی کی خاصیت کچھ ایسی ہے کہ پہلے تو وہ ظلم و قہرمانیت کو برداشت کرتے ہیں لیکن جب یہ چیز حد سے تجاوز کرجاتی ہے تو بالآخر کوئی نہ کوئی راہ خلاص کی نکال ہی لیتے ہیں۔ یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں کہ آج ہم تمام مشرق میں بیداری کی ایک لہر پاتے ہیں۔ عہدِ حاضر میں ہر قوم آزادی چاہتی ہے ہر شخص غلامی کی گرفت سے نجات چاہتا ہے۔ چنانچہ ہر عقلمند آدمی کا مرکز توجہ اس وقت یہی ہے کہ وہ جلد از جلد کسی صورت سے ساری قوم کو ایک شیرازہ میں منسلک کر دے۔ مشرقی اقوام پر اِس وقت ظلم و عدوان کی انتہا ہو چکی ہے ہر مظلوم قوم پیکرِ غربت بنی ہوئی ہے۔ بالخصوص مسلمانوں کی حالت تو اور زیادہ ناگفتہ بہ ہے کہ اُن کے سلاطین باعظمت تختِ حکومت سے محروم کردیے گئے ہیں۔ اور اُن کے باعزّت لوگ ذلیل کرائے گئے ہیں۔ اُن کی شان و شوکت والے ارباب علم و دانش کی تحقیر کی جاتی ہے۔ اُن کے غنی فقیر کر دیے گئے ہیں۔ تندرست و توانا لوگ لنگڑے لولے اور اپاہج کر دیے گئے ہیں۔ ان کے شیر نیستاں چوپایوں سے بدتر ہوگئے ہیں۔ خصوصاً اس پانچ سال کے عرصہ میں یہ سلسلہ حوادثِ بالا جو تخم پاشی ہوئی ہے وہ تو خوب ہی ہے۔ لیکن انشااللہ وہ جنھوں نے یہ تخم پاشی کی ہے پھل ایسا پائیں گے جو اُن کے طرزِ عمل کی مکافات ہوگا یعنی اس نخلِ بے ثمر سے اگر وہ پائیں گے تو اندراین۔

مصر اس وقت جس دور سے گزر رہا ہی مسلمانانِ عالم اُسے بہ آسانی برداشت نہیں کر سکتے۔ مصر مسلمانوں کے نزدیک ایک مقدس مقام ہی ان کے دلوں میں اس کی خاص وقعت اور عزت ہی اُسے بجا طور پر حرمین شریفین کا دروازہ کہا جاسکتا ہی۔ تو اگر یہ دروازہ محفوظ ہو تو ظاہر ہی کہ مسلمان مطمئن رہیں گے اور اگر ایسا نہ ہو تو اُن کے افکار میں اضطراب پیدا ہوگا اور انھیں شبہ ہوگا کہ آیا مسلمانوں کے اس رکنِ عظیم کی سلامتی خطرہ میں تو نہیں ہی...... یہ حرص وہوا کے ٹھیکہ دار یہ قومیں جہاں جاتی ہیں رفق اور محبت کے لہجہ میں باتیں کرتی ہیں۔ رفتہ رفتہ ان میں حاکمانہ اسپرٹ کا اظہار ہوتا ہی۔کہیں وہ تختِ حکومت کے حفاظت کے لیے جاتی ہیں۔کسی ملک کو اغیار و اجانب کی دست برد سے آزاد کرانے کے لیے،کہیں کسی ملک کو اور زیادہ مضبوط اور مستحکم کرنے کے لیے، کہیں بغاوت کے جراثیم پر حملہ کرنے جاتی ہیں۔غرضیکہ جب کہیں جاتی ہیں، تو طرز ان کا یہی ہوتا ہی اور پھر وہ اس طرح چھا جاتی ہیں.......لیکن ان بندگانِ حرص کی آنکھیں حرص نے بند کر رکھی ہیں۔ انھوں نے کانوں میں روئی ٹھونس رکھی ہی کہ آہستہ آہستہ ہندوستان و مکہ سے آزادی کی جو آواز آرہی ہی اس کو نہیں سُن سکتے۔ان آخری ایام میں مشرقی ممالک کے اہم مقامات پر جو یکساں مصیبتیں نازل ہوئی ہیں اُن کی وجہ سے ان ممالک کے تمام باشندوں میں باہمی ربط و اتحاد کی تجدید ہوگئی ہی اور اس وقت مشرقی ممالک کے متفرق و مختلف اور دور و دراز مقامات کے رہنے والے ایک دوسرے سے زیادہ

قریب اور متحد ہو گئے ہیں۔ ہر جگہ ارباب فہم بیدار ہو چکے ہیں جنھوں نے ان کو موجودہ حالت تک پہنچا دیا ہے اور بقدر امکان اُن کے رفع اور ازالہ کی فکر بھی ان کو دامن گیر ہے۔ وہ اپنے ربط و اتحاد وسعی و کوشش کی بنا پر اس کے امیدوار ہیں کہ شاید کھوئی ہوئی قوت و شوکت کو ایک دفعہ پھر پالیں اور موجودہ حوادث میں اُن کو اپنے دین و مذہب شرف وقار اور ننگ و ناموس کی حفاظت کا کوئی موقعہ ہاتھ آئے وہ موجودہ وقت کو ایک مغتنم فرصت سمجھتے ہیں اور اسی سے ان کی امیدیں قایم ہیں۔ ان کے دلوں میں ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال نہیں کھٹکتا کہ بغیر کسی عمدہ نتیجہ کے یہ وقت اور موقعہ ہاتھ سے جاتا بھی رہے تو پھر غیب سے اس قسم کے بیسیوں اور مواقع پیدا ہو جائیں گے۔ اس وقت مختلف مشرقی ممالک بالخصوص بلاد ہند و مصر میں اس مقصد جلیل کے حصول کے لیے متعدد جماعتیں قایم ہو چکی ہیں۔ جو ہر ممکن طریقہ سے ذرائع کامیابی کی تلاش اور جستجو میں سرگرم و مصروف ہیں۔ نہ وہ سعی و عمل سے تھکتی ہیں اور نہ اپنی کوششوں میں کوئی کمی کرتی ہیں اگرچہ اس راہ میں اُن کو اُن تمام انتہائی خطرات سے دوچار ہونا پڑے جو انسانی زندگی کو پیش آسکتے ہیں۔۔۔۔"

اس تمہید کے ساتھ وہ اپنے اغراض و مقاصد اور لائحۂ عمل کو یوں بیان کرتے ہیں۔

"یہ رسالہ بقدرِ امکان مشرقی قوموں کے لیے ان ضروری کاموں کو صاف صاف بیان کرے گا جن میں کسی طرح بھی کمی کرنا

اُن کی بربادی اور کمزوری اور تباہی کا سبب ہی اور اُن راستوں کی طرف علانیہ رہنمائی کریگا جن پر چلنا تلافی مافات کے لیے از حد ضروری ہی نیز۔ آیندہ مشکلات سے عہد برآ ہو سنے کی صورتیں پیش کریگا۔ یہ رسالہ مشرق کے اعلیٰ طبقوں کی نگاہوں پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرے گا اور اُن شبہات اور وہموں کو دور کرے گا جن کی وجہ سے ہدایت اور کامیابی کا راستہ ان پر ملتبس ہو گیا ہی اُن کے اُن وسوسوں کو رفع کرے گا جن کی بنا پر وہ مرض کے علاج و شفا کی طرف سے مایوس ہو چکے ہیں اور عام طور پر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ مصیبت اپنی انتہا کو پہنچ گئی اور تدارک اور تلافی کا زمانہ گزر گیا۔

یہ رسالہ سمجھائے گا کہ تمام مشرقی قوموں کے لیے باہمی امداد اور اعانت کا طریقہ نہایت ضروری ہی اور یہی اُن کے سیاسی روابط اور وطنی تعلقات کا محافظ ہو سکتا ہی اس لیے کہ اسی طریقہ کے فقدان کا یہ نتیجہ ہی کہ آج قوی نے ضعیف کو دبالیا ہی۔

یہ رسالہ اعداء مشرق کی محبت اور خیرخواہی کی اس منقش چادر کو جو رنگا رنگ ملاطفت اور نرم خوئی سے رنگین ہی چاک کرکے جو کچھ پسِ پردہ ہی اس کو علانیہ دکھا دے گا اور حریص و طماع مغرب مشرق کی تاریکیٔ غفلت میں آہستہ آہستہ جس مخفی راہ سے چل رہا ہی اس پر کافی روشنی ڈالے گا۔

یہ رسالہ اس کی خاص کوشش کرے گا کہ مشرقی قوموں پر جو غلط الزام لگائے جاتے ہیں اور خاص کر مسلمانوں پر جو جھوٹے

تہمتیں لگا کر ان کو بدنام کیا جاتا ہے ان کی اچھی طرح پردہ دری کرے۔ اور اصلی حقیقت کو سمجھائے۔ نیز بعض ناواقفوں کے اس خیال کی تردید کرے گا جو یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان کبھی ترقی وتمدن کے برکات سے اس وقت تک مستفید نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ انھیں اصولوں پر کاربند رہیں گے جن پر آج سے سینکڑوں برس پہلے کاربند ہوکر ان کے اسلاف نے فائدہ اٹھایا تھا۔

یہ رسالہ تمام مشرقی اقوام کو سیاسی حوادثِ عامہ سے باخبر کرنے کی ہر وقت کوشش کرے گا اور اُن کے متعلق سیاسی جماعتیں جو طرزِ عمل اختیار کرتی رہیں گی اُن کے انکشاف اور پردہ دری سے غافل نہ ہوگا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام مشرقی قوموں کے باہمی تعلقات کی تقویت اور استحکام اور ان کے افراد میں باہمی محبت والفت کی تلقین کی خاص طور پر رعایت رکھے گا اور اُن کے منافع مشترکہ کی تائید وحفاظت کو اپنا سب سے بڑا فرض سمجھیگا۔"

یہ خیالات اور منصوبے تھے جو عروۃ الوثقیٰ کی اشاعت کا باعث ہوئے۔ اس زمانہ میں شیخ بہت عسرت کی حالت میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور Rue de Seize میںؔ ایک اوپر کی منزل کے کمرے میں جس کا عرض و چار پانچ گز سے زیادہ نہ تھا محمد عبدہ کے ساتھ رہتے تھے۔ اس خلوت میں استاد وشاگرد اپنے مقاصد کے متعلق کیا کیا مشورے نہ کیا کرتے ہونگے! چند مصری مہاجرین شیخ کے گرد وپیش رہتے تھے۔ انگلستان میں تنہا ایک بلنٹ اُن کا

ے۔ عروۃ الوثقیٰ کی پانچ اشاعتوں کے بعد محل ادارت تبدیل کر دیا گیا اور غالباً شیخ بھی کسی دوسرے مکان میں منتقل ہو گئے۔

دوست ہم خیال اور مشیر تھا۔ پیرس میں ایسا بھی کوئی دوست نہ تھا۔

عروۃ الوثقیٰ کے مضامین نے پہلے ہی دن سے ایک ہل چل مچا دی۔ یورپ کے مدبرین اس کے عادی نہ تھے۔ کہ خود انھیں کے دروازے پر بیٹھ کر کوئی شخص ان سے احتساب کرے۔ غیر ملکوں میں وہ اِس قسم کی شورش کو بہ آسانی دبا سکتے تھے لیکن اپنے آزاد ملک میں اس قسم کی نکتہ چینی کو بند کرنا اُن کے لیے آسان نہ تھا۔ نہ صرف لندن و پیرس میں بلکہ مصر اور دیگر اسلامی ممالک میں بھی یہ آواز سنی گئی اور خود یورپ کے اخبارات میں عروۃ الوثقیٰ کے مضامین نقل کیئے جانے لگے۔

عروۃ الوثقیٰ کی پیشانی پر ایک طرف شیخ کا نام اور دوسری طرف مفتی عبدہ کا نام شائع ہوتا تھا۔ اور اس طرح دونوں کی شخصیت شانہ بہ شانہ میدان عمل میں آئی تھی اور مصریوں کے لیے ان دونوں ناموں کا یکجا ہونا ایک اہم سیاسی معنی رکھتا تھا شیخ کی جماعت کے جو لوگ ابھی مصر میں موجود تھے انھوں نے عروۃ الوثقیٰ کے مضامین کی تشہیر کرنی شروع کی اور چند ہی روز میں وہاں عام احساسات کی یہ حالت ہوگئی کہ گویا مفتی عبدہ اور شیخ خود مصر میں موجود ہیں۔ چنانچہ بہت جلد مصر میں عروۃ الوثقیٰ کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ اس واقعہ کے متعلق خود شیخ نے جو خیالات عروۃ الوثقیٰ کے صفحات پر ظاہر کیے ان کا مختصر اقتباس اس موقعہ پر نقل کر دینے کے قابل ہے:-

"مجلس نے مصر میں عروۃ الوثقیٰ کے داخلہ کو ممنوع قرار دیا اور اسی فیصلہ کے مطابق سرکاری اعلان میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ جس شخص کے پاس اس رسالہ کا کوئی پرچہ پایا جائے گا اس پر ۵ سے ۲۵ گنّی تک جرمانہ کیا جائے گا۔ ہم ایک لمحہ کے لیے

بھی یہ خیال نہیں کر سکتے کہ کسی مصری رکن کی با اختیار آزاد رائے
نے یہ فیصلہ کیا ہو بلکہ ہم خدیوِ مصر کی ذات سے بھی ایسی امید
نہیں رکھتے اور ہمارے وہم میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ کوئی
مصری خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلمان بلکہ کوئی مشرقی جو مصر میں
قیام پذیر ہو اس حکم میں عدل و انصاف کا شایبہ تک پاتا ہو۔
یہ کس طرح ہو سکتا ہے کیونکہ اس رسالہ نے مصری حقوق کی محافظت
اور مدافعت کا حق ادا کیا ہے۔ ہر معاملہ میں مصریوں کی امداد و
اعانت کی ہے اور مصر کے دشمنوں کی امیدوں کو ناکام کرنے کی
سعی اور کوشش کی ہے۔ اس رسالہ کا مشرب زید کی مدح اور
عمر کی عیب جوئی نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد نہایت ارفع اور اعلیٰ
ہے۔ اس کی کوششیں اس پر صرف ہوتی ہیں کہ مشرقی قوموں کے
سینوں میں باہمی بغض اور عداوت کے جو شعلے بھڑک رہے ہیں
ان پر نصیحت اور مصالحت کا پانی ڈال کر ان کو اخلاص اور
محبت سے بھر دے۔ وہ ابنائے مشرق سے یہ التماس کرتا ہے کہ
باہمی نزاع اور اختلاف کے ہتھیار ڈال دیں اور اس عام مصیبت
کے مقابلہ میں جو سب کے لیے یکساں تباہ کن ہوگی اتحاد اور
اتفاق کے اسلحہ سے مسلح ہو کر صف بستہ ہو جائیں۔ وہ یہ چاہتا
ہے کہ گھر کے آیندہ اندرونی انتظامات کی فکر سے پہلے خود گھر کی
حفاظت کرنا چاہیے۔ ابتدا سے عروۃ الوثقیٰ کا یہی عمل ہے۔ پھر
کیونکر ایک لمحہ کے لیے عاقل انسان یہ تصور کر سکتا ہے کہ مشرق
کا کوئی فرد خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم ایک ایسے مفید رسالہ کو اپنے

ملک میں داخل ہونے سے روک دے گا۔ ہم یقینی طور پر یہ جانتے ہیں کہ یہ سب اسی قوت کا کرشمہ ہے جو اس وقت مصر پر مسلط ہے اور وزارتِ مصر نے جو کچھ کیا ہے وہ انگریزی عمالِ حکومت کے جبر و دباؤ سے کیا ہے.........."

عروۃ الوثقیٰ کے صفحات پر یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ شیخ جو "پیام" مشرق کو دے رہے تھے اُس کے مخاطب تنہا مسلمان ہی نہ تھے۔ بلکہ وہ نہ صرف اسلامی ممالک بلکہ تمام ایشیائی ممالک کو اور نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ مشرق کے تمام غیر مسلموں کو بھی یکساں دعوت دے رہے تھے اور شیخ کے پیام کی یہ وسعت درحقیقت کسی خاص مغربی قوم کی مخالفت پر مبنی نہ تھی۔ رنگ و نسل کا کوئی تعصب ان کے اندر نہ تھا۔ بلکہ وہ ہمدردی بنی نوع انسان کے ایک مشترک مرکز پر کھڑے ہو کر ساری دنیا کو آزادی امن اور صلح کا پیام دے رہے تھے۔ ان کا زاویۂ نظر یہ نہ تھا کہ اتحاد اسلامی کے ذریعہ سے مغرب کے خلاف کوئی جارحانہ تحریک پیدا کی جائے بلکہ ان کی تحریک ایک تحریک دفاع تھی اور ان کا اتحاد اسلامی صرف اتحاد اسلامی نہ تھا بلکہ یورپین ملوکیت کے خلاف ایک مستحکم اتحاد مشرق تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ مشرق اور مغرب کے درمیان نسل و رنگ کے ادنیٰ تعصبات کا پیدا کر دینا دونوں میں سے کسی کے لیے بھی مفید نہیں۔ نہ وہ اپنی تحریک کو کسی ایک مذہب کے دایرہ میں محدود کر کے دوسرے مذاہب کو شکایت کا موقعہ دینا چاہتے تھے۔ شیخ کا نام اکثر اُسی اتحادِ اسلامی سے وابستہ کیا جاتا ہے جس کی آواز کبھی کبھی ترکی یا حجاز وغیرہ میں بلند کی جاتی تھی لیکن شیخ کی زندگی اور ان کے اقوال کا بغور مطالعہ کیجئے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ شیخ کی نظر ایک وسیع تر میدان اپنے سامنے

رکھتی تھی۔ وہ مذہب کی بنیاد پر محض اسلام کے داعی نہ تھے بلکہ حق اور انصاف کی بنیاد پر اتحاد مشرق کے داعی تھے۔ عروۃ الوثقیٰ میں اپنے مقاصد کے متعلق اس غلط فہمی کو انھوں نے صاف الفاظ میں رفع کر دیا تھا:-

"کسی کو یہ خیال نہ قایم کرنا چاہیے کہ یہ جو بار بار خاص طور پر مسلمانوں کا تذکرہ آتا ہے تو اس سے مقصود صرف اُن ہی کے حقوق کی حفاظت ہے اور ان کے غیر مسلم ہم وطنوں کے حقوق و مصالح کو جو صدیوں سے رشتۂ وطنیت کی بنا پر اُن میں باہم مشترک و مخلوط ہیں نظر انداز کر دیتا ہے۔ ایسا کرنا ہماری افتاد طبعیت اور رجحان کے بالکل خلاف اور ہماری شان سے بالکل بعید ہے کیونکہ ایسا کرنے کی اجازت نہ تو ہم کو ہمارے دین نے دی ہے اور نہ ہماری شریعت اس کو کسی طرح اور کسی حال میں جائز رکھتی ہے۔ ہماری غرض عام طور پر مشرقی قوموں کو ہوشیار اور بیدار کرنا ہے......"

اکتوبر ۸۳ء میں تقریباً چھ ماہ کی مختصر زندگی کے بعد عروۃ الوثقیٰ بند ہو گیا۔

اس کتاب کے ضمیمہ ( ) میں عروۃ الوثقی کے بعض مقالوں کا ترجمہ اس لیے پیش کر دیا گیا ہے کہ ان اوراق کے پڑھنے والے شیخ کی سیاسی اسلامی اور بین الاقوامی نقطۂ نظر سے زیادہ آشنا ہو جائیں۔ اس جریدہ کے بند ہونے کی وجوہ زیادہ تر مالی مشکلات تھیں۔ مختلف ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں شیخ بہت تنگدست تھے۔ اور عروۃ الوثقی کی اشاعت میں جو کچھ ان کے پاس تھا سب صرف کر چکے تھے اِس کے

علاوہ یورپین حکومتیں بھی اس اخبار کے بند کرنے پر تُلی ہوئی تھیں۔ مصر اور ہندوستان میں بھی اُس کا داخلہ بند ہو چکا تھا۔ دوسری اسلامی سلطنتوں میں بھی اس کی آواز کو حاکمانہ اقتدار اور مطلقیت کے خلاف سمجھا گیا تھا اور وہاں بھی اُس کی اشاعت روکی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ پیرس کے مطابع نے محض حکومت کے اشارہ سے عروۃ الوثقیٰ کو چھاپنے سے انکار کر دیا اور شیخ بالآخر اس کو بند کرنے پر مجبور ہو گئے۔

پیرس میں شیخ کے قیام کے متعلق کچھ دلچسپ تفصیلات بلنٹ کی تحریروں سے حاصل ہوتی ہیں۔ یورپ میں بلنٹ ہی ایک ایسے مغربی تھے جو شیخ سے بہت گہرے ذاتی اور سیاسی تعلقات رکھتے تھے۔ جب شیخ پیرس میں مقیم تھے تو بلنٹ وہاں اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔ اور شیخ بھی بلنٹ کے پاس لندن جاتے آتے رہتے تھے۔ مصر کے معاملات کے متعلق برطانوی مدبرین اور شیخ کے درمیان جو کچھ گفتگو ہوتی تھی وہ اکثر بلنٹ ہی کے واسطہ سے ہوتی تھی۔ ۱۸۸۳ء، ۱۸۸۴ء اور ۱۸۸۵ء میں بلنٹ سے شیخ کی بہت سی ملاقاتیں ہوئیں۔ ۱۸۸۳ء میں ہندوستان جاتے ہوئے جب بلنٹ پیرس میں ٹھہرے اور شیخ سے ملے تو ان ملاقاتوں کا ذکر انھوں نے اپنے روزنامچہ "موسومہ انڈیا انڈر رپن" India under Ripon میں اس طرح کیا ہے:-

"۱۳ ستمبر ۱۸۸۳ء۔ رات کی گاڑی سے ہم لوگ پیرس پہنچے۔۔۔۔۔۔ ہوٹل الیس۔ رومان میں قیام کیا۔ بہت خاموش جگہ ہے جہاں ہم اپنے احباب سے بہ اطمینان مل سکتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد صابونجی[۱] معہ شیخ جمال الدین کے آگئے۔ جب میں نے

---

[۱] صابونجی (سبحان جی) ایک عرب تھے اور بلنٹ کے پرایویٹ سکریٹری تھے بعد کو سلطان عبدالحمید خان کے ملازم ہو گئے تھے اور غیر زبانوں کے اخبارات کا ترجمہ پیش کیا کرتے تھے اور اکثر سلطان کی خدمت میں بھی حاضر رہا کرتے تھے۔

موسم بہار میں شیخ کو لندن میں دیکھا تھا تو وہ شیوخ کا لباس پہنے ہوئے تھے مگر اب استنبول وضع کے کپڑے اُن کے جسم پر تھے جو اُن پر کچھ بدزیب نہیں معلوم ہوتے تھے ۔ انھوں نے تھوڑی سی فرنچ بھی سیکھ لی ہو ۔ باقی ان کی حالت وہی ہو جو تھی ۔ ہماری گفتگو ہندوستان کے متعلق رہی اور یہ مسئلہ زیرِ بحث رہا کہ مجھ پر ہندوستان کے مسلمان بھروسہ کریں گے یا نہیں ۔ شیخ نے کہا کہ میرا بلحاظ قومیت انگریز ہونا اس امر میں حائل ہوگا اس لیے کہ تمام لوگ جو کوئی حیثیت رکھتے ہیں اپنے منصب کے چھن جانے کے خوف سے گورنمنٹ سے ڈرتے ہیں اور گورنمنٹ کے جاسوس ہر جگہ لگے ہوئے ہیں ۔ انھوں نے کہا کہ وہ خود اپنے گھر کے اندر مقیّد رکھے گئے تھے اور اسی خوف سے وہاں سے چلے آئے کہ کہیں اس سے بدتر برتاؤ نہ کیا جائے ۔۔۔۔۔۔۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کے مسلمان اس کا یقین نہ کریں گے کہ میں ان کا بہی خواہ ہوں اور مجھ سے کھل کر بات کرتے ہوئے گھبرائیں گے ۔۔۔۔۔۔۔ شیخ نے کہا کہ اگر ان لوگوں کو یقین ہو جائے کہ انگلستان میں بھی ایسے لوگ ہیں جو ان کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں تو شاید ان کی ہمت افزائی ہو مگر وہاں تو ہندوستانی صرف سرکاری عہدہ داروں کو دیکھتے ہیں جو ان سے بات کرتے وقت کبھی مسکراتے بھی نہیں ۔۔۔۔۔۔
انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں سلطان کے خلاف کچھ نہ کہوں نہ خلافتِ عربی کے متعلق کچھ کہوں ۔ یہ مشورہ کیا جا رہا ہو کہ انگریز عرب میں ایک مصنوعی خلافت ایک بچّہ کی سیادت میں قایم کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس ذریعہ سے وہ اماکنِ مقدسہ پر قابض ہو جائیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

۱۴ ستمبر ۱۸۸۳ء ۔ جمال الدین سنوا دسنا، اور صابونجی صبح کا ناشتہ ہمارے ساتھ کھانے آئے اور ہم سے دن بھر باتیں کرتے رہے ۔۔۔۔۔۔۔

میں نے مصر میں قوم پرستوں کی ایک پارٹی بنانے کے متعلق جو پروگرام بنایا تھا اس پر بھی شیخ سے گفتگو کی اور نیز ازہر کو تمام دنیائے اسلام کی یونیورسٹی بنانے کے مسئلہ پر بھی مشورہ کیا۔ شیخ نے مجھے بتایا کہ گزشتہ زمانہ میں ازہر کا کیا حال تھا۔۔۔۔۔۔۔۔"

اُسی زمانہ میں شیخ کے تعلقات پرنس ملکم خاں[۵] سے جو لندن میں ایرانی سفیر تھے بہت گہرے اور مخلصانہ ہو گئے۔ ملکم خاں کچھ تو پہلے ہی سے شیخ کے ہم خیال تھے اور کچھ شیخ نے اُن کو اپنا ہم خیال بنا لیا۔ چنانچہ آیندہ زمانہ میں جب ایران کے متعلق شیخ کو بہت زیادہ کدوکاوش کرنی پڑی تو ملکم خاں اُن کے مدد و معاون رہے۔ جب کبھی شیخ لندن جاتے تھے تو اکثر انھیں کے مکان پر اسلامی ممالک کے متعلق مشورے ہوا کرتے تھے۔ اُسی زمانہ میں مہدی سوڈانی کی بغاوت سوڈان میں بہت زیادہ پھیل چکی تھی اور اس کی وجہ سے مصر کے متعلق بھی برطانوی دفترِ خارجہ بہت متردد تھا۔ حالات یہ تھے کہ جب ۱۸۷۹ء میں خدیو اسمٰعیل کو برطرف کر کے توفیق کو خدیو بنایا گیا تو مصر کی حالت بقول بلنٹ کے ایسی تھی جیسے ایک عورت کی عصمت لوٹ لی گئی ہو اور جو معذور و مجبور اپنی قسمت کے آیندہ واقعات کی منتظر پڑی ہو توفیق کی مسند نشینی سے دو برس پہلے ۱۸۷۷ء میں سوڈان میں بد امنی پیدا ہو چکی تھی۔ اس کا سبب رؤف پاشا گورنر سوڈان کے مظالم تھے جو وہ روپیہ وصول کرنے کے لیے وہاں کی رعایا پر کر رہا تھا۔ اعرابی پاشا جس وقت وزیر جنگ ہوئے تو انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ نہ صرف رؤف بے کو سوڈان سے واپس بلا لیا بلکہ مہدی سوڈانی کو اجنبی مداخلت کے خلاف اپنا ہم خیال بنا لیا۔

۵۔ دیکھو ضمیمہ



پرنس ملکم خان نظام الدوله
پیدائش اصفهان ۱۲۴۹ھ (۳۴-۱۸۳۳ع)، وفات روم ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ع)

جس وقت اسکندریہ پر گولہ باری ہوئی تو مہدی کا غم و غصہ زیادہ ہوگیا۔ اور اعرابی کی گرفتاری اور جلا وطنی کے بعد تو سوڈان میں ہر طرف آگ لگ گئی۔ چنانچہ نومبر ۱۸۸۳ء میں بحر احمر کے سواحل پر اور تمام مغربی سوڈان اور خرطوم کے جنوب میں مہدی کی تلوار چمکنے لگی۔ سوڈان کا دارالسلطنت خرطوم بھی خطرہ کی حالت میں تھا اور مصر میں برطانوی "دخل" کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں مہدی سوڈان سے نکل کر مصر پر حملہ نہ کرے۔ گو کہ چند ہی روز بعد مہدی کا انتقال ہوگیا۔ مگر اس کے جانشین نے اپنی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ بالآخر جنوری ۱۸۸۴ء میں جنرل گارڈن بغاوت کو رفع کرنے کے لیے سوڈان بھیجے گئے۔ مگر وہ خرطوم پہنچکر محصور ہو گئے برطانوی وزارت کے لیے یہ واقعات نہایت وحشتناک تھے۔ انگلستان سے گارڈن کے لیے جو کمک بھیجی گئی وہ بہت دیر سے بھیجی گئی۔ اکتوبر ۱۸۸۴ء میں گارڈن کی فوج کے دو جہاز بربر کے قریب خشکی پر چڑھ گئے۔ اور مہدی کے آدمیوں نے تمام برطانوی سپاہیوں کو قتل کر ڈالا۔ پھر نومبر میں جو مزید فوج بھیجی گئی وہ راستے بند ہونے کی وجہ سے نہ پہنچ سکی۔ اس وقت مہدی کی ۲۵ ہزار فوج خرطوم کا محاصرہ کیے ہوئے تھی اور گارڈن برطانوی وزارت کو اطلاع دے چکا تھا کہ وہ چند ہفتہ سے زیادہ دشمن کی روک تھام نہیں کر سکتا آخر ۲۶ر جنوری ۱۸۸۵ء کو خرطوم پر مہدی کی فوجوں کا قبضہ ہوگیا۔ اور گارڈن مارا گیا۔

آخر ۱۸۸۳ء میں جب سوڈان میں ہر طرف آگ لگی ہوئی تھی بلنٹ یہ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح مہدی سے صلح ہو جائے اور گارڈن اپنی جان سلامت لے کر واپس آسکے اس سلسلہ میں شیخ کے متعلق بلنٹ کے روزنامچہ کے اندراجات اور شیخ کے بعض خطوط بنام بلنٹ بہت دل چسپ ہیں۔ ایک

خط میں شیخ لکھتے ہیں :-

"پیرس - ۱۲ / اپریل ۱۸۸۴ء - جناب عالی! آپ کا گرامی نامہ موصول ہؤا۔ جس کے لیے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اگرچہ مجھے اپنے مصر کے زمانۂ قدیم میں کبھی یہ معلوم نہ ہؤا کہ مسٹر گارڈن آزادی کے حامی اور اسلام کے رفیق ہیں[1]۔ تاہم جو بھروسہ مجھے آپ کی باتوں پر ہی اُس کا خیال رکھتے ہوئے میں اُن کے افسوسناک انجام پر بلا تامل اظہار ہمدردی کرتا ہوں کہ وہ ایک ایسی صورتِ حالات میں گرفتار ہوگئے جو دن بدن نازک ہوتی جارہی ہی۔ میں آپ سے یہ بات چھپانا نہیں چاہتا کہ اُس اعتماد پر نظر رکھتے ہوئے جو مہدی اور اس کے بڑے بڑے شرکا کار کو جن میں اکثر سوڈانی میرے شاگرد ہیں، مجھ پر ہی میرے لیے آسان ہی کہ میں اس مصیبت سے گارڈن پاشا کو رہائی دلوا دیتا جو ان پر منڈلا رہی ہی بشرطیکہ گریہم اور عثمان ڈگنا کے درمیان[2] آخری لڑائی نہ ہوئی ہوتی۔ لیکن اِس خوفناک جنگ کے بعد جس میں بے انتہا عربی خون بہایا گیا ہی میرا واثق خیال یہ ہی کہ مہدی اور اُس کے رفقا، اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ کھوئی ہوئی زمین کو از سرِ نو حاصل کرنے اور اپنا وقار جمانے کے لیے یہ ضروری ہی کہ خرطوم پر قبضہ کرلیا جائے اور مسٹر گارڈن کو یا گرفتار کرلیا جائے یا مار ڈالا جائے۔

---

[1] - غالباً اشارہ گارڈن کے اُس یادداشت کے متعلق ہی جو ۱۸۸۰ء میں مرتب کی گئی تھی اور جس میں سلطنتِ عثمانیہ کے اس طرح حصے تجویز کیے گئے تھے کہ مصر انگلستان کو ارمینا روس کو اور یورپین ترکی دوسری خود مختار عیسائی سلطنتوں کو دے دیا جائے۔ بلنٹ نے اپنی کتاب Gordon at Khartum میں اس یادداشت کا ذکر کیا ہی۔

[2] - دیکھو ضمیمہ

Jemmal ed Din July 1885 from Paris

٢

صديقي الشهم الهمام موسيو بلونت

بعد السلام عليكم وعلى قرينتكم الفاضلة المحترمة

انّ افعالكم الجليلة تُذكر وانّ مساعيكم الجميلة تُشكر
جُوزيت خيرا وكُفيت شرّا — ولكني أرى انّ سياسة
الوزارة الحالية تماثل السياسة السابقة في المسئلة المصرية
والسودانية — وانّ المواعيد الحلوة لا تُسمن ولا تغني
من جوع — وانّ حل المسئلة المصرية على حسب فكري يتوقف
على المسئلة الافغانية وهي بيدي — ولهذا عزمت
ان اذهب في الاسبوع القادم الى افغانستان (
— وستنال بغيتك بذهابي الى تلك البلاد ان شاء الله
— وساكتب لك جميع ما افعله بشرط ان تحفظه سرّا
عندك حتى يمكننا ان نصل الى نتيجة حسنة — ورجائي
منك ان تكون المكاتبات متواصلة — والغالب
ان سفري يكون في يوم الثلث والسلام عليكم
وعلى قرينتكم الشريفة المحترمة

جمال الدين الحسيني الافغاني

١٧ يوليه

خط عربی پیرس سے (مورخہ ۱۷ جولائی سنہ ۱۸۸۵ء)

بہر حال اگر آپ مبادیٔ صلح کے بارہ میں فرانسیسی زبان میں مجھے زیادہ تفصیل لکھ کر بھیجدیں یعنی ایسی شرائطِ صلح جو آپ طے کرنا چاہتے ہیں اور جو آپ کے نزدیک قابل پذیرائی ہوسکتی ہیں تو میں آپ کے لیے ہر اُس خدمت کے ادا کرنے میں قاصر نہیں رہوں گا جو میں موجودہ حالات میں کرسکتا ہوں اور نیز ایسے ذرایع کو بہم پہنچانے میں جو بدقسمت گارڈن کی جان بچاسکیں۔

جواب کا طالب

جمال الدین الحسینی الافغانی

"پیرس ۱۸/اپریل ۱۸۸۴ء - جناب عالی! آپ کا مرسلہ گرامی نامہ ابھی موصول ہوا ہے۔ اُسے میں نے نہایت غور کے ساتھ پڑھا اور اب میں اس کا جواب لکھ رہا ہوں۔ آپ کو چاہیے کہ آپ اُس اہمیت کو نظر انداز نہ کریں جو عام مسلمانوں کے نزدیک مہدی کے روحانی مشن میں مضمر ہے ساتھ ہی اس کو بھی نظر انداز نہ کیجئے کہ وہ لفظِ مہدی سے کیا مراد لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس لفظ کا مفہوم غیر مسلموں سے اسلام کو نجات دلانے والا ہے۔ اب میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ مہدی سے کیونکر ایسی صلح کی جاسکتی ہے اور کیونکر اُس کی پیش قدمی کو روکا جاسکتا ہے تاکہ انگریزوں کو مصر میں رہنے کی اجازت مل جائے۔ لیکن مبادی صلح اگر یہ ہوں کہ مصر مصریوں کے پاس رہے گارڈن پاشا مع اپنے عیسائی رفقاء کے بچائے جائیں اور انگریزی افواج مصر سے ہٹالی جائیں تو اس صورت میں میرا خیال ہے کہ اس معاملہ کو خوش گوار انجام تک پہنچانا ممکن ہوسکے گا۔ اگرچہ یہ کام بالکل آسان بھی نہیں ہے اس سے مہدی کے حملہ کو بھی ایک خاص وقت تک روکا جاسکتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ ضروری ہوگا کہ ایک ایسا وفد جس میں زیادہ مسلمان اور چند انگریز ہوں مہدی کی خدمت میں بھیجا جائے۔

اور مسلمانوں کو یہ کہنے کی ہدایت کردی جائے کہ ہم مصر کی اسلامی قوم کی طرف سے آئے ہیں۔ اس لیے کہ اگر اُن کو مصری حکومت کی جانب سے بھیجا جائے گا تو مجھے یقین نہیں کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوسکیں گے کیونکہ مہدی کو حکومتِ انگریزی سے سخت نفرت ہے اور اگر وہ لوگ حکومتِ انگریزی کے نمایندے ہوں گے تو ان کی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔ شیخ المرغانی کے ذریعہ ہم کو اس کا کافی ثبوت مل چکا ہے۔ باقی رہا ان انگریزوں کا مسئلہ جو اس مشن کے رکن ہوں گے تو ان کے متعلق یہ اچھی طرح سمجھ لیا گیا ہے کہ وہ اپنی گورنمنٹ کے افسر ہوں گے اگرچہ کہ واقعہ یہ ہے کہ تمام اشخاص خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی مشن کے ممبر ہوں گے۔ اس مشن کے بھیجنے کا فیصلہ ہوگیا تو ان حالات میں جن کے بیان کرنے کی میں آپ کے روبرو جرات کر رہا ہوں مجھے یقین ہے کہ آپ اس مشن کے سب سے پہلے ممبر نامزد کیئے جائیں گے۔ کیونکہ مسلمانوں کو آپ جیسا حامی اور مددگار میسر نہیں آسکتا۔ باقی رہے وہ مسلمان جن کا بھیجنا ضروری سمجھا جائے گا سو میں اُن کے نام بتا دوں گا اور آپ ناموں کو عین موقعہ پر ظاہر کردیں جب کہ خاص طرزِ عمل کے متعلق فیصلہ ہو چکا ہو۔ آپ مجھ سے استفسار کرتے ہیں کہ توفیق پاشا کی جگہ کس شخص کو مقرر کرنا چاہیے میرا جواب یہ ہے کہ جب موقعہ آئے گا تو آپ کے یا کسی اور کے لیے جانشین معلوم کرلینا مشکل نہ ہوگا۔ وہ شخص وہی ہوگا جسے مصری قوم چاہتی ہے اور اس کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

آپ کا محب صادق

جمال الدین الحسینی الافغانی

"پیرس ۷ مئی ۱۸۸۴ء۔ جناب عالی! میں ابھی اٹلی سے آیا ہوں۔ ٹیورن کی نمایش میں بھی گیا تھا۔ آج صبح آپ کی دو چٹھیاں مجھے موصول ہوئی ہیں جن کو

میں نے نہایت غور کے ساتھ پڑھا ہے۔

آپ کے آخری خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ گارڈن کے انجام سے زیادہ سروکار نہ رکھیں گے اور اس سے ایک مرتبہ اور آپ کی روح کی عظمت اور وفاداری کا نقش میرے دل پر بیٹھ گیا ہے۔ آپ کی اس دلی خواہش کا دکھ آپ جنرل گارڈن کے متعلق خط و کتابت والی "بلیو بک" مجھے بھیجنا چاہتے ہیں جس کی مدد سے بلاشبہ آپ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جنرل موصوف مسلمانوں کے حامی اور اسلام کے دوست نہ تھے، شکریہ ادا کرتے ہوئے میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ آپ کا اسم گرامی ہر مسلمان کے دل میں بالخصوص اور ہر عرب اور مشرقی کے دل میں بالعموم منقش رہے گا اس لیے کہ جو دلچسپی آپ اُن کے معاملات میں لے رہے ہیں وہ ایسی ہے کہ وہ مشکور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مجھے امید ہے کہ آپ مخصوص وفاداری کے ساتھ اُسی شاندار راستہ پر گام زن رہیں گے اور یہ کہ خدائے برتر اس محنت کا اجر آپ کو دے گا۔ جو آپ ان کے لیے کر رہے ہیں ...."

آپ کا صادق

جمال الدین الحسینی الافغانی

"پیرس ۲۱ مئی ۱۸۸۵ء۔ سلام کے بعد میں ہی صرف آپ کی نمایاں کوششوں کا مرہونِ منت نہیں ہوں جس کی وجہ سے گورنمنٹ سوڈان کا علاقہ خالی کر دینے پر مجبور ہو گئی ہے۔ نہیں۔ یقین رکھیے کہ تمام مسلمان بالخصوص عرب آپ کے اس کارنامہ پر تہ دل سے شکر گزار ہیں اور آپ کی سرگرمی اور جرات کے معترف ہیں آپ کا اسمِ گرامی جواہرات کے حروف میں لوح پر لکھا جائے گا اور عزت اور احترام کے القابوں سے مزین کیا جائے گا لیکن

ابھی تک ایک کام ایسا ہی جو باقی رہ گیا ہی اور وہ یہ ہی کہ آپ گورنمنٹ سے کہیں کہ مہدی کے حملوں کے روکنے کی ذمہ داری کس پر عاید ہوتی ہی۔ساتھ ہی یہ کہ گورنمنٹ شاہ راہِ تجارت کو کس طرح مسدود رہنے کی اجازت دے سکتی ہی۔ کیا ایسی حالت میں جب کہ گورنمنٹ نے سوڈان کے خالی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہی گورنمنٹ پر واجب نہیں کہ وہ کسی قابلِ اعتماد آدمی کو مہدی کے پاس شرائط صلح مرتب کرنے کے لیے بھیجے اور مصر کو مہدی کے حملوں سے بچائے اور اس طرح قتل و خونریزی کو بند کرائے اور تجارتی راستوں کو کھلوائے۔ میرا خیال ہی کہ اگر یہ سوال پارلیمنٹ کے روبرو پیش کیا جائے گا تو سب ممبر اس سے اتفاق ظاہر کریں گے۔

مجھے یہ کام آسان معلوم ہوتا ہی کہ اخراجات طے ہو جانے کے بعد اس کام کی تکمیل کے لیے آپ ہی کی ضرورت پڑے گی۔ لیکن مہدی سے صلح کے بغیر صورتِ حالات کبھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔ یہی وہ بات ہی جس کا آپ تک پہنچانا میں ضروری سمجھتا ہوں۔

آپ کا دوست

جمال الدین الحسینی الافغانی

ان خطوط سے اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہی کہ اہم معاملات میں شیخ اپنی عادت کے خلاف کس قدر مدبرانہ اور معتدل اور محتاط رویہ اختیار کرنے پر قادر تھے۔ مزاج کی گرمی و حدت کو کبھی کبھی ضرورت وقت کے لحاظ سے تدبر کا اعتدال دبا ہی لیتا تھا!

شیخ کے مشورہ پر عمل نہ کرکے سوڈان کے معاملہ میں برطانوی حکومت نے جنرل گارڈن کی جان کو بہت سستا فروخت کیا۔ براؤن نے انقلاب

Jemal el Din July 18
Afghani

٣٠

صديقي الشهم الهمام موسيو بلونت

بعد السلام عليكم وعلى قرينتكم الفاضلة المحترمة

انني ارسلت اليكم مكتوبا يوم الجمعة ١٧ من الشهر
وبينت فيه ارادتي وما عزمت عليه — ثم في هذا
اليوم (يوم السبت ١٨) وصلني مكتوب من قرينتكم
المحترمة تستدعيني الى الذهاب اليكم (لندره)
— ولكنني ما ادري هل يترتب حقيقة فائدة على
مجيئ — وهل حضرتكم على يقين من ذلك او يكون
الامر مبنيا على وعود كاذبة واوهام باطلة بلا
انتاج ثمرة ولا اجتناء فائدة — ولا يبقى لا لكم
ولا لي الا المشقة والتعب — فان كنت
على يقين من الفائدة فاكتب لي حتى احضر الى (لندره)
وان لم تعلم حقيقة الامر ولست على ثقة من
الوزارة الحالية ارجو منك ايضا ان تكتب لي
حتى اكون على عزمي واسافر الى (افغانستان)
كما بينت في مكتوبي السابق — والسلام عليكم وعلى قرينتكم
الشريفة الفاضلة

محبكم
جمال الدين الحسيني الافغاني

١٨ يوليه ٨٥

خط عربی پیرس سے (مورخہ ١٨ جولائی سنہ ١٨٨٥ع)

ایران" میں ان معاملات کے متعلق بلنٹ کے حوالہ سے لکھا ہی کہ ۔

"گلیڈسٹن میرے خیال میں بخوشی شیخ کی امداد کو حاصل کرتا بلکہ یہ معاملہ مجلس وزرار میں پیش بھی ہوا مگر وزارتِ خارجہ کا یہ منشا ہی نہ تھا کہ صلح اور امن سے یہ معاملہ طے ہو اس لیے یہ تجویز نامنظور کردی گئی ۔"

معلوم یہ ہوتا ہی کہ مصر کی آزادی کے متعلق شیخ کی شرط ناقابلِ قبول تھی اور اسی لیے وزارت خارجہ نے شیخ کے مشوروں کو نظر انداز کرنا ضروری سمجھا ۔ تاہم یہ معلوم ہی کہ ایک انگریزی نمایندہ شیخ سے مہدی کے نام تعارف کا خط لے کر گیا لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا البتہ جنرل گارڈن کے مارے جانے کے بعد پھر بلنٹ نے شیخ سے خط وکتابت کی اور ان کو لندن بلا کر بھی سوڈان ومصر کے متعلق مشورہ کیا ۔ یہ شروع ۱۸۸۵ء کا واقعہ ہی جس کی تفصیلات خود بلنٹ کے "روزنامچہ" سے واضح ہوتی ہیں ۔

" ۲۵ر فروری ۱۸۸۵ء ۔ پیرس ۔ جمال الدین نے کہا کہ اب خرطوم فتح ہوجانے کے بعد مہدی سے گفتگو کرنا اور زیادہ دشوار ہوگا ۔ انگریز جنرلوں کو قتل کرکے مہدی بہت فخر کر رہا ہی ۔ پھر بھی جمال الدین کا خیال تھا کہ اگر انگریز چاہیں تو صلح ہوسکتی ہی بشرطیکہ ۔

۱ ۔ سوڈان کو خالی کردیں ۔

۲ ۔ سواکن سلطان کے حوالہ کردیں ۔

۳ ۔ اطالیوں کو مسووا سے علیحدہ ہونے پر آمادہ کردیں ۔ اور

۴ ۔ سلطان سے مصر میں آزاد اسلامی سلطنت قایم کرنے کا اقرار کرالیں ۔

شیخ کی رائے میں اعرابی کو اگر واپس بلا لیا جائے گا تو اس کام میں آسانی ہوگی ۔ ان کے خیال میں انگریزوں ہی کو پہلے صلح کی طرف قدم بڑھانا چاہیئے۔ مہدی موجودہ حالت میں نہ اپنا سفیر انگلستان بھیج سکتا ہے نہ خود شیخ کو اپنا وکیل بنا سکتا ہے ۔ سفارت انگلستان سے جانی چاہیے اور شیخ اس کی مدد کریں گے۔

۲۶ فروری ۔ جمال الدین اور سنا ۔ صبح کو کھانا کھانے آئے .... افغانستان کے متعلق جمال الدین نے یقین دلایا کہ روس اور امیر کے درمیان جھگڑے کی خبر بالکل لغو ہے اگر کبھی جھگڑا ہو تو وہ ہمارے (انگریزوں کے) خلاف ہوگا ۔ جب ہی امیر روسیوں کو ہندوستان پر حملہ کرنے کا راستہ دیں گے لیکن نہ ابھی امیر اس کے لیے تیار ہیں نہ روس ....

میں نے کہا اخبارات میں خبر ہے کہ نظام حیدر آباد نے سوڈان بھیجنے کے لیے اپنی فوج پیش کی ہے مگر شیخ یہ سن کر ہنسنے لگے ۔ انھوں نے کہا یہ لوگ ہمیشہ فوجیں پیش کیا کرتے ہیں مگر یہ سمجھ کر کہ وہ قبول نہ کی جائیں گی۔ جب سنا چلے گئے تو شیخ نے مجھ سے پرائیویٹ طور پر کہا کہ مہدی سے صلح کی گفتگو یقیناً قابلِ عمل ہے مگر شیخ اس میں کچھ حصہ نہ لیں گے جب تک کہ برطانوی حکومت مجھے یا کسی اور معتبر آدمی کو اس پیام و سلام کے لیے مقرر نہ کرے گی۔ تب شیخ اس مشن کو جس میں ایک مسلمان بھی ضرور ہونا چاہیے مصر کے ایک بڑے آدمی سے ملا دیں گے جو شرائط صلح کے متعلق گفتگو کر سکتا ہے ۔ خود شیخ یہ نہیں کر سکتے مگر وہ ایسے لوگوں کی طرف راستہ بتا سکتے ہیں جو مشن کا تعارف مہدی سے کرا دیں گے اور اس کو بخیریت وہاں تک پہنچا دیں گے ۔ مگر یہ پہلے طے ہونا چاہیے کہ برطانوی حکومت اُن لوگوں کی جن کے ذریعہ سے گفتگو ہوگی حفاظت کی ذمہ داری قبول کرے گی یا نہیں تاکہ اُن لوگوں کو

خدیو پریشان نہ کرنے پائے۔ شیخ کو امید ہی کہ اس طرح نہ صرف صلح ہو جائے گی بلکہ تجارت اور غلامی کے متعلّق بھی کوئی سمجھوتہ ہو سکے گا .... مگر شیخ نے خود کسی انگریز سرکاری آدمی سے گفتگو کرنے سے انکار کیا۔ جب تک مجھے یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ برطانوی حکومت کا ارادہ نیک ہی اور مہدی کے وکلا کی حفاظت کا وعدہ کیا جاتا ہی ....

.... مجھے شیخ کی یہ گفتگو قابلِ اطمینان معلوم ہوتی ہی۔

۴ر اپریل - پھر پیرس آیا۔ مہدی سے صلح کے متعلق پھر شیخ سے گفتگو کی انھوں نے کہا کہ برطانوی گورنمنٹ ایک خط مہدی کے نام لکھے اور اس کو ابراہیم لے کر جائے۔

۱۳ر اپریل۔ شیخ نے پھر وہی اصرار کیا کہ برطانوی گورنمنٹ مہدی کو خط لکھے۔ وہ اس کام کے لیے انگلستان جانے پر آمادہ تھے۔ بشرطیکہ میں ان کو اطمینان دلادوں کہ وہ وہاں گرفتار نہ کر لیے جائیں گے۔ میں نے اُن کو یقین دلایا کہ گرفتاری کا کوئی اندیشہ نہیں۔ مگر وہ ہندوستان کے تجربہ کے بعد انگریزوں سے بہت بدظن ہیں .. .."

اس کے بعد بلنٹ واپس گئے اور بعد کو شیخ بھی لندن پہنچ گئے چند روز ٹھہر کر وہ پھر پیرس آگئے جہاں سوڈان اور مصر کے متعلق مزید گفت وشنید کا سلسلہ جاری رہا۔ بلنٹ اپنے "روزنامچہ" میں پھر ۹ر جولائی سے اس گفت و شنید کی طرف اشارے کرتا ہی۔

"۹ر جولائی۔ ابراہیم کے پاس جمال الدین کا خط آیا ہی۔ جس میں اشارہ کیا گیا ہی کہ اگر مصر کے معاملہ کو طے نہ کیا گیا تو وہ افغانستان جاکر وہاں انگلستان کے خلاف دشواریاں پیدا کریں گے۔"

۱۶ر جولائی ۔ رنڈلف چرچل سے ملنے انڈیا آفس گیا ۔ ....
انھوں نے کہا کہ مجھے بہت فکر ہے کہ امیر افغانستان کیا چال چل رہے ہیں میں نے کہا میں جمال الدین کو پیرس سے بلا لوں گا اور اس معاملہ میں نیز مصر کے متعلق اُن سے باتیں کرلی جائیں گی ۔ رنڈلف یہ سُن کر بہت خوش ہوئے اور کہا وہ ضرور شیخ سے میرے مکان پر ملیں گے ۔"

شیخ پیرس میں بیٹھے برطانوی سیاست کے مدوجزر کا مطالعہ کر رہے تھے ۔ اور مصر و سوڈان کے معاملہ میں برطانوی وزارت کے طرزِ عمل سے مایوس ہو چکے تھے ۔ انگلستان میں گلیڈسٹن کی وزارت ختم ہو چکی تھی اور نئی وزارت میں لارڈ رنڈلف چرچل وزیر ہند بنائے گئے تھے یہ صاحب بلنٹ کے خاص دوست تھے ۔ اس لیے بلنٹ کی اُمیدیں پھر کچھ تازہ ہوگئی تھیں ۔ جب انھوں نے شیخ کو چرچل سے گفتگو کرنے کے لیے لندن مدعو کیا تو شیخ نے ۱۷ر جولائی کو بلنٹ کی دعوت کا جواب ایسے الفاظ میں دیا جس سے برطانوی سیاست کے متعلق اُن کی بے اعتمادی اور مایوسی صاف صاف مترشح ہوتی تھی ۔ انھوں نے لکھا کہ ۔

" میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ موجودہ وزارت کی حکمت عملی بھی مصر اور سوڈان کے معاملہ میں کچھ گزشتہ وزارت کی سی ہے ۔ میٹھے اور خوشگوار وعدوں سے بھوک کب رفع ہوتی ہے ۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں مصر کا مسئلہ افغانستان کے مسئلہ پر منحصر ہے اور افغانستان کا معاملہ تمام تر میرے ہاتھ میں ہے اس لیے میں نے تو یہ طے کرلیا ہے کہ آیندہ ہفتہ افغانستان چلا جاؤں اور میرے جانے سے انشاءاللہ آپ کا مقصد بھی پورا ہوگا عنقریب میں آپ کو اپنی کارگزاری سے مطلع کروں گا ۔ شرط یہ ہے کہ اُس کو اُس وقت تک اپنے ہی



محمد احمد «مہدی» سوڈانی

تک رکھیے گا جب تک کہ ہم کسی مفید نتیجہ پر نہ پہنچ جائیں۔ مجھے اُمید ہی کہ خط وکتابت کا یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ غالباً سہ شنبہ کو میں روانہ ہو جاؤں گا۔ ...."

اس خط کے روانہ کرنے کے بعد ہی شیخ کو بلنٹ کی بیگم صاحبہ کا ایک خط وصول ہوا جس میں انھوں نے شیخ کو بہ اصرار لندن بلایا تھا۔ اس خط کا جواب شیخ نے بلنٹ کو حسب ذیل الفاظ میں دیا۔

"۱۷ر جولائی یوم جمعہ کو ایک عریضہ ارسال خدمت کرچکا ہوں۔ جس میں میں نے اپنے عزم و ارادہ سے جناب کو مطلع کر دیا تھا۔ آج ۱۸ر جولائی کو آپ کی بیگم صاحبہ کا ایک عنایت نامہ وصول ہوا جس میں مجھ سے فرمائش کی گئی ہی کہ میں پھر لندن آؤں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے آنے سے حقیقتاً کیا فائدہ مرتب ہو گا مفت میں میں آپ کے پاس آؤں اور نتیجہ کچھ بھی نہ نکلے۔ مجھے کچھ فائدہ ہو نہ آپ کو۔ ہاں زحمت مجھے اور آپ کو دونوں کو ہو تو اس سے حاصل کیا۔ اور اگر آپ بھی صورتِ حالات سے ناواقف ہوں اور موجودہ وزارت پر بھی آپ کو اعتماد نہ ہو تو مجھے لکھیے گا تاکہ میں اپنے ارادہ کو عمل میں لاسکوں یعنی افغانستان روانہ ہو جاؤں جیساکہ اپنے گزشتہ خط میں لکھ چکا ہوں۔ ...."

شیخ کی مایوسی اور کبیدہ خاطری کا اندازہ مندرجہ بالا الفاظ سے ہو سکتا ہی تاہم بلنٹ کے اصرار سے مجبور ہوکر وہ پھر لندن گئے اور رنڈلف چرچل اور ڈرامنڈ ولف وغیرہ سے گفتگو کی۔ اس زمانہ کے حالات کا کچھ پتہ بلنٹ کے "روزنامچہ" کے اندراجات سے چلتا ہی۔

"۲۱ر جولائی۔ مفتی عبدہ اور شیخ پیرس سے لندن آئے۔.........
۲۲ر جولائی۔ عبدہ نے میرے ہاں کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد یہ بحث چھڑ گئی کہ قرآن مکمل کتاب کی صورت میں حرف بہ حرف نازل ہوا تھا یا اس کے اجزا زبانی بعد کو جمع کر لیے گئے۔ عبدہ کی یہ رائے ہے کہ زبانی فقرات لکھ کر مرتب کیے گئے ہیں.................

صبح کو رنڈلف چرچل میرے مکان پر شیخ سے ملے۔ رنڈلف چرچل جمال الدین سے بہت اخلاق کے ساتھ ملے وہ دونوں فرانسیسی زبان میں گفتگو کرنے لگے مگر میں نے دیکھا کہ رنڈلف بہت کم فرانسیسی بول سکتے تھے اس لیے میں نے ترجمانی شروع کر دی۔ رنڈلف نے پہلے مہدی کی موت کے متعلق شیخ سے سوال کیا شیخ نے کہا کہ ان کو یقین نہیں کہ مہدی کا انتقال ہو گیا ہے۔ لیکن اگر یہ صحیح ہے تو بھی حالات میں کوئی فرق نہیں آتا سوڈانی مہدی کا جانشین مقرر کر لیں گے۔ رنڈلف نے سوال کیا کہ وہ کون ہوگا۔ شیخ نے کہا کہ عثمان ڈگنا تو نہ ہوگا بلکہ مہدی کے ساتھیوں میں سے کوئی مذہبی آدمی ہوگا۔ عثمان ڈگنا جنرل ہوگا مگر خلیفہ نہ بنایا جائے گا جانشین کا تقرر بالکل اسی طرح ہوگا جس طرح پیغمبر کے انتقال کے وقت ہوا تھا سب سے زیادہ مذہبی آدمی جانشین بنایا جائے گا.........
رنڈلف نے افغانستان و روس کے متعلق سوالات کیے شیخ نے کہا کہ۔
"عبدالرحمٰن اچھے فوجی جنرل ہیں مگر سیاست داں نہیں ہیں لیکن وہ کوئی احمق بھی نہیں ہیں۔ افغانوں کی کثرت ان کے ساتھ ہے مگر ان کے خلاف بغاوتیں کر دینا کچھ مشکل نہیں۔ افغانی سادہ لوح ہوتے ہیں۔ سیاسات سے ناواقف اور ہر وقت لڑنے کے لیے تیار۔ روس شیر علی

وغیرہ کے ایک درجن لڑکوں میں سے کسی کے ذریعہ سے بغاوت کرا سکتا ہے۔ یہ کام بالکل آسان ہے۔ مگر روسیوں کا افغانستان سے لڑنے کا اس سال ارادہ نہیں بلکہ وہ ان شاہزادوں میں سے کسی سے دوستی کرنا چاہتے ہیں اور اُن کے ذریعہ سے بدامنی پیدا کرانا چاہتے ہیں۔ وہ خود مددگار بن کر انگریزوں کے خلاف لڑیں گے اور کشمیر اور پشاور کے اضلاع کے دینے کا وعدہ کریں گے اگر ہندوستان میں بغاوت ہو جائے۔ افغان اُن کی بات پر بھروسہ کریں گے۔

رنڈلف۔ کیا افغان روسیوں سے زیادہ ہم سے نفرت کرتے ہیں۔

شیخ۔ روسیوں نے افغانیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے مگر انگریز افغانیوں کے خلاف تین لڑائیاں لڑ چکے ہیں۔

رنڈلف۔ مگر کیا آپ سمجھتے ہیں کہ روسیوں نے اسلام کو ہم سے زیادہ نقصان نہیں پہنچایا؟

شیخ:۔ روسیوں نے چند چھوٹے ملکوں پر قبضہ کیا جیسے کریمیا سرکاشیا وغیرہ مگر انگریزوں نے دہلی کی سلطنت تباہ کی مصر اور سوڈان پر قبضہ کر لیا۔

رنڈلف۔ مغلوں کی حکومت کو تو مرہٹوں نے تباہ کیا۔

مرہٹے تو آتے رہے جاتے رہے۔ جس طرح نادر شاہ آیا مگر تم ہندوستان میں جم گئے اور تم نے سلطنت کو تباہ کر دیا۔ روسیوں سے زیادہ تم لوگوں سے نفرت کرنے کے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے تین وجوہ ہیں۔

(۱) چونکہ تم نے دہلی کی سلطنت کا خاتمہ کیا۔

(۲) چونکہ تم مساجد کے اماموں اور موذنوں اور محافظوں کو کوئی تنخواہ نہیں دیتے مگر روسی دیتے ہیں اور

(۳) یہ کہ تم نے مذہبی اوقاف کو ختم کر دیا۔

رنڈلف۔ مگر ہم بعض مساجد وغیرہ کی مرمت تو کراتے ہیں۔

شیخ۔ صرف اس حالت میں جب کہ وہ خوبصورتی کے لحاظ سے اچھی ہوں مگر مذہبی تقدس کے لحاظ سے نہیں۔ اور تم فوج میں اعلیٰ عہدے مسلمانوں کو نہیں دیتے روسی ایسا کرتے ہیں۔

رنڈلف۔ ہندوستان کی ریاستوں میں بہت سے مسلمان اعلیٰ عہدوں پر ہیں۔

شیخ۔ وہ تو ریاستیں ہیں۔ برطانوی حکومت نہیں ہو جو چیز معدہ میں نہیں گئی وہ ہضم کیونکر ہوگئی (یعنی جب ریاستوں کا الحاق ہی نہیں کیا گیا تو اُن کو برطانوی ہندوستان میں شامل کیونکر سمجھا جا سکتا ہو)

رنڈلف۔ تو آپ مسلمانوں کے لیے انگلستان کو روس سے زیادہ خطرناک سمجھتے ہیں۔

شیخ۔ میں یہ نہیں کہتا مگر میں ماضی کا ذکر کر رہا ہوں۔ انگلستان نے ہم کو روس سے زیادہ نقصان پہنچایا ہو۔ مگر روس اس وقت زیادہ خطرناک ہو اگر روسی (پنجدہ یا ذوالفقار تک کا ذکر نہیں کرتا) مرو میں پانچ برس بھی رہ گئے تو نہ افغانستان ہوگا نہ ایران ہوگا نہ اناطولیہ ہوگا نہ ہندوستان ہوگا۔ سب ہضم ہو جائیں گے۔ روسی پنجدہ وغیرہ کو چھوڑ بھی دیں تو مرو میں ضرور رہیں گے۔

رنڈلف۔ یہ سچ ہو مگر ہم آپ کی رائے میں کیا کریں۔

شیخ۔ آپ کو اسلام سے اتحاد کرنا چاہیئے افغانوں سے ایرانیوں سے ترکوں سے مصریوں سے اور عربوں سے۔ آپ کو چاہیے کہ روسیوں کو

مرو سے نکال دیں۔ مسلمانوں سے دوستی کرنے کی غرض سے آپ کو مصر چھوڑ دینا چاہیے۔ دوسری غیر ملکی قوموں سے مصر کو کوئی خطرہ نہیں آپ کے قبضہ میں قبرس ہے اور عدن ہے پھر آپ کیوں ڈرتے ہیں۔ مہدی سے بھی ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں اگر مصر میں اسلامی سلطنت ہو تو مہدی کا کوئی خطرہ نہیں۔ اس لیے آپ کو مسلمانوں سے اتحاد کرنا چاہیے جو آپ کی دوستی پر بھروسہ کریں گے۔

رنڈلف۔ کیا ہم روسیوں کے خلاف افغانیوں کی مدد کرنے کے لیے افغانستان کو فوج اور فوجی افسر بھیج سکتے ہیں۔

شیخ۔ اگر آپ فوجیں بھیجیں گے مثلاً قندھار کو خواہ امیر کی رضامندی بھی حاصل کرلیں تب بھی کسی ایک مسلمان کو حق حاصل ہوگا کہ وہ پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر آپ کے خلاف بغاوت کا اعلان کردے وہ کہہ سکتا ہے کہ آپ دوستی کے پردے میں قبضہ کرنے آئے ہیں اور سب لوگ اس کی بات کا یقین کرلیں گے۔ ہاں آپ چند افسر بھیج سکتے ہیں۔ اس لیے کہ چند افسروں کی نسبت قبضہ کرنے کا گمان نہیں کیا جا سکتا۔ وہ امیر کے ملازم ہوں گے۔ مگر یہ یاد رکھیے کہ اگر روسی پانچ برس بھی مرو میں رہ گئے تو پھر کچھ نہ ہو سکے گا آپ کو اُن پر افغانستان کے راستہ سے نہیں بلکہ دوسری طرف سے حملہ کرنا چاہیے اس صورت میں آپ کی شرکت کرنے کے لیے مُلّا بھی جہاد کی تبلیغ کریں گے۔۔۔۔

پون گھنٹہ تک یہ گفتگو ہوتی رہی اور چلتے وقت دروازہ پر رنڈلف نے مجھ سے کہا کہ جمال الدین بہت صاف گو اور صحیح رائے رکھنے والے آدمی ہیں۔۔۔۔۔۔۔"

۲۸ر جولائی ۔ عبدہ نے بلنٹ کو ان تین افسروں کے نام بتائے جن کو سلاتین پاشا نے رشوت دے کر طل الکبیر پر اعرابی کو شکست دلوائی تھی ۔ ایک علی یوسف ترک تھا وسطی ڈویژن کا افسر، جو میدان سے ہٹ گئے اور جس نے ویلزلی کی فوج کو راستہ دے دیا اور دوسرا عبدالرحمن حسن مصری جو سوار اسکاوٹ کا افسر تھا اور جس نے اعرابی کو انگریزوں کی پیش قدمی کی اطلاع قصداً نہ دی اور تیسرا راغب سید ایک چرکسی ۔

۳۰ر جولائی ۔ ہم ساڑھے گیارہ بجے جیمس اسٹریٹ آئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جن امور پر خاص طور سے ولف نے جمال الدین سے گفتگو کی وہ یہ سوال تھا کہ مہدی سلطان کی خلافت کو مانے گا یا نہیں ۔ جمال الدین نے کہا یہ ناممکن ہے ۔ مہدی نہ مہدی کے جانشین اس کو مانیں گے لیکن وہ اس طرح ایک دوسرے کو مان لیں گے کہ جس طرح سلطان مراقش ہیں ۔ اگر مصر میں اسلامی حکومت قایم ہو جائے تو اس صورت میں سوڈانیوں سے کوئی خطرہ نہ ہوگا ۔ مہدی کی حکومت مذہبی ہے اور قاہرہ کے علما اس کو مصر پر حملہ نہ کرنے دیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے بعد تخلیۂ مصر کے متعلق بحث ہوتی رہی ۔ ولف نے کہا کہ برطانوی دفتر خارجہ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اگر برطانیہ مصر کو خالی کر دے گا تو جرمنی فرانسیسوں کے قبضہ کو قبول کر لے گا ۔ سید نے کہا کہ وہ اس کا یقین نہیں کرتے کہ فرانسیسی مصر پر قبضہ کر لیں گے ۔ آخر میں شیخ اور ولف اس رائے پر متفق ہو گئے کہ اگر انگلستان تخلیہ مصر کی کوئی تاریخ مقرر کر دے گا تو سلطان سے سمجھوتہ کر لیا جائے گا ۔ غلامی کے سوال پر جمال الدین نے کہا

کہ بت پرست قبیلوں کو غلام بنانے کا انسداد مشکل ہے مگر حبشیوں کی گرفتاری اور فروخت کے روکنے پر مہدی آمادہ کیا جا سکتا ہے وہ اس معاملہ کو اور انگلستان و مصر کے تجارتی تعلقات کو طے کرا سکتے ہیں سلطان کو مصر کے متعلق معقول سمجھوتہ پر راضی کر دینا مشکل نہ ہوگا اور جمال الدین نے کہا کہ اگر ضرورت ہوگی تو وہ خود قسطنطنیہ چلے جائیں گے ....
یہ میری تجویز تھی .... ورنہ سلطان کو اعرابی کی واپسی پر رضامند کرنا مشکل ہوگا.............

بلنٹ کے "روزنامچہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ جولائی سے اکتوبر تک شیخ لندن میں موجود تھے اور اس زمانہ میں مصر اور سوڈان کے متعلق گفتگو کا سلسلہ برابر جاری رہا برطانوی وزارت نے ڈرمنڈ ولف کو ان معاملات کے سلجھانے کے لیے منتخب کیا تھا چنانچہ اس کے بعد کی تمام گفت و شنید ولف ہی سے ہوتی رہی۔

۵ اگست۔ ولف نے پورٹسمتھ سے پھر تار دیا کہ وہ جمال الدین سے ملنا چاہتے ہیں۔

۶ اگست۔ جمال الدین کے ساتھ لندن گیا اور ولف سے طویل گفتگو کی۔ ولف ترکی ایران و افغانستان کے اتحاد کو بہت پسند کرتا ہے مگر کہتا ہے کہ اس معاملہ کے متعلق وہ فی الحال سلطان سے گفتگو نہ کرے گا۔ محض تذکرۃً کچھ کہہ سکے گا۔ اس لیے کہ اس قسم کے معاملہ میں گفتگو کرنا سفیر کا کام ہے۔ گفتگو زیادہ تر مصر کے متعلق کی جائے گی۔ ولف کو یہ معلوم کرنے کی بہت فکر ہے کہ سطان اور مہدی کے درمیان کس طرح سمجھوتہ کرایا جا سکے گا۔ جمال الدین نے کہا کہ فی الحال اِس

سوال کو اٹھانے یا اس کا فیصلہ کرانے کی ضرورت نہیں۔ سلطان کو جس بات کی زیادہ فکر ہوگی وہ تخلیہ مصر کی تاریخ کا تعین ہے۔ ولف نے کہا کہ تاریخ کا تعین تو ممکن ہے اور تجویز یہ ہے کہ سلطان سے کہا جائے کہ وہ تخلیہ سے پہلے مصر کے حالات درست کرنے میں مدد کریں۔ اس پر جمال الدین نے کہا کہ یہ سب بہ اطمینان طے ہو جائے گا۔ اور یہ بحث ضروری نہیں کہ عارضی طور پر ترکی فوج مصر میں رہے گی یا برطانوی۔ اس کے بعد جمال الدین کی ولف کے ساتھ قسطنطنیہ جانے کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ اصل سوال یہ تھا کہ سلطان اُن کو انگلستان کی پالسی کا مخالف جانتے ہیں۔ اور جب تک ولف صحیح حالات نہ بتائیں گے وہ یہی سمجھتے رہیں گے کہ جمال الدین ولف کے اغراض کے خلاف کوشش کرنے آئے ہیں۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔ ولف نے کہا کہ جمال الدین کے ساتھ علانیہ کوئی تعلّق ظاہر کرنا ان کے لیے دشواری کا باعث ہوگا۔۔۔۔۔۔۔۔ پھر خرچ کا سوال تھا میں نے کہا کہ شیخ کو جس قدر رُپے کی ضرورت ہوگی میں دوں گا۔۔۔"

۱۳ اراگست۔ چرچل کا ایک خط ملا جس کے ساتھ ولف کا ایک تار تھا جس میں لکھا تھا کہ جمال الدین کی قسطنطنیہ میں ضرورت ہے۔۔۔۔"

۱۴ اراگست۔ سید کو لے کر لندن گیا۔ انڈیا آفس میں رنڈلف سے ملا۔ میں نے اُن سے کہا کہ سید قسطنطنیہ جاتے ہیں مگر وہ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ولف سلطان کے کان میں یہ بات ڈال دے کہ اب جمال الدین انگلستان کے مخالف نہیں ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ اُن کے پہنچنے سے پہلے ولف گفتگو نہ کریں اور مصر کے سوال کو اسلامی اتحاد کے

سوال سے الگ نہ رکھا جائے۔ رنڈلف نے اسی وقت ولف کو ایک تار دیا جس کا مضمون یہ تھا کہ اتوار کو جمال الدین قسطنطنیہ سے روانہ ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سلطان اُن کو انگلستان کا دشمن سمجھتے ہیں اس لیے یہ بات سلطان کے کان میں ڈال دی جائے کہ اب وہ ہمارے دوست ہیں اور شیخ یہ بھی چاہتے ہیں کہ آپ اسلامی اتحاد کے سوال سے علیحدہ کرکے مصر کے سوال کو نہ اٹھائیں۔ ....

میں ابراہیم سے بھی ملا۔ میری تو رائے ہو کہ دونوں فوراً روانہ ہو جائیں۔ اور ولف کے جواب کا انتظار نہ کریں۔ کیا معلوم کہیں رائے بدل جائے اور جب کہ گیند ہمارے سامنے ہو ہم کو جرات کے ساتھ کھیل کھیلنا چاہیے۔ مجھے ڈر ہو کہ کہیں ولف اس تار سے جو شیخ کے اصرار پر دیا گیا ہو گھبرا نہ جائے اگر میری رائے پر عمل کیا جاتا تو میں یہ چاہتا تھا کہ شیخ بلا شرائط کے روانہ ہو جائیں۔

۱۵ر اگست۔ ایک تار سے معلوم ہوا کہ ولف نے اپنی روانگی منگل تک ملتوی کر دی ہو۔ اب جمال الدین ان کے ہمسفر ہو جائینگے۔

.........جیمس اسٹریٹ میں ایک خط ملا جس کو پڑھ کر سخت حیرت ہوئی۔ وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا، ولف نے جمال الدین کے سفر کے متعلق اپنی رائے بدل دی۔ رنڈلف کے سکریٹری کا ایک خط ملا جس کے ساتھ ولف کا ایک تار بھی تھا۔ کہ جمال الدین ابھی روانہ نہ ہوں۔ جب تک میں قسطنطنیہ سے تار نہ دوں .... میں رنڈلف سے ملا۔ اس تار کے بعد اُن کی رائے نہیں کہ جمال الدین روانہ ہوں۔ افسوس اس کا ہو کہ گفتگو کی شروع میں جمال الدین زیادہ مفید ثابت ہوتے مگر

اب کیا کیا جائے۔ سید ابراہیم کے ٹکٹ لے لیے گئے۔ اور میں نے شیخ کو سو پونڈ بھی دیدئے تھے۔ (میرا ہمیشہ یہ خیال رہا کہ اس رائے کی تبدیلی نے ولف کے مشن کو ناکام کیا اور ان کی ناکامی کا بڑا سبب یہی ہے کہ انھوں نے معمولی سیاست کے اصول پر گفتگو شروع کی اور سید کی اخلاقی امداد حاصل نہ کی جو قسطنطنیہ میں اور دوسرے مرکزوں پر خفیہ سوسائٹیوں کے متعلق شیخ سے حاصل ہو سکتی تھی ......

۲۷ر اگست۔ مور کا ایک خط آیا جس میں اس نے مجھے بلایا تھا میں اس سے ملا تو اس نے رنڈلف کے نام ولف کا ایک خط پڑھ کر سنایا جس میں لکھا تھا کہ ان کی پوزیشن اس قدر نازک تھی کہ جمال الدین سے اپنا تعلق ظاہر کرنا مناسب نہیں معلوم ہوا۔ جمال الدین سوڈان میں سلطان کی خلافت کے خلاف ہیں اور اگر ولف ان کو اپنا شریک بناتے تو سلطان شاید یہ سمجھتے تھے کہ سمجھوتہ کی تجویز میں ترکی خلافت کی مخالفت بھی مضمر ہے۔ اس وجہ سے ولف جمال الدین کا نام لینے کی جرات نہیں کرتے۔ یہ سب لغویت ہے۔ سلطان کی خلافت کا سوال ہی کیوں اٹھایا جائے۔ اور جمال الدین خلافت کے مخالف تو نہیں سمجھے جاتے بلکہ اُن کے اخبار میں تو ہمیشہ خلافت کے موافق مضامین نکلتے رہے ہیں۔ سید نے قسطنطنیہ جانے سے انکار کر دیا۔ جب تک کہ ولف ان کو نہ بلائیں اس لیے کہ انھوں نے کہا کہ اگر سلطان ان سے نہ ملے تو ان کے اثرات خراب ہو جائیں گے.......

۲۸ر اگست۔ رنڈلف سے جمال الدین کے متعلق باتیں ہوئیں مگر چونکہ جمال الدین ولف کے بلائے بغیر قسطنطنیہ جانے کے لیے تیار نہیں اور ولف بُلانا نہیں چاہتا اس لیے اس سوال کو ختم کر دیا گیا۔

۴ ستمبر۔ ابراہیم بے کے پاس اسمٰعیل جودت کا ایک خط آیا ہی یہ طے ہوا ہی کہ وہ جائیں گے۔ سلطان نے جمال الدین کے متعلق بھی سنا ہی کہ وہ ایک وزیر سے ملے تھے اور اب ابراہیم کو بلایا ہی تاکہ سب حال معلوم کریں۔ سلطان جمال الدین سے بھی ملنا چاہتے ہیں۔ مگر سید کہتے ہیں کہ وہ سلطان کی دعوت کا انتظار کریں گے۔..........

۶ ستمبر۔ ابراہیم قسطنطنیہ گئے۔ سید لندن میں فی الحال ٹھہرے ہوئے ہیں۔

۲۳ ستمبر۔ ابراہیم کا خط آیا ہی سلطان جمال الدین سے مشورہ کرنے کے لیے ایک آدمی بھیج رہے ہیں۔..........

۲۸ ستمبر۔ منیف پاشا لندن آئے۔ سید سے اور اُن سے ملاقات ہوئی..........

۶ اکتوبر۔ فرید بے ملنے آئے جمال الدین بھی موجود تھے مگر اُن کی موجودگی میں فرید بے نے کچھ نہیں کہا۔ جب جمال الدین اٹھ گئے تو اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ قسطنطنیہ کے حالات مایوس کُن ہیں اور بے چینی اس قدر عام ہی کہ اہم واقعات کے پیدا ہونے کا امکان ہی۔ سلطنت کے ٹکڑے ہو رہے ہیں مگر اب خطرہ ہی کہ ترکی قوم بھی اب ختم ہو جائے گی۔ اگر کوئی سدّباب نہ کیا گیا۔ اب ایسے لوگ جن میں (فرید بے) بھی ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ مدحت کے دستور کو پھر قایم کرنے کی کوشش کی جائے اور سلطان کے ہاتھ سے اختیارات نکال لیے جائیں۔ موجودہ سلطان میں عمل کی طاقت نہیں ہی مگر اُس نے سارے اختیارات اپنی وزارت میں جذب کر لیے ہیں اور حکومت جاسوسی کے ایک بہت بڑے نظم کے

ماتحت ہو رہی ہے۔ اب بغاوت غیر متوقع نہیں۔ اختیارات کسی قابل فوجی جنرل کو دیئے جائیں۔ اور سلطان کو معزول کیا جائے۔ اور کوئی شخص تخت پر بٹھایا جائے خواہ وہ خاندان سے ہو یا باہر کا۔ جس وجہ سے لوگ جھجکتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر قسطنطنیہ میں کوئی بدامنی ہوئی تو روس کو مداخلت کا بہانہ مل جائے گا۔

بسمارک دستوری حکومت کے احیا کی مخالفت کرے گا مگر شاید لارڈ سالسبری خلاف نہ ہوں وہ (فرید بے) یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ برطانوی حکومت روسی حکومت کی مداخلت کو روکے گی یا نہیں اور سلطان کا تغیر پسند کرے گی یا نہیں۔ ممکن ہے کہ عبدالمجید روس کے پھندے میں پڑ جائے اور اپنی رعایا کے خلاف روسی حفاظت حاصل کرے۔ اس امر کے متعلق کہ انگلستان ترکی میں انقلاب کو پسند کرے گا یا نہیں انھوں نے خواہش کی کہ کسی ذریعہ سے لارڈ سالسبری کے خیالات معلوم کیے جائیں۔ ....

۸ر اکتوبر۔ جمال الدین سے قسطنطنیہ کے حالات کے متعلق گفتگو ہوئی اور خلافت کے متعلق بھی اُن کی رائے یہ ہے کہ مہدی یا مہدی کے جانشین یا شریف عون کو سلطان کی جگہ خلیفہ بنایا جائے یا امام سنا کو۔ مگر قسطنطنیہ مرکزِ خلافت نہ رہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے خود شریف حسین سے کہا تھا کہ خلافت کا دعویٰ کریں مگر حسین نے کہا کہ بغیر فوج کے دعویٰ بیکار ہے اور عربوں کا متحد ہونا مشکل ہے۔ اب جمال الدین پھر مشرق کی طرف جانے کے لیے بے چین ہیں انھوں نے کہا کہ جب تک سلطان مدعو نہ کریں قسطنطنیہ نہ

جاؤں گا۔ میں نے بھی کہا کہ اگر پارلیمنٹ کے انتخاب میں مجھے کامیابی نہ ہوئی تو میں بھی یمن میں امام سنا کے پاس جاؤں گا۔ اور خلافت کا علم بلند کیا جائے گا۔ جیسا کہ میرا چار برس پہلے ارادہ تھا۔

۲۰ر اکتوبر۔ رات ہندوستانی نمایندوں کا جلسہ ادکلے ہال میں ہوا۔ ہم نے جمال الدین سے بھی تقریر کرائی انھوں نے عربی میں تقریر کی .... راما سوامی اور چند دار کر نے بھی تقریریں کیں ....

یہ تمام اقتباسات ایک اچھا عکس ہیں جمال الدین کے خیالات ارادوں اور بساط سیاست پہ اُن کی نقل و حرکت کا۔ نیز یہ اقتباسات اپنے اندر اس زمانہ کے برطانوی سیاست کی ایک دل چسپ جھلک رکھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں روس کے متعلق برطانوی مدبرین کے اندیشے بہت بڑھتے جاتے تھے اور شیخ بھی اپنی طرف سے اُن اندیشوں میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔ افغانستان کی طرف روسی پیش قدمی نے کچھ تو یوں ہی برطانوی دفتر خارجہ کو متردد کر رکھا تھا اور کچھ شیخ بھی اُس خطرہ کی طرف بار بار اشارے کرکے دلوں میں خوف پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اگرچہ افغانستان بہ ظاہر انگریزوں کا حلیف تھا حتٰی کہ بغیران کی وساطت کے کسی غیر سلطنت سے سیاسی تعلقات بھی نہ پیدا کر سکتا تھا۔ لیکن روسی خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کی حیثیت بہت کم تھی۔ پنجدہ پر جہاں افغانی فوجیں قابض تھیں دفعتاً روسی فوج نے حملہ کیا اور افغانی فوج کو وہاں سے نکال کر روسی جھنڈا نصب کر دیا۔ اس

سے پہلے روسی فوج کا آخری مرکز مرو افغانی سرحد سے دو سو میل
کے فاصلہ پر تھا مگر پنجدہ پر روسی فوج افغانستان سے صرف پچاس
میل رہ گئی اس لیے قدرتاً پنجدہ پر روسی قبضہ ایک زہر ملا کانٹا تھا۔
جو برطانوی مدبرین کے دلوں میں کھٹک رہا تھا۔ وہ روس کی اِس
چال کا کوئی نیا "توڑ" تلاش کر رہے تھے۔ تجویز زیرِ غور یہ تھی کہ
انگریز مصر و سوڈان سے اس شرط پر اپنی فوج واپس بلالیں کہ ترکی
ایران و افغانستان روس کے خلاف برطانیہ سے متحد ہو جانے کا وعدہ
کریں۔ گویا ایک طرف تو روس کے مقابلہ پر افغانستان کو کھڑا کر دیا جائے
اور دوسری طرف روسی سرحد پر ایران اور ترکی کا زور ڈلوایا جائے
اس طرح دونوں طرف روس کو متوجہ کر کے ہندوستان کی طرف سے
اُس کی توجہ ہٹا دی جائے۔ غالباً بلنٹ کی تحریک پر یہ خیال پیدا ہوا
تھا کہ ترکی و افغانستان وغیرہ سے معاملات طے کرنے کے لیے شیخ کو
واسطہ بنایا جائے اور اُن کے اثر و نفوذ سے کام لے کر روس کے خطرہ
کا ازالہ کیا جائے۔ شیخ کا اثر اُس وقت افغانستان میں بہت کم
تھا اور قراین یہ ہیں کہ امیر عبدالرحمٰن خاں شیخ کے سیاسی مسلک سے
بالکل متاثر نہ تھے۔ تاہم شیخ برطانوی حکومت پر یہ ظاہر کرتے رہے
کہ افغانستان میں اُن کی کوشش بارآور ہو سکتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ شیخ
مصر کی آزادی کی خاطر برطانوی وزارتِ خارجہ سے متفق ہو گئے تھے
اور یہ سمجھ کر کہ روسی خطرہ کا خیال انگریزوں کو بہت ستا رہا ہے وہ اِس
خطرہ کی اہمیت کو ہر موقعہ پر برطانوی مدبرین کے سامنے رکھ دیتے
تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ہندوستان کی طرف روسی پیش قدمی کا

سدّ باب کرنے کے لیے انگریز مصر کے قبضہ سے دست بردار ہوکر ترکی کو اپنا حلیف بنانا چاہتے ہیں تو وہ فوراً کوشش کرنے کے لیے تیار ہوگئے لیکن آخر وقت پر معلوم ہوتا ہے کہ ڈرمنڈ ولف کو یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں شیخ قسطنطنیہ میں پہنچ کر سلطان کی مطلقیت اور شہنشاہیت کے متعلق کوئی ایسی بات نہ کہ بیٹھیں کہ سلطان بدظن ہو جائیں اور اصل معاملہ بار آور نہ ہوسکے۔ اُس وقت قسطنطنیہ میں قوم پرستوں کی جماعت سلطان کے خلاف اور دستور حاصل کرنے کے لیے خفیہ کوششیں کر رہی تھی اور ولف کو یہ خیال ہوا ہوگا کہ کہیں شیخ بجائے اس کی امداد کرنے کے قسطنطنیہ پہنچ کر قوم پرستوں کی سازشوں میں شریک نہ ہو جائیں۔ بہر حال اس کے خیالات جو کچھ بھی ہوں عین وقت پر ولف کے انکار نے شیخ کو بہت برہم کر دیا۔ چنانچہ شیخ نے ارادہ کرلیا کہ برطانوی سیاست کی اندرونی ریشہ دوانیوں سے الگ رہ کر وہ اپنا راستہ اختیار کریں گے اور جیساکہ وہ بلنٹ کو بتا چکے تھے ان کا ارادہ تھا کہ انگریزوں کے خلاف روس افغانستان اور ترکی کو کسی طرح متحدد کر دیا جائے۔ روس میں زیادہ تر کانکوف[۵] کے ذریعہ سے وہ اپنی تجویز کو کامیاب بنانا چاہتے تھے معلوم

۵۔ (۱۸۱۸ء تا ۱۸۸۱ء) روسی افسانہ نویس جس کو اُس زمانہ کی روسی سیاسیات میں بہت دخل تھا اور جو اعلیٰ روسی طبقوں میں بہت با اثر کہا جاتا تھا ماسکو میں پیدا ہوا۔ اصلاحات کا حامی تھا اور عرصہ تک کوشش کرتا رہا کہ روسی حکومت آئینی اصلاحات نافذ کرے لیکن جب ملک میں نہلسٹ اور سوشلسٹ فرقوں کا زور زیادہ شروع ہوا تو اُس نے اپنی تحریک کو ملتوی کر دیا۔ اور شاہی اقتدار کا معاون ہوگیا ۱۸۶۳ء سے ۱۸۸۱ء تک روس کے مشہور اخبار ماسکو گزٹ کا ایڈیٹر رہا شیخ سے اُسکے تعلقات دوستانہ تھے۔

ہوتا ہی کہ پہلے براہِ راست افغانستان جاکر کوشش کرنے کے بجائے انھوں نے یہ بہتر سمجھا کہ اول روس جائیں اور پھر وہاں سے افغانستان۔ چنانچہ شیخ یہ منصوبہ لے کر آخر ۱۸۸۵ء میں انگلستان روانہ ہوئے۔

اس موقعہ پر بیجا نہ ہوگا اگر ہم عروۃ الوثقیٰ کے صفحات سے روس و ایران و افغانستان کے مسایل پر شیخ کے خیالات کا ایک عکس پیش کر دیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ کس طرح برطانوی مدبرین کو روس کی پیش قدمی اہلِ ہند کی بد دلی اور افغانیوں کی سیاست سے متاثر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عروۃ الوثقیٰ کی اشاعت مورخہ ۱۱ر ستمبر ۱۸۸۴ء میں انھوں نے ایران و افغانستان کے عنوان سے لکھا کہ:۔

"وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝"

ہندوستان پر روسی حملہ عنقریب ہوا چاہتا ہی۔ انگریزوں کی سیاست اور حرص پر یورپ کی سلطنتوں میں تقریریں کی جاتی ہیں جن سے روس کو اس کے مقاصد میں تقویت پہنچتی ہی اور اس کے لیے اسباب مفید پیدا ہوتے ہیں اور اس کے ہندوستان سے قریب پہنچنے کی مدّت کم ہوتی جاتی ہی۔ یہ ڈھنگ ہی سیاست کا۔ کیا اچھا ہو اگر اس وقت سفارتِ ایران امارتِ افغانستان کے ساتھ متحد ہو جائے تو ان دونوں کے لیے اس اتحاد میں بہت فواید ہیں۔ اگرچہ اہلِ ہند کی انگریزوں سے نفرت روس کے لیے مفید ہوگی مگر اس کے راستہ میں بہت سی مشکلات ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور وہ مشکلات ایران و افغانستان کی موالات ہی سے دفع ہو سکتی ہیں۔ روس ان راستوں سے ناواقف

ہی۔ اُس کو امرائے ہند کے ساتھ مواصلت کی ضرورت ہی۔ اس طرح کہ وہ (روس)، اہلِ ہند کی ضرورت کے موقعوں پر اُن کی مدد کرے اور اُن کی خواہشات پوری کرے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کا کوئی راستہ ایرانیوں اور افغانیوں کے اتحاد کے علاوہ نہیں ہی۔ وہ ایسا اتحاد ہو کہ دونوں جنگ اور صلح میں شریک رہیں۔ روس کے لیے آسان نہیں ہی کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے ایران و افغانستان سے مدد حاصل کر سکے اِلّا اس صورت میں کہ وہ ان دونوں کو اپنا شریک بنائے اور مالِ غنیمت اور نفع میں حصہ دینے کا وعدہ کرے۔ اگر یہ نہ ہوگا تو روس کے مقاصد میں بلاشبہ بڑی رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔

روس کے لیے کیونکر ممکن ہوگا کہ بغیر رہنمائی کے وہ ہندوستان کے راستوں پر جہاں شیروں کے جنگل ہیں بہ آسانی جا سکے۔ کیونکر ممکن ہوگا کہ وہ تنگ گزرگاہوں سے بغیر دوسروں کی امداد حاصل کیے گزر سکے۔ روس اس معاملہ کی مشکلات سے ناواقف نہیں ہی اور وہ جانتا ہی کہ ایک بڑی قوم کا (انگریزوں کا) اس ملک سے ہٹا دینا جہاں وہ سالہا سال سے جمی ہوئی ہی اور رتبہ اور افتخار حاصل کر چکی ہی بہت بڑا کام ہی اور اُس کے لیے ضرورت ہی بہت سے مددگاروں اور بہی خواہوں کی۔ روس کے سامنے سوائے افغانستان اور ایران کے کوئی نہیں جس سے وہ امداد حاصل کر سکے۔ یہ حکمت عملی صحیح نہ ہوگی کہ روس ان دونوں کو الگ کرکے ہندوستان کی فتح کے منافع تنہا خود حاصل کرنا چاہے جب کہ وہ خود ابوابِ ہند کو محض تجارت کے لیے

فتح کرنا چاہتا ہے۔ افغانیوں پر لازم ہے کہ اس معاملہ میں اپنے عظیم الشان فواید کو وہ عقلِ رشید اور فکرِ سدید کے ساتھ دیکھیں اور اپنی آنکھیں کھولیں اور ایرانی بھائیوں کی طرف اتحاد اور اتفاق کی غرض سے بڑھیں۔ درحقیقت ان دونوں کے درمیان کوئی بات ایسی نہیں جس کی بنا پر اختلاف کو حق بجانب کہا جائے۔ دونوں کی اصل ایک ہے اور دونوں ایک ہی رشتہ میں منسلک ہیں اور وہ بہترین رشتہ ہے یعنی دینِ اسلام۔ ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ ایسے وقت میں ان کا باہم اختلاف نہ صرف اُن کے اور ان کے ایرانی بھائیوں کے لیے ضرر رساں ہوگا بلکہ تمام مذہبی بھائیوں کو سخت مضرت پہنچے گی۔ پس ایرانیوں اور افغانیوں پر لازم ہے کہ اپنے جنسی رشتہ کو دیکھیں اور اپنے مذہب کے فروعی اختلاف کو کلمۂ اسلام کی بے عزّتی اور رشتۂ اتحاد کے ٹوٹنے کا سبب نہ بنائیں۔ اس لیے کہ یہ عقل کے خلاف بات ہے کہ جزو کے اختلاف کی وجہ سے کل کو کمزور کر دیا جائے۔

میرے خیال میں دونوں فریق جانتے ہیں کہ اُن کا باہمی اختلاف ہی ان پر مصیبت لایا ہے۔ گزشتہ زمانہ کے بعض سیاست دانوں نے اس فروعی اختلاف کو تفرقہ پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا تھا اور اپنی اس تخم ریزی سے انھوں نے منافع بھی حاصل کیے۔ لیکن اب اس درخت سے سوائے ہلاکت اور فساد کے کوئی پھل نہیں مل سکتا۔ اور میرا یہ خیال کسی عقلمند انسان پر مخفی نہیں۔

افغانیوں کے لیے اس وقت ہرگز جائز نہیں ہے کہ وہ فروعی اختلاف کو لے کر کھڑے ہوں۔ ان کو تو اب وحدتِ اصلی کی طرف بڑھنا چاہیے

اس لیے کہ خطرات نے اُن کو ہر طرف سے گھیر لیا ہے اور ان کے لیے نجات کا کوئی راستہ نہیں سوائے ایرانی بھائیوں سے نجات حاصل کرنے کے۔ یہ وقت بہت قابلِ قدر وقت ہے اور اس فرصت کو غنیمت سمجھنا چاہیے اور افغانیوں کے لئے اس معاملہ میں عذر کی کوئی گنجائش نہیں۔ خصوصاً ایسے وقت میں جب کہ سلطنتِ ایران کی صدارت کا ایسا بڑا عظیم القدر رفیع الشان واسع العرفان شخص والی ہوا ہے جو وحدت کی حالت دیکھ کر کثرت کی حالت کا اندازہ کر لیتا ہے جو مناسب موقع پاکر کام کرنے سے نہیں رکتا ہے اور وہ ایسا شخص ہے کہ اس کو تفرقہ کے مظاہرے اتحاد کے مقاصد سے بے نیاز نہیں کرتے۔ وہ ایک چیز سے بہت سی چیزیں سمجھ لیتا ہے اتحاد اس کا مشرب ہے۔ اور ائتلاف اس کا مذہب ہے۔ میرے خیال میں تو وہ ہر ایرانی کے لیے ایک رحم کرنے والا باپ ہے۔ وہ ان کے کلمہ کو جمع کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتا ہے اور کبھی اختلافِ مذہب اور فروعی تفرقہ کا خیال نہیں کرتا جس جماعت کو وہ اپنے ساتھ شامل کرتا ہے وہ اس کا بہت لحاظ کرتا ہے اس لئے افغانیوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے ایرانی بھائیوں کو حلف دینے کے لیے اپنے ہاتھ بڑھائیں اور اس فرصت کو ضائع نہ کریں۔ دونوں فریقوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے اتحاد و اتفاق کو اپنے وطن کی شہر پناہ بنائیں اور اپنے دشمنوں کو ذلیل کرنے کا آلہ کار۔ اور اپنے شہریوں کو عافیت و امن کا ذمہ دار بنائیں۔ بلاشبہ اس طرح وہ شرفِ عظیم اور ہمیشہ قایم رہنے والی عزت حاصل کر سکیں گے"۔

پھر ۱۶ اکتوبر ۱۸۸۳ء کی اشاعت میں شیخ نے "برطانیہ روس

اور اسلامی ممالک" کے مسائل پر اس طرح اپنے احساسات ظاہر کئے کہ۔
"تمام یورپ کی سلطنتیں اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے کے لیے کھڑی ہوگئی ہیں اور مصر کے متعلق اپنے وعدوں کا ایفا چاہتی ہیں۔ خصوصاً فرانس اور جرمنی۔ ان میں سے ہر ایک انگریزوں سے مطالبہ کر رہا ہو کہ مصر کے متعلق وہ اپنے وعدے پورے کریں اور اُن وعدوں پر حجت قایم کرتے ہیں مختلف صورتوں سے اور متعدد طریقوں سے۔
محمد احمد اور اُن کے پیروں نے اپنے زراعتی کاموں سے فرصت پاکر اب اپنے ذخایر کو تیار کرلیا ہو اور بہت بڑے لشکر جمع کئے ہیں اور وہ دوصد اور بربر کے اطراف کا قصد کر رہے ہیں۔ آخری خبریں اطلاع دیتی ہیں کہ انھوں نے اپنے دونوں لشکروں کو دونوں طرف بھیجا ہو۔ ایک صحرا کی طرف سے حملہ کرے گا اور دوسرا خط نیل پر..........
اور اہلِ ہند بھی اپنے حکام سے برگشتہ ہوگئے ہیں اور باوجود اپنی ظاہری عاجزی کے بددلی اور دل کا کینہ انگریزوں کے خلاف ظاہر کرنے لگے ہیں۔ خصوصاً والیان ریاست کی طرف سے جو انگریزی حکومت کے حملہ کا اندیشہ کر رہے ہیں انگریز بہت غیر مطمئن اور پریشان ہیں اور وہ اپنے ارادوں پر اس قدر مستحکم ہوگئے ہیں کہ انھوں نے چند لوگوں کو سرخس۔ مرو۔ عشق آباد بھیجا۔ تاکہ ان کی طرف سے یہ لوگ روس کے ساتھ اخلاص اور ہمدردی کا اظہار کریں اور انگریزوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی خواہش کو بھی روسیوں پر ظاہر

کردیں۔ ان تمام واقعات نے انگریز سیاست دانوں کے خیالات میں سخت پریشانی اور کھلبلی مچا دی ہے............

انگریز شاید یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی اس تمسخر انگیز پالیسی کے ساتھ دوسری سلطنتوں سے کھیلتے رہیں گے۔ دوسری طرف وہ اپنی اور اپنی قوم کے اسلحہ کو تیار کر رہے ہیں اور اس طرح دوسروں کو دھوکہ دے کر اپنے اندیشوں اور وہموں کو طفلانہ طریق پر مٹانا چاہتے ہیں۔ اس پالیسی کو ممالک ہند میں وہ اپنی سیاست کی بنیاد سمجھتے ہیں (اور اس پر لارڈ ڈفرن نے ممالک ہند کے حفاظت کے لئے۔ بھروسہ کیا) یہ ڈفرن وہ ہے جس نے مصر میں فساد برپا کیا ہے۔ جب وہ مصر میں فساد برپا کر چکا تو اس کو ہندوستان پر حکمردار بنایا گیا۔ بلفاسٹ میں تقریر کرتے ہوئے ڈفرن نے کہا کہ "میں اپنے کو سعید سمجھتا ہوں اس لیے کہ مجھے موسیو جیرس روسی وزیر خارجہ کے متعلق واقفیت حاصل ہے" اس کے بعد ڈفرن نے اپنی تقریر میں موسیو جیرس کی بہت تعریف کی اور کہا کہ میں موسیو جیرس کے دل میں انگریز اور روس کے درمیان صلح اور امن قایم کرنے کی سچی خواہش اور رغبت پاتا ہوں"۔ اخبار الموميريال دو بلماٹیک نے تو روس کو لارڈ موصوف کی اس نئی پالیسی پر مبارک باد دیتے ہوئے لکھا کہ باوجودیکہ لارڈ موصوف معاہدات کا بہت خیال رکھتے ہیں لیکن حال یہ ہے کہ دوسری طرف افغانستان کے شمال میں جنگ ہورہی ہے اور یہ سب باتیں انگلستان کے لوگوں اور ہندوستانیوں کو دھوکہ دینے کے لیے کہی جاتی ہیں بعض اوقات خود لارڈ ڈفرن اپنے نفس کو بھی دھوکا دیتے ہیں......

روس ایک قدم بھی مشرق کی طرف نہیں بڑھتا مگر ہندوستان پر قبضہ کرنے کے لیے۔ اور اس کا کوئی قدم اپنے کسی نہ کسی وعدے کو شکست کئے بغیر نہیں بڑھتا۔ اگر وزیر روس نے پھر اس دفعہ لارڈ ڈفرن سے کوئی وعدہ کیا تو یہ حلف بھی گزرے ہوئے اور توڑے ہوئے وعدوں سے کچھ مختلف نہ ہوگا۔ ذاتی محبت اور تعلقات کا سیاسیات میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اور ذاتی تعلقات پر بھروسہ کرنا انگریزوں کی بدعقلی اور کمزوری کی دلیل ہے ....

سبحان اللہ روس نے تو بابِ ہند (سرخس) پر قبضہ کر لیا اس کی شہرت ان اطراف میں پھیل گئی۔ اہلِ سرخس کے دل اس کی طرف مایل ہیں۔ نہ وہ انگریزوں سے ڈرتا ہے نہ اپنی رفتار کم کرتا ہے۔ تو پھر آج کے دن کے بعد انگریز کیوں خطرہ محسوس کریں گے۔ یہاں تک کہ روس پنجاب میں نازل نہ ہو جائے یا نہر سندھ سے گزر نہ جائے ....

روس کے بڑھنے کی یہی حالت رہی تو مشرق میں برطانوی قبضہ کم ہوتا جائے گا اور برطانوی طاقت کو گرہن لگ جائے گا ....

قضا و قدر کا فیصلہ تو صادر ہو چکا ہے اور کہ دیا گیا ہے کہ "بُعْداً لِلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ"

روس

مسلمانانِ بلخ و بخارا کے تعلقات شیخ کے ساتھ عقیدت مندانہ تھے اور غالباً ازہر کے ذریعہ سے شیخ کی شہرت وہاں تک پہنچی تھی مگر اس تمام کھیل کا جو شیخ کھیلنا چاہتے تھے ایک مہرہ بہت کمزور تھا یعنی امیر عبدالرحمٰن خاں۔ امیر عبدالرحمٰن خاں نہ صرف

شیخ کے سیاسی مسلک سے متفق نہ تھے بلکہ اُن کی سیاست کا رُخ شیخ کی تجاویز سے بالکل مختلف تھا اور وہ روس اور انگلستان دونوں سے اپنے تعلقات قایم رکھ کر ان دو رقیبوں کی رقابت سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے اور کسی طرح اس کے لیے تیار نہ تھے کہ ان دونوں میں سے کسی سے بھی بگاڑیں۔ اس لیے شیخ کا یہ سفر کچھ زیادہ نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوا۔ نیز اس سفر کے کچھ زیادہ حالات بھی معلوم نہیں۔ تاہم شیخ کی زندگی کا یہ زمانہ بہت طوفانی تھا اور ان کے اس سفر روس اور مقاصدِ سفر کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اُن کے "دریائے بیتابی" کی یہ بھی صرف "ایک موجِ خون" تھی۔

متضاد روایتوں اور مختلف بیانات کی وجہ سے ان کی زندگی کے واقعات کی زنجیر پھر اس جگہ اُلجھ گئی ہے اور ان کے سفر و حضر کے صحیح راستے تاریخیں اور واقعات سب مشتبہ ہو گئے ہیں۔ کب گئے، کس راستے سے گئے، کتنے عرصہ قیام کیا! یہ سب مشتبہ ہے۔ سوائے اس امر کے کہ وہ لندن و پیرس سے روانہ ہو کر روس گئے ضرور۔

اس زمانہ میں روسی مسلمانوں کے حالات بہت خراب ہو رہے تھے۔ زار کی حکومت میں اسلامی آبادی ایک کروڑ چالیس لاکھ کے قریب تھی۔ ۲۹ روسی صوبوں میں ۵ ہزار کے قریب اسلامی مکاتب و مساجد تھیں اور ۸ ہزار کے قریب علما اور مدرسین تھے۔ مذہبی تعلیم کا بہت بڑا مرکز بخارا تھا۔ کم و بیش ایک صدی اِن مسلمانوں پر ایسی گزر چکی تھی جب کہ زار کی شہنشاہیت نے ان پر ہر قسم کا ظلم و

ستم روا رکھا تھا حتیٰ کہ ان کے حقوق عام روسی رعایا کے حقوق سے بھی کم تھے مگر یہی ظلم و ستم تھا جس نے ان کے مردہ جسموں میں زندگی کی حرارت کو قایم رکھا بلکہ ان کے اندر ان کی مظلومیت نے ایک خاص قومی تحریک پیدا کر دی تھی۔ انیسویں صدی کے شروع میں انھوں نے دوسرے اسلامی ممالک خصوصاً ترکی سے تعلقات پیدا کرنے شروع کر دیے تھے ان کا ایک اخبار ترجمان با وجود حکومت کی ممانعت کے کثیر تعداد میں شائع ہوتا تھا اور کریمیا، کوہ قاف سائبیریا ترکستان و چین میں بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا تھا جس قدر حکومت کی تعدی بڑھتی تھی اسی قدر روسی مسلمانوں کی قومی تحریکات بھی قوی ہوتی جاتی تھیں۔ انیسویں صدی کے شروع میں انھوں نے ایک عرضداشت زار اور سلطان ترکی کی خدمت میں پیش کی جس میں اُن مذہبی مصایب کا ذکر کیا گیا تھا جو حکومت کی سختی کی وجہ سے روسی مسلمانوں کو پیش آ رہے تھے۔ پروفیسر ونیبری نے اپنی ایک کتاب[۹] میں ان مظالم کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ روسی مسلمان تحریک اتحاد سے متاثر ہونے لگے تھے۔

بہر حال شیخ جس زمانہ میں وہاں پہنچے وہ زمانہ روسی مسلمانوں کے لیے سخت ابتلا کا زمانہ تھا۔ شیخ کے بعض شاگردوں کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ اپنے دورانِ قیام میں شیخ نے مسئلہ سیاسیات مسلمانان و حکومتِ روسیہ کے متعلق ارکانِ حکومت سے تبادلۂ خیالات کیا۔

اُس وقت تک روس میں قرآنِ مجید اور مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کی اشاعت بھی ممنوع تھی اور کہا جاتا ہے کہ شیخ ہی کی کوشش سے یہ ممانعت منسوخ ہوئی۔

اس دفعہ روس میں شیخ کا قیام ایک سال سے زیادہ نہیں رہا۔ اور وہاں سے شیخ اپنے منصوبوں میں ناکام ہوکر پھر یورپ کی طرف لوٹے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ روس سے براہ وسطِ ایشیا اور افغانستان بھی گئے مگر اس کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ بہر حال اب ان کا رُخ ایران اور ترکی کی طرف تھا۔ اور بظاہر روس اور افغانستان سے اُن کی دل چسپی ختم ہو رہی تھی۔

بوشہر

۱۸۸۵ء کے آخر یا ۱۸۸۶ء کے شروع میں شیخ روس سے واپس آئے۔ اور غالباً پیرس ہوتے ہوئے بوشہر چلے گئے۔ مرزا محمد علی خاں سدید السلطنت (پسر حاجی خان مرحوم وزیر مسقط) نے رسالہ کاوہ (برلن) کے شمارہ ۵ نمبر ۹ مورخہ ستمبر ۱۹۲۱ء میں شیخ کے قیام بوشہرہ کا ذکر کیا ہے۔ مرزا احمد علی خاں لکھتے ہیں کہ شعبان ۱۳۰۳ھ ہجری¹ میں شیخ بوشہر تشریف لائے اور ان کے والد مرحوم کے مہمان رہے۔

"اس عرصہ میں میری تعلیم و تربیت سید صاحب کے سپرد رہی۔ میری عمر بارہ سال کی تھی اور مجھے علوم جدیدہ کا درس دیا جاتا تھا۔ میرے لیے سید صاحب نے جو کتابیں منتخب فرمائی تھیں۔ ان میں کتاب جغرافیہ و ہیئت مولفہ مرزا عبدالقادر نجم الملک مرحوم۔ سیرت

۱۔ مطابق جون ۱۸۸۶ء۔

نپولین مطبوعہ پیرس اور ترجمہ گلستانِ سعدی مطبوعہ مصر و کتاب کلیلہ دو منہ مطبوعہ بمبئی۔ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سب کتابیں سید صاحب نے اپنے کتب خانہ سے عنایت فرمائی تھیں.........

سید صاحب نے ناسخ التاریخ پڑھنے سے منع فرمایا تھا۔ حاجی نجم الدولہ کی کتاب ختم کرنے پر سید صاحب نے ایک چھوٹا سا کرۂ ارض مجھے ہدیہ فرمایا تھا۔مرزا نصر اللہ اصفہانی اور فرصت شیرازی (مرزا نصیر حسین شیرازی فرصت الدولہ) ان کے قیام بوشہر کے زمانہ میں ان سے بہت ارتباط رکھتے تھے۔ سید صاحب تقریباً تین ماہ یہاں رہے اور اس کے بعد ماہ ذیقعدہ میں محمد حسن خاں اعتماد السلطنت نے شاہ کی طرف سے سید صاحب کی خدمت میں ایک تار بھیجا۔ اور طہران آنے کی دعوت دی چنانچہ سید صاحب اسی مہینہ میں خسرو نامی غلام کو ہمراہ لے کر طہران تشریف لے گئے۔"

ایران شیراز و اصفہان ہوتے ہوئے۔شیخ آخر ۱۸۸۶ء میں واردِ طہران ہوئے۔مرزا لطف اللہ شیخ کے ایران آنے کا حال یوں لکھتا ہے:۔

"ظلِ السلطان نے شیخ کے اصفہان پہنچنے کی اطلاع بذریعۂ تار دربارِ ایران کو دی اور شیخ سے درخواست کی کہ وہ دس دن ان کے مہمان رہیں۔جب تک وہ اصفہان میں رہے ظل السلطان کو معارف انتظام و عدالت سمجھاتے رہے۔ دس دن بعد اصفہان سے طہران روانہ ہوئے۔"

سہام السلطنت مصطفٰے قلی خاں نے جو اُس وقت حاکم یزد و کاشان تھے شیخ کی مہمانداری کی اور اپنے چند آدمی اُن کی خدمت



ناصرالدین شاہ قاچار
پیدائش ۱۷ جولائی ۱۸۳۱ء، تخت نشینی ۱۷ ستمبر ۱۸۴۸ء،
قتل یکم مئی ۱۸۹۶ء

کے لیے ساتھ کر دئیے - ۲۲ ربیع الثانی ۱۳۰۳ھ ہجری کو شیخ طہران پہنچے۔ اور حاج محمد حسن امین الضرب کے مہمان ہوئے - طہران میں حکومت کی جانب سے اُن کا شاندار استقبال کیا گیا -

چون بطہران واصل شد بصورتِ بسیار اہتمام استقبال کردہ شدند - ۵ "

شاہ سے شیخ کی پہلی ملاقات کے متعلق آقا سید حسن خاں نے اپنے بیان میں جس کو مرزا لطف اللہ نے اپنی کتاب میں بجنسہ چھاپا ہے ایک خوب لطیفہ لکھا ہے۔

"اعلیٰ حضرت فرمودند - ازمن چہ می خواہی - سید گفت" دو گوش!" شاہ از جرات او متعجب شد"

لطف اللہ خاں اس ملاقات کا حال اس طرح لکھتے ہیں کہ

" ناصرالدین خاں در روز ملاقات بہ سید می گویند از ایں کہ دعوتِ مارا اجابت و متحمل مسافرت بہ ایران شدہ آید و شما را ملاقات نمودم بسیار خوش وقتم و حضرتِ شما بہ ہر لباسے کہ می باشید من شما را می شناسیم"

مرزا لطف اللہ نے اس گفتگو کو لفظاً لفظاً نقل کیا ہے اور اس میں شیخ کی زبان سے یہ بھی کہلوایا ہے کہ " بلے ایرانی واسد آبادی ہستم" مرزا لطف اللہ موقعہ ہو یا نہ ہو ہر جگہ شیخ کے ایرانی ہونے کی بحث کو ضرور ٹھونس دیتے ہیں -اول تو یہ ممکن نہیں ہے کہ شاہ اور شیخ کی گفتگو لفظاً لفظاً مرزا نے سُنی ہو- اور اس کو یاد رکھا ہو اور نہ یہ قرین قیاس ہے کہ شیخ نے ایک نوجوان لڑکے سے وہ گفتگو بیان کی

---

۵ - جریدہ مصورہ استانبول-

ہو اور نہ خود مرزا یہ لکھتے ہیں کہ شیخ نے یہ گفتگو اُن سے بیان کی تھی یا اس وقت انھوں نے شیخ کے مفصل بیان کو قلمبند کر لیا تھا۔ بہر حال جس قدر واقعات معلوم ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دفعہ ایران میں شیخ کے زیادہ قیام کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی بلکہ بہت جلد ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ شیخ کو ایران سے رخصت ہونا پڑا۔ ان اسباب کے متعلق مختلف بیانات ہمارے سامنے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ نے شیخ سے خواہش کی کہ وہ نظم حکومت میں اصلاحات تجویز کریں لیکن جب شیخ نے کچھ تجاویز پیش کیں تو وہ نہ صرف شاہ کے منشا کے خلاف تھیں بلکہ تمام امرا اور اراکین سلطنت بھی اُن تجاویز کو دیکھ کر بہت ناخوش ہوئے اس لیے کہ نہ تو شاہ اور نہ اُس کے درباری کسی ایسی تجویز کو پسند کر سکتے تھے جو شاہی اقتدار کو کمزور کرنے والی ہوتی اس لیے کہ تمام اُمرا و وزرا کے ذاتی فوائد اسی اقتدار سے وابستہ تھے۔ غالباً شیخ کی طرف شاہ نے زیادہ تر اس وجہ سے توجہ کی تھی کہ شاہِ روس کی زبردستیوں سے تنگ آگیا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ چونکہ شیخ کے اثرات روس میں کافی ہیں وہ کوئی سمجھوتہ کرا سکیں گے لیکن بعد کو شیخ کے یہی اثرات شاہ کی بدگمانی کا باعث ہو گئے۔ وہ واقعہ یوں ہے کہ جس زمانہ میں شیخ طہران آئے تھے۔ شاہ نے اتفاقاً گیلان کا سفر اختیار کیا لیکن موسمِ سرما کی شدّت سے مجبور ہو کر قزوین لوٹ آیا۔ طہران میں شاہ کی غیر حاضری کے زمانہ میں شیخ نے حسب عادت نہایت جرات کے ساتھ اصلاحات کے نفاذ اور استبدادِ حکومت کے متعلق گفتگو

کرنی شروع کی ۔ اب امرا نے شاہ کو یہ بتایا کہ اصفہان میں جب ظل السلطان[۱۱۶]
نے شیخ کی بہت مدارات کی تھی تو اس کا باعث یہ تھا کہ ظل السلطان
یہ چاہتا تھا کہ شیخ روس میں اپنے اثرات سے کام لے کر حکومتِ
روسیہ کا زور شاہ پر ڈلوائیں تاکہ شاہ ظلِ السلطان کو اپنا جانشین
اور وارثِ تاج و تخت قبول کر لے ۔ تعجب نہیں کہ شاہ کے دل
میں یہ بات بیٹھ گئی ہو اور تعجب نہیں کہ امرا کے اس بیان میں
کسی حد تک کچھ اصلیت بھی ہو غرضکہ ۔

"چوں روز بروز سید جمال الدین افغانی در ایران مشہور گردید
و شہرت او زیادہ شدہ می رفت ایں مسئلہ بہ طبیعت شاہ بد خورد۔
بنا، علیہ جمال الدین افغانی مستحضر شدہ از ایران بطرف روسیہ
حرکت نمود" ؎

اس مختصر بیان کے علاوہ اور بھی بیانات نقل کرنے کے قابل ہیں
جن سے شیخ کے ایران سے رخصت ہونے کے اسباب پر کافی روشنی
پڑتی ہے ۔ آقا سید حسن خاں کے بیان کو مرزا لطف نے بھی نقل کیا ہے۔

"......... ولے انگلیسہا کہ در کمیں بودند بہر
وسیلہ کہ بود بطور غیر مستقیم ذہن شاہ را نسبت بہ او مسموم کردند طغیان
اعرابی پاشا و خروج مہدی سوڈانی و عزلِ خدیو مصر ہمہ را با شاہ بیان

؎ مظفر الدین شاہ کا بڑا بھائی جو گورنر اصفہان تھا۔ مگر مظفر الدین
روس اور انگلستان کی اعانت سے تخت نشین ہوا اور ظل السلطان محروم
رہ گیا۔ وہ تخت کا حق دار سمجھا جاتا مگر ناصر الدین نے اپنے چھوٹے بھائی کو اپنا
جانشین نامزد کیا۔ ؎۱۱۶ - جریدہ مصورہ استانبول ۔

آوردند بطورے کہ ماندن سید با تغیر عقیدہ شاہ در ایران مشکل شد......"
خود مرزا لطف اللہ حسب عادت بہت طوالتِ کلام کے ساتھ ان واقعات میں پھول پتے بناتے ہیں۔

"..........سید ہم بہ آں نفوذ کلمہ و قوۃ خطابہ موثرے کہ داشت در طہران ہم مانند ہمہ جا با کمال جرات و صراحت از خرابی اوضاع مملکت و لزوم اصلاحات و ترقی و تمدن بر ضد استبداد حرف می زد۔ و کلمہ حریت و مدنیت را در میان کلمہائے روشن جا داد......"

دمستقیماً در مقامِ ارشاد و تنبیہ این ملت بخت برگشتہ خواب رفتہ برآمد دبطورے کہ در خور آب و ہوائے طہران بود از انتشار لوایح دمقالات جانسوز در محضر علماء و اعیان و اکابر و تجار و اتقا بمواعظ متوسل گردیدند۔

ایں نفس آتشین بقدر ذرہ بر دل ایں ملت اثر نکرد......

تا این کہ بواسطہ نقص عیش ہمایوں و سلب لاحدی کہ لازمہ صلاح است و بعضے از وزرائے خائینِ خود خواہ و پارہ از علمائے سوء کہ ہمہ وقت از عوامِ مردم استفادہ کردہ اند بتحریک و ہمدستی دستہائے اجنبی متفق و در مقام شکایت و مغلطہ کاری برآمدند و از روئے اغراض شخصیہ وطنِ عزیز مارا خراب خواستند و راضی بہ اطاعت اجانب شدہ در مقام ضدیت برآمدند و ناصرالدین شاہ را بہ سخنان غرض آمیز زیادہ از حدِ خائف نمودند کہ مبادا اساسِ مدنیت و مشروطیت در ایران استوار و برقرار شدہ وجود خبیث خاینِ شاں نابود و عاطل گردد۔ تا ایں کہ اولیائے دولتِ خاصہ مرزا علی اصغر خان صدرِ اعظم خاین کہ مذاق سید در مزاجِ آں مانند سم قاتل بود شاہ سادہ

لوح را از وعدہ خود پشیمان نمودہ و خاطرش را از سید رنجانیدہ و بحدے سعایت نمودند کہ گفتند کہ اگر چہار روز دیگر سید در طہران بماند سلطنت را صاحب و شما را خلع خواہد کرد۔ شاہ بسیار متوحش شدہ مجرمانہ بحاجی سید محمد حسن امین الضرب کہ میزبان سید بودہ ابلاغ می نماید کہ توقف سید جمال الدین را در طہران بجہاتے چند مناسب نمی دانم بہ ایشاں بگوئید کہ چندے بروند و بہ خراسان باشند تا وقتے مناسب دیدہ ایشاں را بطلبیم۔ حاجی محمد حسن فرمایش شاہ را بہ سید می رساند۔ جواب می گویند کہ حال کہ زمستاں است وقتے کہ موسم بہتر شود بہر جا کہ خود میل داشتہ باشم خواہم رفت پس از گزشتن زمستاں و اعتدال ہوا ایں محضر را بناصر الدین شاہ نوشتند۔

عزم نجد و قطیف را داشتم صنیع الدولہ اعتماد السلطنۃ برحسب امر شہریاری بہ دار الخلافہ دعوتم نمود۔ امتثال نمودہ آمدم بحمد اللہ شرف حاصل شد۔ اکنوں قصد عزیمت فرنگستان را دارم۔ اجازہ سلطان را فریضہ ذمہ خود می دانم۔ و بجز استحصال اذن مقصد دیگر نیست البتہ ہر جا باشم خود را خادم مقاصدِ عالیہ و مساعد افکار شہریاری کہ حفاظتِ دین صیانتِ مسلمین است می دانم۔

شاہ نے اس معروضہ کا حسبِ ذیل جواب بھیجا:۔

جناب آقائے سید جمال الدین مقصود از ملاقات شما حاصل شد اکنوں کہ می خواہید بہ فرنگستان بہ روید بسیار خوب است محض ایں کہ وجود مبارک ما را در نظر داشتہ باشید و فراموش نہ نمایند۔ یک انفیہ دان الماس جہتِ شما فرستادم و ما ہم ہیچ وقتِ شما را فراموش نخواہیم کرد۔ شہر رجب ۱۳۰۴ھ ہجری۔

مرزا علی اصغر خاں کہ در آں وقت امین السلطنت بود انقیہ داں آوردہ بہ ضمیمہ ہزار تومان با یک حلقۂ انگشتری الماس ہم از خود تقدیم می نماید - آن اولین فدائے راہ اسلام وجہ را عیناً رو نمود - انگشتری را حضور امین السلطنۃ بہ محمد حسن آقا پسر مرحوم خاص محمد حسن امین الضرب بخشیدند - ...."

معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک روس کے مدبرین سے شیخ کی کچھ امیدیں وابستہ تھیں اور وہ سمجھتے تھے کہ وہاں ممکن ہے کہ اُن کے مقاصد تقویت حاصل کرسکیں اس لیے ایران سے وہ پھر روس کی طرف روانہ ہوئے -

روس - دوسرا سفر

۱۸۸۷ء میں شیخ پھر روس پہنچ گئے اور کم و بیش دو سال تک وہاں مقیم رہے - افسوس ہے کہ اس زمانے کے حالات اور مشاغل بہت کم معلوم ہو سکے - سوائے اس کے کہ وہ پہلے ماسکو میں کچھ عرصہ تک آغا مرزا نعمت اللہ خاں اصفہانی کے مہمان رہے - یہاں کاتکوف سے اکثر ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں - اور شیخ بدستور وہی کوشش کرتے رہے کہ افغانستان اور روس کے درمیان اتحاد کرادیں اس کام میں ان کا بڑا مددگار کاتکوف ہی تھا - وہ خود صرف ایک اخبار نویس ہی نہ تھا بلکہ سلافی قوم کا ایک بااثر لیڈر سمجھا جاتا تھا - وہ انگریزی اقتدار کا سخت ترین مخالف تھا اور شیخ کی تحریک سے پہلے ہی مشرق میں انگریزی اقتدار کے خلاف بہت سی تدبیریں سوچ رہا تھا - کہا تو یہ جاتا ہے کہ اُسی کی دعوت پر دوبارہ شیخ روس گئے لیکن شیخ کے وہاں پہنچنے کے چند ہی روز بعد کاتکوف کا

انتقال ہوگیا اور شیخ کی جو تجاویز خاص اُس کی ذات سے وابستہ تھیں وہ سب ناکام رہیں۔ ماسکو سے شیخ پیٹرو گراد چلے گئے اور چند روز وہاں مقیم رہے کہا جاتا ہے کہ وہاں ان کی ملاقاتیں زار روس سے بھی ہوتی رہیں بلکہ ایک بیان تو یہ ہے کہ زار نے ان کو مسلمانوں کا شیخ الاسلام بنانا چاہا۔

"در روسیہ زارِ روس با سید جمال الدین افغان ملاقات کرد و بشار الیہ عہدۂ شیخ الاسلام مسلمین موجودہ روسیہ را تکلیف کرد۔ اما سید جمال الدین افغانی با ایں صورت جواب داد کہ من ذاتم بطریق مسلمانان می باشم......" ؎۵

"من ذاتم بطریق مسلمانان می باشم" کا مفہوم غالباً یہ تھا کہ یہ منصب پہلے ہی سے مجھے حاصل ہے پھر جدید تقرر کی ضرورت نہیں۔

اس سفر کے متعلق دوسرا بیان جو ہم تک پہنچا ہے آقا سید حسن عدالت کا ہے ؎۱۱۹

"در ۱۳۰۴ھ قمری سید جمال الدین وارد پیٹرو گراد شد۔ نظر بر ایں کہ شخصے مشہور بود اغلب ایرانی ہا بہ ملاقات او رفتند۔ بندہ ہم در ضمنِ ملاقات با ایشاں آشنائی پیدا کردم و بہ روزی اشنائی ما مبدل بہ صمیمیت شد............ تمام اوقات بیکاری خود را در حضور صرف می کردم بالاخر محرمیت تا حدے رسید کہ تمام افکار و عقاید خود

؎۵ جریدہ مصورہ استانبول

؎۱۱۹ ایران کے مشہور قوم پرستوں میں سے ہیں اور آذربائیجان میں بہت اہم قومی خدمات انجام دے چکے ہیں ۱۹۳۶ء تک طہران میں موجود تھے۔

را مفصلاً به بنده شرح می دادند و هرچه ذیلاً عرض می کنم عیناً روایت خود مرحوم است ......مخارج اقامت پٹیرزگراد را ظل السلطان تکفل کردند.........از زمان اقامت در پاریس روابط سید جمال الدین با کات کوف که از جریده نگاران مشهور روسیه بود دوستی کامل با امپراطور داشت شروع شده بود و یکے از اسباب سفر سید به روسیه دعوت کات کوف می باشد...... اصل نقشۂ او تہیہ اتحاد اسلام و استخلاص دول اسلامی از چنگ انگلیس بود و بہ ہمیں لحاظ و ایما گرفتار ضدیت انگلیسہا گردید حتیٰ در پیٹرزگراد ہم دقیقه از اعمال او غافل نبودند۔

در ایں ایام سید در نظر داشته که وسائل جنگ روس و انگلس را فراہم سازند تا ہمہ موقعہ قیام بدست اورد ولے روسیہا که جدیداً از محاربہ عثمان مستخلص شدہ گرفتار اختلال مالیہ بودند بہ ہیچ جنگ جدیدے حاضر نبودند۔ سید جمال الدین از بازتولیف (مدبر وزارت خارجہ روسیہ) ملاقات کردند ولے مدبر مربور ابر از مساعدت با نقشہ ایشاں نمودند.......... اوضاع ظل السلطان ہم مختل شده و از رسانیدن وجہ بہ سید عاجز ماند.......... تا ناصرالدین شاہ سفر روسیہ نمود کہ از آنجا برائے حضور وجشن جمہوریت وارد پاریس شود۔ اوقات ورود ناصرالدین شاہ بہ پیٹرزگراد وسفارت ایران باعلاالملک تبریزی بود ارفع الدولہ مستشار سفارت بود مفتخم الدولہ نائب سفارت و ہیچ کدام ازیں آقایان باسید مرحوم روابطے نداشتند کہ مایل بہ ملاقات او بہ شاہ باشند.......... سہ نفر از رجال محترم بتوسط بندہ با

سید مرحوم ملاقات نمودند کہ در ملاقات وصحبت ایشان حضور داشتم۔ مرحوم اعتمادالسلطنتہ بہ ہدایت من در کالسکہ تشریف آورد دست سید مرحوم را بوسید و از مقالہ کہ بر ضد سید مرحوم بعد از عزیمت ایشاں از طہران در روزنامچہ "اطلاع" نوشتہ بود عذر خواہی کرد........"

اسی مقالہ میں آقا سید حسن عدالت ایران کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے دریائے کاروں کے ٹھیکہ کے متعلق جو انگریزوں نے حاصل کرلیا تھا اور جس کے خلاف روسی حکومت بہت سخت احتجاج کر رہی تھی شیخ کے خیالات اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:۔

"بہ یکے ازجریدہ نگاران المان مقالہ مبسوطے در مضرت ایں راہ نوشت معلوم نمود کہ فایدہ ازادی ایں رود خانہ بہ انگلس عاید می شود وضرر آن بہ روس۔ایں مقالہ از روز نامہ المان بہ تمام روز ناہا ترجمہ شدہ یک ولولہ وقیل و قالے در ردسیہ بر علیہ ناصرالدین شاہ تولید گردید لبطوریکہ ماندن سید مرحوم را در روسیہ مضر دانستہ مشارٌالیہ را بہ امید ہائے بہ ایران دعوت نمودند............"

جرمنی فرانس اور پھر روس

۱۸۸۹ء میں شیخ روس سے جرمنی آئے اور چند روز میونخ میں مقیم رہے اور پھر پیرس چلے گئے۔ اس سفر میں پھر ایک موقعہ پر شیخ کی ملاقات شاہ ایران سے ہوگئی اور شاہ نے پھر ان کو ایران آنے کی دعوت دی۔

"بعد ہا در سال ۱۸۸۶ء برائے زیارت شہرگاہِ

عمومی کہ در پاریس افتتاح یافت از روسیہ بطرف فرانسہ حرکت کردہ و چندے در شہر میونخ اقامت کرد۔ بارِ دگر بہ پادشاہِ ایران ملاقات کردہ۔ ناصر الدین شاہ مشارٌ الیہ را بہ آمدن ایران دعوت نمودہ او ہم شاہ را رفتنِ خود وعدہ داد...... ۵

روایات متضاد ہیں اس لیے صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ شاہ اور شیخ کی ملاقات کس مقام پر ہوئی۔ مرزا لطف اللہ بھی اس باب میں خاموش ہیں مگر یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:۔

پس از مذاکرات بسیار و اصرار ناصر الدین شاہ قرار بدست دادن و بستن عہد و حلف نمودن شاہ بہ یکے از ہمراہاں خود می گوید کہ از جانب من دستِ معاہدہ بہ جانب آقائے سید جمال الدین بسپار اگر او دستِ او را باز پس زدہ می گوید دست تو با دست من لایق عہد نیست و نہ شاید دریں مجاہدات بجز دست سلطان دستِ دیگرے را سزا و مناسبتے نیست کہ با دست من عہد بندد۔ خود ناصر الدین شاہ دست پیش او آوردہ عہد موافقت را برائے آمدن سید بہ ایران از ہر جہت موکد و محکم می نماید.........."

آیندہ صفحات میں شیخ کا وہ خط درج کیا جائے گا جو اُنھوں نے دوسری دفعہ ایران سے روانہ ہوتے وقت شاہ کو لکھا تھا۔ اگر لطف اللہ کا یہ بیان صحیح ہوتا تو شیخ ایسے شخص نہ تھے کہ شاہ کے نام اپنے خط میں اس عہد و پیماں کا ذکر نہ کرتے مگر اس خاص واقعہ کا ان کے خط میں کوئی

۵۔ جریدہ مصورہ اسلامبول

ذکر نہیں ہی البتہ یہ امر یقینی ہی کہ اس دفعہ شاہ نے اُن سے وعدے وعید بہت سے کئے اور یہ اصرار ان کو ایران آنے پر آمادہ کیا تھا۔ اسی لئے غالباً امین السلطنت شاہ سے شیخ کے قرب کو اپنے لیے خطرناک سمجھتا تھا اور اس کو شیخ کا اس طرح پر ایران آنا کسی طرح گوارا نہ تھا۔ روسی حکومت اس زمانہ میں امین السلطنت سے بہت ناخوش تھی اس لیے کہ وہ انگریزوں کا ہوا خواہ سمجھا جاتا تھا اور روسی مدبرین کو یہ شکایت تھی کہ وہ خاص طور پر انگریزوں کے ساتھ مراعات کرتا ہی۔ چنانچہ شاہی بنک قایم کرنے اور دریائے کارُون پر کشتیاں چلانے کی اجازت اور معادن کا ٹھیکہ انگریزوں کو دلوانا روسی حکومت کے خیال میں امین السلطنۃ ہی کا کام تھا اور بدیں وجہ امین السلطنت اس فکر میں تھا کہ کسی طرح روسی حکومت کے خیالات کو اپنی طرف سے صاف کرے۔ وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ اس وقت شاہ روسیوں کی طرف مایل ہوتے جاتے تھے پس یہ دیکھ کر کہ شیخ پھر ایران آتے ہیں اور روسی حکومت ایران میں ان کی موجودگی کو پسند کرے گی امین السلطنت کو یہ فکر ہوئی کہ کسی طرح شیخ کو راستہ ہی سے ٹال دیا جائے۔

ے دریائے کارون محمرہ کے پاس خلیج فارس میں گرتا ہی ۱۸۸۸ء میں برطانوی سفیر متعینہ ایران نے شاہ کو آمادہ کر کے اس دریا میں اسٹیمر چلانے کی اجازت انگریزوں کے لیے حاصل کی روس کو یہ امر بہت ناگوار ہوا اور اس نے اپنے سفیر کے ذریعہ سے شاہ پر دباؤ ڈال کر ۱۸۸۹ء میں ایرانی حکومت سے یہ عہد کرلیا کہ وہ دس برس تک ملک میں نہ کوئی ریلوے جاری کرے گی نہ کسی دوسری سلطنت کو ایسا کرنے کی اجازت دے گی چنانچہ ۱۹۰۵ء تک یہ عہد نامہ قایم رہا جس کی وجہ سے ایران میں کوئی ریلوے نہ بنائی جاسکی۔

چنانچہ اُس نے یہ تدبیر نکالی کہ اُن سے درخواست کی کہ وہ پہلے روس جاکر روسی وزرا سے اس کے معاملات کا فیصلہ کرالیں۔ شیخ نے اُس کی خواہش کے مطابق آمادگی ظاہر کی چنانچہ میونخ ہی سے شیخ پھر روس کی طرف روانہ ہوگئے۔ یہ تمام داستان خود شیخ نے اپنے ایک خط میں بیان کی ہے جس کا ذکر آیندہ آئے گا۔

روس کا تیسرا سفر

یہ واقعہ غالباً ۱۸۸۹ء کا ہے۔ چند روز شیخ پھر روسیہ میں مقیم رہے اور اس زمانہ میں اُن کی ملاقاتیں دوگیرس وزیر خارجہ کے مشیر زنیو ولف اغناتیف نوویکوف اور جنرل ایرحیف وغیرہ سے ہوتی رہیں۔ اور سلطنت کے وزیر اعظم سے بھی وہ کئی دفعہ ملے۔ اِن ملاقاتوں کی تفصیل اور ان کے نتائج معلوم نہیں۔ تاہم کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوکر دو ماہ بعد طہران واپس آئے اور حسبِ معمول حاجی محمد حسن امین الضرب کے مکان پر مقیم ہوئے۔

ایران کا دوسرا سفر

اس زمانہ کے مشرقی درباروں کا یہ معمولی واقعہ تھا کہ از دیدہ دور از دل دور۔ دو مہینہ کے لیے شیخ جدا ہوئے اور اس عرصہ میں امین السلطنتہ نے شاہ کو ان کی طرف سے بے پروا کر دیا۔ غالباً اسی لیے اس نے شیخ کو روس کی طرف بھیجا تھا۔ اب جو شیخ طہران آئے تو وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ تو کجا رنگ ہی بدلا ہوا پایا۔ طہران آتے ہی ان کو معلوم ہوگیا کہ شاہ اور امین السلطنتہ اب وہ نہیں ہیں جو دو ماہ پہلے جرمنی میں تھے۔ شاہی نوازشوں کے بادل برس کر گزر چکے تھے! شاید اُس وقت شیخ نے صحیح اندازہ نہ کیا ہو لیکن کچھ روز بعد

ان کو معلوم ہوگیا کہ ایران کا یہ دوسرا اور آخری سفر ان کی زندگی کا سب سے زیادہ طوفانی زمانہ تھا۔ یہ دیکھ کر کہ چند ہی ماہ کے اندر ان کی وہ تمام مجوزہ اصلاحات منسوخ اور مسترد کر دی گئیں جو بڑے ذوق و شوق سے مرتب کرائی گئی تھیں شیخ نے ہوا کے رُخ کو پہچان لیا ہوگا۔

ایران کی تاریخ کا یہ زمانہ نہایت تاریک زمانہ تھا ایرانی قوم بربادی و ذلت کی آخری منزل پر تھی۔ ناصرالدین شاہ کی حکومت اہل ایران پر ایک عذاب کی طرح مسلط تھی۔ اس کو یورپ کی ادنیٰ دلچسپیوں نے اپنا گرویدہ بنالیا تھا اور قوم کی ساری دولت یورپ کے قہوہ خانوں اور بازاروں میں لٹائی جارہی تھی۔ ۱۸۸۹ء میں ناصرالدین شاہ تیسری دفعہ یورپ گیا اس سے پہلے وہ ۱۸۷۳ء اور ۱۸۷۸ء میں یورپ کی سیاحی کر چکا تھا۔ ان مغربی سیاحتوں نے اس کے خزانہ کو خالی کر دیا اور خزانہ خالی ہونے کے بعد مصر کی طرح ایران میں بھی اجانب کی دوستانہ مداخلت کے بہت سے موقع پیدا ہوگئے۔ جس طرح خدیو اسمٰعیل کی فضول خرچیوں نے مصر کو یورپین ساہوکاروں کے ہاتھ فروخت کر ڈالا تھا اسی طرح اب ناصرالدین شاہ اپنے باپ دادا کی وراثت کو سب سے بڑی بولی بولنے والے کے ہاتھ بیع کرنے پر تیار تھا۔ مغربی ساہوکار ہمیشہ ایسے بیوقوف اور عیش پرست مشرقی تاجداروں کو اپنا قرضدار بنانے کے لیے بخوشی تیار رہتے ہیں۔ انھوں نے ناصرالدین شاہ کی مالی دشواریوں سے پورا فائدہ اُٹھایا اور دوستوں کے بھیس میں آکر شاہ کو اپنے ملک کا خون چوسنے کے موثر ذرایع بتانے شروع کیے۔ اکتوبر ۱۸۸۹ء میں شاہ یورپ سے واپس آیا اور اس کے آنے کے بعد برطانیہ

اور روس کے لیے مراعات کے دروازے پہلے سے زیادہ کھول دیے گئے۔ شیخ نے بعد کو جو خطوط ایران کے حالات کے متعلق مجتہدین کو لکھے (جن کے ضروری اقتباسات آیندہ صفحات میں درج کئے جائیں گے) اُن میں اُس لُوٹ کی بہت سی تفصیل بیان کی گئی ہو جو اس زمانہ میں ایران میں مچی ہوئی تھی۔ اہواز سے طہران تک سڑک بنانے کا ٹھیکہ خاص حقوق کے ساتھ ایک برطانوی کمپنی کو دیا گیا ملک کی معدنیات یوروپین ٹھیکہ داروں کے سپرد کی گئیں۔ ایک شاہی بنک قایم کرنے کی اجازت انگریزوں کو دی گئی۔ روسی پرنس ڈولگروکی کو ریلوں کا اجارہ دیا گیا۔ ایک یوروپین کمپنی کو لاٹری قایم کرنے کی اجازت دی گئی جس میں ملک کی ایک کثیر رقم ضایع ہوئی۔ مراعات کے اسی سلسلہ میں تمام ملک کے تمباکو کی پیداوار کا ٹھیکہ دیدیا گیا اور اسی مشہور ٹھیکہ سے ایرانی انقلاب کا آغاز ہوتا ہی۔

شیخ جب طہران پہنچے تو اُنھوں نے دیکھا کہ فضا بالکل بدل گئی ہی چند روز تو وہ خاموش اور منتظر رہے کہ شاید شاہ ان کو پھر یاد کرے۔ آخر تنگ آکر انھوں نے شاہ کو ایک خط لکھا جو معہ جواب کے مرزا لطف اللہ نے نقل کیا ہی۔

"ما بعہد خود وفا نمودہ مطالب مرجوعہ انجام یافتہ واکنوں بضراب خانہ وارد شدہ ام قبل ازیں کہ تصرف جویم و وارد شہر شوم اظہار میدارم۔ می دانم کہ مفت خوراں دست از اغراض خود برنمی دارند وہمہ روز سعایات خواہند نمود و شہریار ہم در دفع شبہات وسعایت اقدام نخواہید فرمود ومعتذر بہ عذر و در عہد خود استوار نخواہند ماند۔ چنانچہ اگر در عہد خود از روئے

حقیقت باقی و استوار ید اجازه فرمائید که وارد شده تشرف حاصل نمایم۔ و ہرگاہ که این عہد و دعوت ہم مثل دعوتِ سابق است از ہمیں جا اذن دہید که نہ معترضین اعادہ سعایت نمایند و نہ اعلیٰ حضرت بخلاف عہد و میثاق در عالم مشہور شوند۔ والسلام۔ جمال الدین۔

جواب ناصر الدین شاہ۔

"از آمدن شما مسرور و زحمت شما منظور و نہایت اعتماد و اعتقاد بعہد و وطن خواہی شما دارم۔ ما نیز در عہدِ خود برقرار و باقی می باشیم۔ از ہر جہت آسودہ خاطر شوید منزل در خانہ جناب صدرِ اعظم کردہ ہمہ روز بہ ایشان بحضور مایل گردید۔"

جواب شیخ:۔

"از باقی بودن در عہد و مراحم ملوکانہ نہایت متشکرم۔ نزد صدر اعظم منزل نخواہم کرد۔ منزل متعدد دارم۔ چوں حاجی محمد حسن از دوستانِ من است و سابق ہم آنجا منزل داشتہ ام میل دارم بازہمان جا باشم۔"

جواب شاہ۔

"حال کہ میل دارید خانہ حاجی محمد حسن منزل کنید۔ بسیار خوب"

اس خط و کتابت کے بعد بھی شیخ نے دیکھا کہ وزیر اعظم اور شاہ دونوں ان سے ملاقات کرنے پر مائل نہیں ہیں۔ وہ چند ماہ تک انتظار ملاقات میں حاجی محمد حسن کے مکان پر ٹھہرے رہے۔ مگر سلطنت کے سیاسی اور اندرونی حالات کو دیکھ کر ان کی طبیعت بےچین تھی اور قیاس یہ ہے کہ وہ حسب عادت ایک دن بھی خاموش نہ بیٹھے ہوں گے۔ اور قراین یہ ہیں کہ انھوں نے ان حالات سے کبیدہ خاطر ہوکر امین السلطنة کے خلاف عوام کے جذبات کو برافروختہ کرنا شروع کر دیا ہوگا۔ اُن کو

یہ معلوم ہو چکا تھا کہ امین السلطنتہ ایران میں ان کے قیام کو کسی طرح گوارا نہیں کرتا اور وہ بھی اب بضد تھے کہ جانے سے پہلے امین السلطنتہ کی قومی غداری کا پردہ فاش کرتے جائیں۔ چنانچہ وہ اپنے میزبان سے رخصت ہو کر طہران سے چند میل کے فاصلہ پر درگاہ شاہ عبدالعظیم میں جا بیٹھے۔ ؎

درگاہ شاہ عبدالعظیم وہ مقام تھا جہاں چند سال بعد ناصرالدین شاہ رضا خاں کرمانی کے ہاتھ سے مارے گئے۔ شیخ نے درگاہ میں بیٹھ کر اپنی تعلیمات اور مواعظ کا سلسلہ جاری کر دیا اُن کے درس میں طلبا کی تعداد بڑھنے لگی اور اہلِ طہران ہزاروں کی تعداد میں درگاہ میں آنے لگے۔

ملک میں ہر طرف خفیہ انجمنیں اور قومی ادارے قایم ہوگئے اور امین السلطنتہ کے خلاف عام جذبات بھڑکنے لگے۔ اس وقت تک شیخ صرف امین السلطنتہ کی بیخ کنی پر آمادہ تھے شاہ کے خلاف وہ ایک حرف نہیں کہتے تھے۔ اس لیے کہ وہ سمجھتے تھے کہ تمام مفاسد کی بنیاد امین السلطنتہ ہی ہی اور اگر اس کی بیخ کنی ہو جائے تو شاہ کا راہ راست پر لانا دشوار نہ ہوگا۔ درگاہ میں بیٹھ کر چند روز بعد شیخ نے شاہ کے نام ایک خط لکھا جس سے اس زمانہ کے بعض اہم واقعات اور خصوصاً دوسری دفعہ شیخ کے روس جانے کے اسباب کی حقیقت واضح ہوتی تھی۔ صاحب بیداریٔ ایران نے اس خط کو بجنسہٖ نقل کیا ہی۔ ہم اس کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

؎ دیکھو ضمیمہ

"عرضداشت لبندہ عالیہ عتبہ رفیعہ سامیہ اعلیٰ حضرت شہنشاہِ اسلام پناہ"

میونک میں جب مجھے شرفِ نیاز حاصل ہوا اور میں مرکبِ ہمایونی کے ہمرکاب ہوا تو اس دوران میں جناب امین السلطنۃ وزیر اعظم نے یہ مناسب سمجھا کہ اس عاجز کو بعض امورِ ضروریہ کے لیے پطرس بورغ (پیٹرس برگ) بھیجا جائے اور پھر اس کام کو انجام دے کر میں ایران آؤں۔ اعلیٰ حضرت نے بھی اس تجویز کو پسند فرمایا اُسی شب کو وزیر اعظم نے مجھ سے پانچ گھنٹے گفتگو کی اُس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اول تو دولتِ روسیہ اور وہاں کے اخبار نویسوں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وزیر اعظم کو نشانۂ اعتراضات بنائیں اور اُن کی مخالفت کریں اس لیے کہ وہ یعنی وزیر اعظم مالک و صاحب ملک نہیں ہیں اور معاملات کی بست و کشاد اُن کے اختیار میں نہیں ہے۔ دوئم یہ کہ مسلہ کارون موجودہ وزیر اعظم کے اس عہدہ پر تقرر سے پہلے طے ہو چکا تھا حتیٰ کہ اس مسئلہ کے صرف بعض اجزا بدقسمتی سے اُن کی وزارت کے زمانہ میں انجام پائے ہیں پس پیٹرس برگ پہنچکر وزارتِ روسیہ کو سمجھانا چاہیے اور بتانا چاہیے کہ وزیر اعظم کے متعلق وزارتِ روسیہ کے افکار فاسد ہیں۔ ان کو رفع کرنا اور نیک خیالات پیدا کرنے چاہئیں۔ نیز وزیر اعظم نے اس عاجز سے یہ بھی خواہش کی کہ رئیس الوزرا موسیو گیرس اور وزیر خارجہ ویلنکالے اور زینوف وغیرہ کو سمجھاؤں کہ وزیر اعظم اُن کے مقاصد کے پورا کرنے کے لیے بہر حال حاضر ہیں۔ اور اگر روس کی طرف سے

خواہش ہو تو جلد اِن مسائل کو حل کر دیں اور حالاتِ سابقہ پہ اعادہ ہو جائے۔ چونکہ یہ عاجز وزیرِ اعظم کے مقاصد کو عین رضائے بادشاہ اور خیرِ ملّتِ اسلام سمجھتا تھا اس لیے سینٹ پیٹرزبرگ گیا اور چند اشخاص سے گفتگو کی جن کو سیاساتِ مشرق میں اپنا ہم مشرب سمجھتا تھا۔ مثلاً حربیہ کے جنرل ایروجیف۔ جنرل دنجتر وزیر دربار۔ جنرل رغتانیف سفیر سابق روس در اسلامبول و مادام نودیکف جو با اثر خاتون ہیں۔ ان سب کو میں نے اپنی رائے سے متفق کر لیا دو ہفتہ میں بیس دفعہ موسیو کرلس اور ان دوسرے اشخاص سے ملا اور پہلے اس سے کہ وزیر اعظم کے مقاصد میں سعی کروں یہ کوشش کی کہ سیاسی دلایل اور اپنے ہم خیال اصحاب کی امداد سے یہ ثابت کروں کہ دولتِ روس کے لیے مشرق میں بہترین اصولِ کار یہی ہے کہ ہمیشہ دولتِ ایران سے صلح اور اتحاد رکھے اور مخاصمت نہ کرے اور اس سلسلہ میں ہمہ وقت ترکوں اور اراضیٔ ترکمانیہ میں اعلیٰحضرت کے اثرات کو ان لوگوں کے ذہن نشین کرتا رہے۔ جب میں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ مطلب حاصل ہو گیا اور ان لوگوں کا غصہ بھی فرد ہو گیا تب جناب وزیر اعظم کے مقاصد کو پیش کر کے میں نے اُن صاحبوں سے کہا کہ وزیر اعظم نے خود مجھ سے میونخ میں کہا ہے کہ اگر آپ کوئی طریقہ ایسا بتائیں کہ بغیر لڑائی جھگڑے کے تمام مسائل طے ہو جائیں اور روس و انگلستان و ایران کے سابق تعلقات برقرار رہیں تو وہ اس کام کے لیے حاضر ہیں۔ جہاں تک ہو سکا میں نے وزیر اعظم کے مقاصد میں پوری کوشش کی۔ چنانچہ ایک دفعہ پھر اِن مطالب کو ان لوگوں کو لکھا۔ موسیو کرلس اور دیگر اصحاب سے جب دوبارہ دریافت

کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ اس مسئلہ میں پہلے وزیر جنگ اور وزیر مالیہ اور شاہِ روس سے مشورہ کرلیا جائے پھر اگر کوئی سیاسی راستہ معلوم ہوگا کہ اس سے مسایل حل ہو جائیں تو ہم تم کو بتا دیں گے تاکہ تم وہی جواب وزیر اعظم کو پہنچا دو۔ البتہ اگر یہ مسایل ایسی صورت سے طے ہو جائیں کہ روس اور دولتِ ایران کے درمیان مخاصمہ پیدا نہ ہو تو بہتر ہی۔ پس آپس میں مشورہ کرنے کے بعد انھوں نے اپنے اور جناب وزیر اعظم کے لیے دو سیاسی مسلک قرار دیئے اور مجھ سے کہا کہ اگر جناب وزیر اعظم چاہتے ہیں کہ آیندہ خطرات کا دروازہ بند کر دیں تو اُن کے پیام کے جواب میں یہ دونوں مسلک اُن کو سمجھا دو تاکہ تمام معاملات بغیر کسی جھگڑے کے ہم سب کی رضامندی کا باعث ہوں۔ یہ عاجز نہایت خوش ہوا کہ خدا کی مدد سے معاملات کو طے کرسکا اور یہ خیال کیا کہ اب میں روس کے مسلک سیاستِ خفیہ کو ظاہر کرکے ایک حد تک اسلامی سلطنت کی ایک خدمت انجام دے سکوں گا۔ جب طہران پہنچا تو شہر کے باہر ٹھہر کر میں نے اپنے آنے کی اطلاع جناب وزیر اعظم کو دی۔ انھوں نے میرے قیام کے لیے حاجی محمد حسن امین الضرب کا مکان پسند کیا اور میں نے تین ماہ تک اپنی قیام گاہ سے حرکت نہیں کی سوائے ایک دفعہ کے کہ وہ بھی ایک ماہ بعد جب اعلیٰ حضرت سے ملاقات کی عزت حاصل ہوئی تھی۔ اس تمام مدت میں جناب وزیر اعظم نے اس عاجز سے کوئی بات دریافت نہیں کی کہ پطرسوارغ میں کیا ہوا اور اس معاملہ کا کیا جواب ہی جس کے لیے میں بھیجا گیا تھا۔ اس مدت میں میں نے کئی دفعہ اپنے آدمی جناب وزیر اعظم کے پاس بھیجے۔ انھوں نے وعدہ بھی کیا کہ مفصل ملاقات

کریں گے جب زیادہ زمانہ گزر چکا تو روس سے دریافت کیا گیا کہ اُن معاملات کا کیا فیصلہ ہوا میں نے اُس کا یہ جواب دے دیا کہ ابھی تک وزیر اعظم سے گفتگو نہیں ہوئی ہے اور گفتگو نہ ہونے کا سبب بھی مجھے معلوم نہیں۔ جب وزارتِ روس کو یہ معلوم ہوا تو انھوں نے یہ سمجھا کہ یہ سب حیلہ سیاسی تھا اور مقصود صرف مقابل کے تخیلات اور ارادوں کا معلوم کرنا تھا۔ پس یہ سمجھ کر انھوں نے اپنے سفیر متعینہ طہران کو تار دیا کہ سیّد جمال الدین نے وزیر اعظم کی طرف سے بعض امور میں گفتگو کی تھی اگر وزیر اعظم چاہتے ہیں کہ اِن امور کے متعلق گفتگو کریں تو سفیر روس متعینہ طہران یا سفیرِ ایران متعینہ روس کے ذریعہ سے مکالمہ کریں اور جمال الدین کی طرف سے جنھوں نے غیر رسمی طور پر گفتگو کی تھی اب مزید گفتگو فضول ہوگی (لاحول ولا قوۃ الا باللہ) اتنا سفر کیا تکلیف اُٹھائی اور پھر روزِ اول ہی رہا۔ جو گرہ کھل گئی تھی اُس کو پھر باندھ دینا اعلیٰ حضرت پاشاہ اسلام جو طریقہ ڈپلومیسی کو ہر شخص سے بہتر جانتے ہیں سمجھ سکتے ہیں کہ کس قدر غلط ہے۔ جناب وزیر اعظم کو جب وزارت روسیہ کے تار کی اطلاع ہوئی تو اُنھوں نے بخلاف عادت سیاسین بجائے اس کے کہ اس امر پر افسوس کرتے کہ ان مسائل کے متعلق وزرائے روس کے افکار کیوں اب تک معلوم نہیں کیے اور ان کے جواب کو کیوں اب تک نہ سنا۔ صاف کہہ دیا کہ میں نے وزارتِ روسیہ سے کہنے کے لیے جمال الدین سے کوئی بات نہیں کہی تھی اور نہ میں نے ان کو پطرسبورغ بھیجا تھا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ یہ کیا تماشہ ہے یہ کیا فکرِ عقیم ہے۔ یہ کیا نتیجۂ فاسدہ ہے۔ اگر یہی مسلک ہے

تو غلطیوں کا کیونکر انسداد ہو سکتا ہے اور کیونکر خطرات رفع کیے جا سکتے ہیں ۔ بے سبب دلوں میں شبہ ڈالنا اور قلوب کو متنفر کرنا ! خدائے توانا مجھے اپنی قدرتِ کاملہ سے اس قسم کی حرکات سے محفوظ رکھے ! اور یہ عجب واقعہ ہے کہ اعلیٰ حضرت کی زبان سے اپنی تعریف و توصیف سُننے کے بعد حاجی محمد حسن امین الضرب نے مجھے بتایا کہ اعلیٰ حضرت کی مرضی یہ ہے کہ یہ عاجز طہران کا قیام ترک کر کے مقابر شہر قم میں سکونت اختیار کرے ۔ میں نے بہت اپنے ذہن میں ڈھونڈا ۔ مجھے اس کا کوئی سبب معلوم نہ ہو سکا ۔ کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ میں نے دولت روس کو اپنے دلایل و براہین سے دولتِ ایران کے مسلک کو قبول کرنے پر آمادہ کر لیا تھا ؟ کیا اس کا سبب یہ ہے کہ وزیر اعظم کی خواہش کے مطابق میں پطرسبورغ گیا اور ان کے مقاصد کو دولتِ روسیہ سے حاصل کرنے کی سعی کی ؟ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ جو کچھ وزیر اعظم کی خواہش تھی اس کو جد و جہد کر کے پورا کیا ؟ مجھے تو ندامت ہونی چاہیے کہ جو کچھ نمونہ پہلی دفعہ کی مہمان داری میں میں نے دیکھ لیا تھا اُس کو کافی نہ سمجھا اور پھر ایران آنے کا خیال دل میں کیا ۔ مگر میں شہنشاہ کے الفاظ کو مقدس سمجھتا تھا اور چاہتا تھا کہ میرے خلاف جو کچھ کہا گیا ہے اس کو آپ کے علم میں لاؤں تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ میں خیر خواہ اور مطیع ہوں ۔ مگر اب یہ صورت ہے کہ میرے بدخواہ یہ صاحبانِ عقول صغیرہ اور نفوس حقیرہ یہ امید رکھتے ہیں کہ ذہنِ نقاد اعلیٰ حضرت کو اس عاجز کے بارہ میں پھر مشتبہ کر دیں ۔ لہٰذا میں حضرت عبد العظیم میں بیٹھا ہوا منتظر ہوں کہ کیا حکم صادر ہوتا ہے ؟"

امین السلطنۃ کی چال سے شیخ نے شکست فاش کھائی۔ اُس نے نہ صرف شیخ کو روس کی طرف بھیج کر اُن کی غیر حاضری سے کافی فایدہ اٹھایا بلکہ بعد کو روس میں بھی شیخ کے وقار کو کافی صدمہ پہنچا دیا۔ یعنی پہلے تو اُن کو اپنا قاصد اور نمایندہ بنا کر بھیجا اور بعد کو یہ ظاہر کیا کہ جمال الدین سے حکومتِ ایران کو کوئی واسطہ نہیں اور وہ خود ہی دخل در معقولات کر رہے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ شیخ امین السلطنت کی چالاکی کے حریف نہ ہو سکے اور اس طرح ایران میں اُن کی تمام توقعات کا خاتمہ ہو گیا۔ وہ اپنے کو خطرات میں گھرا ہوا پا کر شاہ عبدالعظیم کی درگاہ میں چلے گئے جہاں ایرانی رواج اور مذہبی روایات کی بنا پر حالت "بست" میں کوئی شخص گرفتار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اپنے خط کا کوئی جواب نہ پا کر شیخ نے سمجھ لیا ہوگا کہ اب اعلانِ جنگ ہے۔ تاہم وہ بدستور درگاہ میں بیٹھے ہوئے درس و تدریس میں مشغول رہے۔ سات ماہ تک وہاں وعظ و تلقین کا سلسلہ جاری رہا اس زمانہ میں اپنے ہزاروں معتقدین کو جو لیکچر وہ دیتے تھے اُن کا لہجہ سخت ہوتا تھا اور اپنی عادت کے مطابق وہ اپنے تلخ و تند احساسات کو بے تکان ظاہر کرتے تھے بقول صاحب بیداریٔ ایران ایک دفعہ تو انھوں نے ایک تقریر میں یہاں تک کہہ دیا کہ :-

"من با ظالم و مظلوم ہر دو عداوت دارم۔ ظالم را برائے ظلمش دشمن دارم و مظلوم را برائے این کہ ظلم قبول می کند و سبب جسارت ظلم ظالم می شود"

انقلاب" کا جو تخم وہ شاہ عبدالعظیم میں بیٹھے ہوئے بو رہے تھے

اُس کا ثمر انھوں نے اپنی زندگی میں دیکھ لیا جب ایران میں استبدادیت کا قصرِ کہن مسمار ہونا شروع ہوا اور اسی درگاہ شاہ عبد العظیم کے دروازہ پر ناصر الدین ایک انقلابی کی گولی کا نشانہ بنا۔

درگاہ میں رہتے ہوئے شیخ کو سات مہینہ گزر چکے تھے کہ ایک دن شیخ کو گرفتار کر لیا گیا۔ وہ اس وقت صاحب فراش تھے جس ترکیب سے شیخ کو باہر نکال کر مقید کیا گیا اس کی تصویر جریدہ مصورہ کا ایک وقائع نگار اس طرح پیش کرتا ہے۔

"علی اصغر خاں برائے خارج ساختن سید جمال الدین از آں تربہ کہ تعرض بہ آں ہیچ صورت ممکن نبود یک تدبیرِ اندیشیدہ بود کہ ایں چنیں روایت می کنند۔

علی اصغر خاں روزے بہ عبد العظیم نزدِ مجتہدیں بایک تہور در آمدہ بایک جذب می گوید کہ دیگر چہ طور می شود کہ دریں زیارت گاہ مقدس و علوی یک ارمنی را نگہ می دارید و علویت ایں جا را خمال می کنید۔ ایں شخصے کہ دریں جانگہ داشتہ و اسم خود را سید جمال الدین نہادہ است غیر از یکے ارمنی چیزے دیگر نیست۔ در اول مجتہدین باور نمی کنند۔ اما علی اصغر اصرار می کند کہ باید مشارٌ الیہ معاینہ می شود۔ بالطبع چوں ادائے معاینہ در داخل ایں تربہ مقدس ممکن نمی شود۔ بیرون از تربہ می آورند گر باز ہم ممکن نمی شود۔ کہ بار دگر بہ تربہ داخل شود۔

متعاقباً عساکرے کہ در اطراف مستور می باشند۔ رسیدہ او را محاصرہ می کنند........ سید جمال الدین افغان ہمراہ زنجیر و دولابہ تا بہ خانقین آوردہ می شود و از انجا بہ خاک ترکیہ گذاشتہ می شود و

از آں جا بہ بغداد می آید........"

کسی دوسرے بیان سے اس بیان کی تصدیق نہیں ہوئی۔ علاوہ بریں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ درگاہ کے مجتہدین شیخ سے اس قدر ناواقف ہوں گے کہ علی اصغر کے دعوے کو صحیح سمجھ لیں۔ اس زمانہ میں شیخ سے طہران کے ہزارہا اشخاص واقف تھے اور ان کے گرد وپیش سیکڑوں معتقدین کا مجمع رہا کرتا تھا۔ مجتہدین بھی ان کی عزت کرتے تھے ایسی حالت میں یہ بیان بہت بھونڈا اور بے تکا معلوم ہوتا ہے اور شیخ بھی اپنے اس مفصل خط میں جو مجتہدِ اعظم سامرہ کو انھوں نے لکھا اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں کرتے حالانکہ درگاہ میں اپنی گرفتاری کا سارا حال اُس میں لکھتے ہیں۔

البتہ یہ بیان بالکل مصدقہ ہے کہ حالتِ بیماری میں جب شیخ نشست وبرخاست کے قابل بھی نہ تھے اُن کو گرفتار کرکے ایک یابو کی کمر سے باندھ کر بٹھایا گیا اور اس طرح پچاس سواروں کی حفاظت میں وہ خانقین پہنچاتے گئے۔ محمد حسن امین الضرب کو جب شیخ کی گرفتاری کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے فوراً کچھ زادراہ اور لباس اُن کے لیے بھیجا اور سواروں کے افسر کے لیے بھی کچھ روپیہ بھیجا تاکہ وہ راستہ میں شیخ کو کچھ تکلیف نہ پہنچائیں۔ علاوہ بریں امین الضرب نے حسام الملک حاکم کرمان اور وفاحسین وکیل الدولہ کو خط بھی لکھے اور لکھا کہ شیخ کے آرام وراحت کا لحاظ رکھیں۔

اس طرح شیخ ایران سے آخری دفعہ رخصت ہوتے۔ وہ رخصت تو ہوگئے لیکن شاہ کی مطلقیت کو ایسا گُھن لگا کہ وہ چندروز بھی

چین سے حکومت نہ کر سکا۔ نہ صرف اس کی کج کلاہی ختم ہوگئی بلکہ جو قبر اس نے اپنے مخالفین کے لیے کھدوائی تھی اُس میں بقضائے الٰہی خود ہی دفن ہو گیا۔

گو کہ اس مقام پر داستان کا تسلسل منقطع ہوتا ہے لیکن اگر شیخ کی روانگی کے بعد ناصرالدین شاہ کے خاتمہ تک جو واقعات ایران میں پیش آئے ان کی مکمل داستان بھی اسی جگہ لکھدی جائے تو ایران کا ذکر ان صفحات میں آیندہ کرنے کی ضرورت نہ ہوگی اور ایران کے متعلق شیخ کے مساعی کی روداد بھی یک جا ہو جائے گی۔ نیز ایران کی انقلابی تحریک سے جس حد تک شیخ کا تعلق رہا وہ بھی بخوبی واضح ہو جائے گا۔

شیخ ایران میں پہلی دفعہ اور دوسری دفعہ بھی شاہ کے بلائے ہوئے گئے تھے مگر وہ ان لوگوں میں نہ تھے جو اپنی ذاتی اغراض کی وجہ سے اپنی زندگی کے اصولوں کو ترک کر دیتے۔ انھوں نے شاہ کی دعوت کو اس لیے قبول نہیں کیا تھا کہ وہ اپنی ذات کے لیے کوئی شاندار مستقبل پیشِ نظر رکھتے تھے بلکہ جیسا کہ ان کی زندگی کے ہر واقعہ سے مترشح ہوتا ہے وہ ایران کی اصلاح حال کا خیال دل میں لے کر گئے تھے۔ اور شاید یہ سمجھتے تھے کہ ناصرالدین شاہ کے التفات سے فائدہ اُٹھاکر اس کو نیک مشورہ دے سکیں گے۔ لیکن دربار کی سازشوں نے ان کو شکست دی اور امین السلطنت کی چالوں کا وہ مقابلہ نہ کر سکے۔ شیخ اس میدان کے مرد نہ تھے۔ وہ صرف ایک ہی جذبہ دل میں لیے پھرتے تھے اور اسی جذبۂ صادق سے ہر جگہ کام لیتے تھے۔ عوام اور خواص دونوں اُن

کے لیے یکساں تھے۔ دولت اور ثروت اور عوام کے اعتراضوں سے وہ کبھی موثر اور مرعوب نہ ہوتے تھے۔ وہ دنیا کے تغیرات اور انقلابات میں ایک مضبوط چٹان کی طرح قایم تھے ہزاروں طوفان آئے اور اس چٹان سے ٹکرا ٹکرا کر گزر گئے ایران میں وہ شاہی مہمان بن کر آئے مگر درحقیقت خدمت وہ رعایا کی کرنا چاہتے تھے۔ شیخ کی بڑی اور عجیب کامیابی اس ملک میں یہ تھی کہ انھوں نے اکثر قدامت پسند مجتہدین کا جو ناصرالدین شاہ کی پشت و پناہ تھے رفتہ رفتہ اس کی مطلقیت کا دشمن بنا دیا اور وہی مجتہدین جن کی قدامت پسندی نے قومی ترقی اور اصلاح کے تمام دروازوں میں تالے ڈال دیے تھے اور جو اصلاح ملت کی ہر تجویز پر بدعت ہونے کا فتوی جاری کرتے تھے ایک دن ایسا آیا کہ اپنے وطن کی آزادی و عزت کے داعی بن کر میدانِ عمل میں اُتر آئے آج شاید ایران میں آزاد اسلامی سلطنت کا نام و نشان بھی نہ ہوتا اگر شیخ وہاں نہ گئے ہوتے اور شیخ کے اثرات نے وہاں قوم پرست مجتہدین پیدا نہ کر دیے ہوتے۔ بلاشبہ ایرانی عہد جدید کے اِن معجزات میں بڑا حصہ جمال الدین افغانی کا تھا۔

شیخ کو ایران سے خارج کرنے کے چند ہی روز بعد شاہ نے اپنی شہنشاہیت پر ایک آخری اور کاری ضرب لگائی۔ ۷ مارچ ۱۸۹۰ء میں اس نے ایک یورپین کمپنی کو تمام ایران میں تمباکو کی کاشت کا اجازہ دے دیا اس کمپنی نے دس کروڑ رُپے کے سرمایہ سے اپنا کام شروع کیا لیکن ملک اور قوم کی آزادی جب اس طرح فروخت کی جا رہی تھی تو بہت سے سونے والے جاگ اٹھے تھے۔ سب سے پہلے شاہزادہ

ملکم خاں نے جو اس وقت لندن میں ایرانی سفیر تھے اس اجارہ کے خلاف سختی کے ساتھ احتجاج کیا چنانچہ اسی بنا پر وہ منصبِ سفارت سے معزول کر دیے گئے۔ لیکن انھوں نے اب سرکاری ملازمت سے آزاد ہوکر پوری قوت سے اخباروں میں آواز بلند کرنی شروع اور لندن سے اپنا ایک اخبار قانون کے نام سے جاری کر دیا جس میں اکثر شیخ کے مضامین بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ اس کا کوئی پرچہ ہم کو میسر نہ آسکا۔ قانون کی آواز انقلابِ ایران کے نقارہ کی پہلی آواز تھی۔ باوجودیکہ اس کا داخلہ ایران میں بند کر دیا گیا تھا لیکن اس کے پرچے ہر طرح ایران میں پہنچتے تھے اور شوق کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔

الغرض تمباکو کے اجارہ کا مسئلہ گویا ایک کنجی تھا جس نے شاہ کے خلاف رنج اور غصہ کے دروازے کھول دیئے۔ شیخ بھی غافل نہ تھے انھوں نے اس کنجی کو پوری قوت کے ساتھ استعمال کیا۔ وہ بصرہ میں حاجی علی اکبر شیرازی تاجر کے مہمان تھے حاجی علی اکبر خود ایران سے نکالے ہوئے اکابر میں سے ایک تھے۔ وہیں بیٹھ کر شیخ نے ایران کے حالات کے متعلق اپنا وہ مشہور مکتوب مجتہدِ اعظم حاجی مرزا حسن شیرازی کے نام (جو سامرہ میں مقیم تھے) لکھا اور حاجی علی اکبر کی وساطت سے روانہ کیا جو بعد کو لندن سے "ضیاء الخافقین" میں شائع کیا گیا اور تمام علما اور مجتہدین کی خدمت میں بھیجا گیا۔ یہ خط شعلہ بن کر بارود خانہ میں گرا اور ایران کے ہر گوشہ میں آگ لگ گئی۔

جب شیخ بصرہ میں بیٹھے ہوئے یہ خط لکھ رہے تھے تو ترکی سے سلطان عبدالحمید خاں کی دعوت والیٔ بصرہ عزت پاشا کے ذریعہ سے آئی لیکن اُس وقت شیخ ایران کے معاملات میں بہت زیادہ مشغول تھے اور لندن جانے کا ارادہ کر چکے تھے اس لیے ترکی نہ جا سکے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ایران میں انقلابی قوئے عمل کے لیے بالکل تیار ہیں اور آزادی ایران کے بہت سے ہواخواہ پرنس ملکم خاں کی وجہ سے لندن میں جمع ہیں اس لیے شیخ نے اپنا لندن جانا زیادہ ضروری سمجھا۔ لندن سے جب اُن کا وہ مشہور خط شایع ہوا تو ناصرالدین شاہ کی مطلقیت پر گویا ایک بجلی گری۔ واقعہ یہ ہے کہ شیخ نے بھی اس خط میں اپنے مزاج کی حدت اور قلم کی قوّت کو بے تکان صرف کیا تھا۔ اس کے چند اقتباسات کا درج کر دینا ضروری ہے۔

"میں حق کہتا ہوں یہ خط شریعتِ اسلامی کی خاطر لکھتا ہوں جہاں کہیں وہ شریعت جاری اور قایم ہو۔ یہ ایک اپیل ہے جو میں تمام اُن حق پسندوں کی روحوں سے کرتا ہوں جو شریعت پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے نافذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں یعنی میں اپیل کرتا ہوں علمائے اسلام سے اور یہ اپیل میں تمام علمائے اسلام سے کرتا ہوں حالانکہ اس وقت میرے مخاطب ان میں سے ایک ہی ہیں . . . .

خدا نے آپ کو اس اعلیٰ نیابت پر فائز کیا ہے کہ آپ حقیقتِ عظمیٰ کے نمایندے ہوں اور خدا نے ملتِ بیضیٰ سے آپ کو منتخب کیا ہے آپ اِنسانوں کی باگ ہاتھ میں لے کر شریعت اسلامی کی

حفاظت و نگرانی کریں ....

اہل ایران اب ظلم وستم کے اندر اپنے ملک بیت الدین کی حالت کو دیکھ کر بیتاب ہو گئے ہیں جو اغیار اور کفار کے ہاتھ فروخت کردیا گیا ہی اور جس پر اُن اغیار کا قبضہ قایم ہوگیا ہی۔ مگر کسی رہنما کے نہ ہونے کی وجہ سے اہلِ ایران پریشان ہیں، منقسم ہیں، اور معطل ہیں، وہ حیران ہوتے ہیں، اُن کا ایمان متزلزل ہوتا ہی جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان مجتہدوں کی طرف سے کوئی آواز بلند نہیں ہوتی جن کو وہ اپنا رہنما اور اسلامی مفاد کے معاملات میں اپنا رہبر سمجھتے ہیں اور سمجھنے کا حق رکھتے ہیں۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں اور یہ سچ بھی ہی کہ تیرا ایک لفظ ان کو متحد کردے گا اور تیرا ہی حکم فیصلہ کن ہوگا۔ تیرا ہی ایک حرف با اثر ہوگا اور کسی کی مجال نہ ہوگی کہ تیرے حکم پر حرف زنی کرسکے اور اگر تو چاہے گا تو متفرق عناصر کو اپنے ایک لفظ سے متحد کردے گا اور اس طرح خدا کے دشمنوں کے دل میں خوف پیدا کردے گا اور کفار کے ظلم سے اہلِ ایران کو بچائے گا۔ تیرا ہی ایک لفظ اس مصیبت اور ابتلا کا خاتمہ کردے گا جس میں اہلِ ایران گھرے ہوئے ہیں۔ اور ان کو زندگیوں کی سختی سے نجات دے کر راحت و آرام عطا کرے گا۔ پس دین کی حفاظت ہو جائے گی اور اس دین کے حلقہ بگوش اس کو سنبھال لیں گے اور اسلام کا مرتبہ بلند ہو جائے گا .... اے امامِ اعظم! بے شبہ بادشاہ کی قوتِ ارادی کمزور ہی اس کی سیرت خراب ہی اس کا دل گندہ ہی۔ وہ ملک پر حکومت کرنے اور اہلِ ملک کے معاملات کو سدھارنے

کے قابل نہیں اور اس نے حکومت کی باگیں ایک بے دین ظالم اور غاصب کے سپرد کر دی ہیں (امین السلطنت جو رسول پر علانیہ استہزا کرتا ہے اور شریعتِ حقہ کی پرواہ نہیں کرتا جو امرائے شریعت کو خیال میں نہیں لاتا اور علما پر لعنت بھیجتا ہے اہلِ زہد و تقویٰ کو ذلیل کرتا ہے اور سادات کی تحقیر کرتا ہے علاوہ بریں کفار کے ملک سے واپس آنے کے بعد وہ بالکل قابو سے باہر ہوگیا ہے علانیہ شراب پیتا ہے اور کفار کی صحبتوں میں وقت گزارتا ہے یہ ہے اس کا چلن مگر اس کے علاوہ اس نے ایرانی زمین کا بڑا حصہ معہ اس کے منافع کے کفار کے ہاتھ فروخت کر ڈالا ہے۔ (اشارہ ہے معدنیات کے ٹھیکوں کی طرف) یہی نہیں بلکہ سڑکیں۔ کاروان سرائیں۔ باغات۔ کھیت سب ہی کچھ اُس نے فروخت کر ڈالے ہیں۔ نیز دریائے کارون مہمان خانے۔ عمارتیں۔ سرائیں۔ میدان یہ بھی سب کفار کو دے ڈالے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ تمام ایران میں تمباکو کی کاشت معہ زمین و عمارت کے، انگور جن سے شراب بنائی جاتی ہے معہ کارخانوں اور سامانِ تجارت کے، صابن۔ موم۔ شکر کے تمام کارخانے، غرضکہ سب کچھ معہ متعلقات اس نے کفار کی نذر کر دیا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ بنک۔ آپ کیونکر سمجھیں گے کہ بنک کیا چیز ہے اُس کے معنی صرف یہ ہیں کہ دشمنان اسلام کو گویا ساری سلطنت دے ڈالی .... اب دغاباز لوگوں کو تسکین دینے کے لیے کہتا ہے کہ یہ انتظامات محض عارضی ہیں۔ یعنی ایک مقررہ زمانے کے لیے جن کی میعاد سو برس سے

زیادہ نہیں !! یا اللہ یہ کیا دلیل ہے جس کی کمزوری خود اس دغاباز پر عیاں ہوگی۔

اب جو کچھ رہ گیا تھا اُس نے روس کے سامنے پیش کر دیا تاکہ روس خاموش رہے۔ مندب۔ رشت دریائے طبرستان سڑک انزلی و خراسان معہ تمام مکانات سراؤں اور متعلقہ کھیتوں کے۔ مگر روس نے ناک بھوں چڑھائی اس لیے کہ وہ تو کل خراسان آذربائجان اور مازندران کی فکر میں ہے۔..........

یہ ہے نتیجہ اُس پاگل کے طرزِ عمل کا.......... اور تُو اے محب اسلام! کیا تو اس قوم کی مدد کے لیے نہ اُٹھے گا اور اُن کو متحد نہ کر دے گا اور شریعتِ مطہرہ کے زور سے اس گنہگار کے ہاتھوں سے اس کو نجات نہ دلوائے گا؟ بلاشبہ بہت جلد یہ اسلامی مملکت اغیار کے زیر اقتدار ہوگی جو وہاں جس طرح چاہیں گے حکومت کریں گے اگر تونے یہ موقعہ جانے دیا۔ اے امام! یہ واقعہ تیری زندگی میں پیش آگیا تو لاریب تو اپنا نام تاریخ کے صفحات پر روشن نہ چھوڑے گا!.......... بلاشبہ امام وقت نے سنا ہوگا ان کفر کے سرغنوں نے اس عالم و فاضل اور زاہد و عابد حاجی ملا فیض اللہ دربندی کے ساتھ کیا کیا اور آپ عن قریب سنیں گے کہ ان بے رحم بد معاشوں نے نیک اور سچے مجتہد حاجی سید علی اکبر شیرازی کے ساتھ کیا کیا۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اِن لوگوں نے اپنے ملک اور مذہب کے محافظوں کو کس طرح قتل کیا ہے۔ مارا ہے پیٹا ہے لوہے سے داغا ہے، اُن ہی مظلوموں میں ایک صالح نوجوان

مرزا احمد رضا کرمانی ہے جس کو اس کافر امین السلطنت نے زدو کوب کیا اور اسی طرح حاجی سید محلاتی عالم و فاضل مرزا فراغی۔ مرزا محمد علی خاں اور اعتماد السلطنت کو بھی ایذا پہنچائی گئی ...."

اس کے بعد شیخ نے ان مظالم کا ذکر کیا ہے جو ان پر کیے گئے۔ ان کے ایران سے نکالے جانے کا واقعہ خود ان کے قلم سے یوں ہے کہ۔

"اب میری داستان جو کچھ اس ناشکر گزار نے میرے ساتھ کیا وہ بھی سن لیجئے۔ اس مردود نے طہران کی برف سے ڈھکی ہوئی سڑکوں پر ذلت کے ساتھ میرے زمین پر گھسیٹے جانے کا حکم دیا جب کہ میں خانقاہ عبدالعظیم میں پناہ گزیں تھا اور بہت بیمار تھا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُون! اس کے بعد اُس کے ذلیل خادموں نے مجھے باوجود میری علالت کے باربردار ٹٹو پر سوار کر کے زنجیروں سے باندھ دیا اور یہ سب اس وقت کیا گیا جب کہ سردی کا موسم تھا برف کے طوفان آرہے تھے اور نہایت سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ اس طرح مجھے سواروں کی نگرانی میں خانقین بھیج دیا گیا۔ جہاں پہلے ہی ترکی کے والی سے طے کر لیا گیا تھا کہ مجھے بصرہ پہنچا دیا جائے۔ یہ اس لیے کیا گیا کہ وہ خوب جانتے تھے کہ اگر میں آزاد چھوڑ دیا گیا تو سیدھا تیرے پاس آؤں گا۔ اے امام وقت! اور تجھکو اس کے مظالم سناؤں گا اور مملکتِ ایران کے حالات بتاؤں گا اور تجھ سے اے حجۃ الاسلام! مدد چاہوں گا........"

یہی خط بعد کو "ضیاالخافقین" (لندن) میں شایع ہوا اور اسی

ے۔ دیکھو ضمیمہ نمبر ۴۳ ے دیکھو ضمیمہ نمبر ۴۳

کی نقول بہت سے علما اور مجتہدین کو بھیجی گئیں۔ شیخ کی یہ تحریر ایک تاریخی دستاویز ہے اس لیے کہ اسی تحریر کی بنا پر مجتہدین نے تمباکو کے ٹھیکہ کے خلاف وہ فتویٰ شایع کیا جس نے سارے ایران میں آگ لگا دی۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس وقت شیخ نے یہ خط نہ لکھا ہوتا اور مجتہدین کا فتویٰ نافذ نہ ہوا ہوتا تو آج ایران خدا جانے غلامی کی کس بدترین حالت میں گرفتار ہوتا۔ بلاشبہ وہ شیخ ہی کا ہاتھ تھا جس نے ایران کے گلے پر چلتی ہوئی چھری کو عین وقت پر روکا اور یہ واقعہ تاریخ کے صفحات پر شیخ کی ایک بہت بڑی یادگار ہے۔ مجتہدین نے جو فتویٰ شایع کیا وہ صرف ایک سطر کا فتویٰ تھا۔ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ آج سے تمباکو کا استعمال کسی صورت میں ہو امامِ وقت سے بغاوت کرنے کا مرادف ہے۔"

یہ ایک سطر تھی جس نے ایران اور شاہِ ایران کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ بقول براؤن کے ایک دن صبح کو جب شاہ نے حسبِ معمول اپنے محل میں قلیان طلب کیا تو خدام نے عرض کیا کہ محل میں تمباکو کا ایک پتہ بھی موجود نہیں۔ فتویٰ کے مطابق سب ضایع کر دیا گیا! یہ واقعہ ایک عظیم الشان تاریخی حیثیت رکھتا ہے کہ گزشتہ ڈیڑھ صدی میں پہلی دفعہ علمائے اسلام نے عامۃ الناس کی آواز کے ساتھ متحد ہو کر ایک پوری قوم کے مستقبل کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پہلی دفعہ مذہبی جماعت اپنے حجروں سے نکل کر رائے عامہ کی رہنما بنی۔ ایران کے صوبوں میں ہر طرف بغاوتیں اور بلوے شروع ہو گئے۔ خصوصاً آذربائجان تبریز قزوین اور طہران میں

سخت بدامنی پیدا ہوگئی اور بالآخر شاہ کو تمباکو کا ٹھیکہ منسوخ کرنا پڑا۔ لیکن قوم پرستوں کی گیلی بارود اب خشک ہوچکی تھی اور حالات حکومت کے قابو سے باہر ہوچکے تھے۔ رائے عامہ کے مقابلہ میں مطلقیت کی یہ پہلی شکست تھی اور آخری شکست کی تمہید۔

اب شیخ کو بڑی فکر یہ تھی کہ ایران کی قومی تحریک آئندہ روکی نہ جاسکے اور کسی طرح اپنی آخری منزل تک پہنچے۔ اسی لیے سلطان ٹرکی کی دعوت رد کرکے وہ بصرہ سے سیدھے لندن آئے جہاں اس وقت ملکم خاں مصروف کار تھے۔ لندن آکر پہلے شیخ نے ملکم خاں کے اخبار "قانون" میں مضامین لکھنے شروع کیے ان کی آواز اب ڈاک کے لفافوں میں بند ہوکر لندن سے طہران آنے لگی اور اس طرح اس نے شاہ اور اس کے حاشیہ نشینوں کی نیندیں حرام کردیں۔

یوں کہنے کو تو شیخ اپنی صحت کی خاطر جس کو ناصرالدین کے مظالم نے بہت صدمہ پہنچایا تھا لندن آئے تھے لیکن درحقیقت ان کے پیشِ نظر اپنا علاج و معالجہ نہ تھا بلکہ ملتِ ایرانی کا معالجہ تھا۔ رجب سنہ ۱۳۰۹ہجری میں انھوں نے عربی اور انگریزی زبان میں ایک اخبار ضیاء الخافقین کے نام سے نکالنا شروع کیا تو اس کی ہر اشاعت میں کم از کم ایک مضمون شیخ خود لکھا کرتے تھے۔ چند ہی روز بعد اس پرچہ کی اشاعت کو روکنے کی کوشش شروع ہوگئی۔ اول تو سفیر ایران متعینہ لندن نے شیخ سے ملاقات کی اور ان کو شاہ کی طرف پھر مایل کرنے اور ان کے جوش کو ٹھنڈا کرنے کی بہت سی احمقانہ کوششیں کیں اور ساتھ ہی ایک معتدبہ رقم بھی ان کی خدمت میں

صفوة اولی الهمم و قدوة ارباب الشمم السرتیپ

الحاج احمد خان لا زال مصوناً بعناية الرحمن

انی قد حللت الآن ببلدة انت ساکنها و منک بهجتها و بک سناها

فکتبت الیک هذه الوریقة زعماً منی انک بتقلبک بین اطوار الزمان

و اختبارک اجناس ابنائه ترغب ان تلاقی کل من دعک

الدهر و حنکه العصر و لو کان فی کن حقیر متربعاً علی حصیر

فان کان الامر کما رأیت فیا لحظی الاوفر و الا فلست اول

من غره الغرر — و انی جهلاً بمحلات الاقامة فی هذه البلدة

نزلت فی خان غریب عفن لا یسکنه الا الصعالیک و الاوباش

یسمی (بکاروان سرای کربلای عوض) و السلام

جمال الدین الحسینی الافغانی

Fac-simile of autograph letter from Sayyid Jamálu'd-Dín al-Afghání, sent to me by Sayyid Taqí-záda, September 19, 1921, together with the original.

پیش کی۔ لیکن شیخ نے رقم لینے سے انکار کیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ اب یہ قضیہ اس آسانی سے طے ہونے والا نہیں ہے۔ ایرانی سفیر جب ہر طرح مجبور ہو گیا تو اس نے برطانوی حکومت کا دامن پکڑا۔ چنانچہ اُس پریس پر جہاں ضیاالخافقین چھاپا جاتا تھا زور ڈالا گیا کہ وہ اس پرچے کو نہ چھاپے۔ چنانچہ یہ تدبیر کامیاب ہوئی اور اس طرح "ضیاالخافقین" کی اشاعت کا سلسلہ بند ہو گیا۔ لیکن اپنی مختصر عمر میں "عُروۃ الوثقیٰ" کی طرح "ضیاالخافقین" کا اثر بھی ایران کے حالات پر انقلابی اور خونی نقش ونگار بنا گیا۔ شیخ اس پرچہ میں جو مضامین ایران کے متعلق لکھتے تھے اُن سے گویا شعلے نکلا کرتے تھے۔ اسی پرچہ میں فروری ۱۸۹۲ء میں علما کے نام شیخ کا ایک کھلا خط شایع ہوا جس کے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:۔

"جب سے یہ شاہ، یہ سانپ، یہ گنہگار، سلطنت پر قابض ہوا اُس نے آہستہ آہستہ علما کے حقوق کو غصب کرنا اُن کے مرتبہ کو گھٹانا اور اُن کے اثرات کو کم کرنا شروع کر دیا تاکہ وہ بالکل خود مختارانہ حکومت اور اپنے ظلم وتعدی کے دائرہ کو وسیع کر سکے۔ پس اُس نے بہت سے لوگوں کو ذلیل کر کے ملک سے نکال دیا اور تحقیر کے ساتھ لوگوں کو شرع شریف کا تحفظ کرنے سے روک دیا اور بہت سوں کو اپنے گھروں سے جبراً دار الظلم طہران میں لایا اور مجبور کیا کہ وہ ذلت کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ اُس نے اپنے لیے میدان صاف کر لیا اور اہلِ ملک کو کچل ڈالا۔ ملک کو تباہ کر دیا۔ مسلسل شرمناک گناہ کرتا رہا۔ علانیہ ہر قسم کی سیاہ کاریاں کرنے لگا

اور اب وہ جو کچھ روپیہ غریبوں کے خون سے اور بیواؤں اور یتیموں کے آنسوؤں سے زبردستی حاصل کرتا ہے وہ سب اپنے عیش اور اپنے حیوانی مشاغل میں صرف کرتا ہے۔ (اے وائے اسلام!) پھر جب اس کی نالائقیاں مختلف صورتوں میں بڑھیں تو اس نے ایک بیوقوف بد معاش کو اپنا وزیر بنانے کے لیے منتخب کیا جو کوئی مذہب نہیں رکھتا ہے کہ وہ اس کو بد اعمالیوں سے باز رکھے۔ یہ گنہگار جوں ہی با اختیار ہوا اُس نے مذہب کو تباہ کرنا اور مسلمانوں سے جنگ کرنی شروع کردی۔ فرنگیوں نے سمجھا کہ اب ایران پر بغیر لڑائی قبضہ کرنے کا وقت آگیا ہے اور یہ خیال کرکے کہ علما کی قوت جو مرکزِ اسلام کو بچایا کرتی تھی کمزور ہوگئی ہے اور اُن کا اثر جاتا رہا ہے وہ سب منہ کھول کر دوڑے کہ اس سلطنت کے ٹکڑوں کو نگل جائیں۔ اس وقت حق باطل سے بگڑ کر اٹھا اور اس نے باطل کو کچل ڈالا اور بڑے بڑے ضدی ظالموں کو ذلیل کردیا۔ میں سچ کہتا ہوں اے قائدین اسلام! تم نے اپنی جرات سے اسلام کا بول بالا کردیا اس کی قوت کو بڑھادیا اور لوگوں کے دلوں کو خوف و ہراس سے بھر دیا۔ تمام غیر ملکوں کو معلوم ہوگیا کہ تمہاری قوت کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ تمہاری طاقت دبائی نہیں جاسکتی۔ اور تمہارے حکم کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تم دنیا کا نمک ہو اور تم ہی اہلِ ملک پر تسلط رکھتے ہو۔ مگر خطرہ بہت سخت ہے اور فوری معاملات بہت نازک ہیں۔ یہ شیطان اب متحد ہوگئے ہیں تاکہ اس چوٹ کا علاج کریں جو انھوں نے کھائی ہے اور اپنے مقاصد حاصل کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور انھوں نے

ارادہ کرلیا ہی کہ اس گنہگار کو کسی طرح دھوکہ دے کر تمام علما کو ملک سے نکلوا دیں۔ پس انھوں نے اُس کو بتایا کہ صرف روسی قوم کے افسروں کی طاقت سے اس کے احکام کی تعمیل کرائی جاسکتی ہی اور یہ کہ موجودہ افسران (جو ایرانی اور مسلمان ہیں) کوئی کام علما کے خلاف انجام نہ دیں گے اور نہ علما کو کوئی نقصان پہنچانے پر آمادہ ہوں گے۔ اس لیے حکومت کے اثر کو قایم کرنے کے لیے اِن افسروں کی جگہ یورپین افسر رکھے جائیں اور اس بیوقوف غاصب کو انھوں نے اس تدبیر کا ایک نمونہ یہ دکھایا ہی کہ شاہی محافظ دستہ اور کاسک بریگیڈ کے لیے یورپین افسران بلائے جائیں اور شاہ اپنے پاگل پن سے اس تدبیر کو پسند کرتا ہی اور اس پر بہت خوش ہی۔

قسم بخدا! جنون اور بدنیتی دونوں نے آپس میں اتحاد کرلیا ہی اور حماقت وحرص مذہب کو تباہ کرنے، شریعت حقہ میں تحریف کرنے اور وطنِ اسلامی کو اغیار کے سپرد کرنے کے لیے متحد ہو گئے ہیں۔

اے رہنمایانِ ملت! اگر تم اس بدبخت فرعون کو تخت پر بیٹھا رہنے دوگے اور اس کو اس کے اعلیٰ منصب سے علیحدہ کرنے میں عجلت نہ کروگے تو پھر سارا معاملہ ختم ہی اور پھر اس کا علاج بہت مشکل ہوگا............"

مندرجہ بالا تحریر میں حسب ذیل علما کو نام بنام مخاطب کیا گیا تھا۔ مجتہدِ اعظم کربلا حاجی مرزا حسن شیرازی[۱]، حاجی حبیب اللہ (رشت) حاجی ملا ابو القاسم کربلائی۔ آقا حاجی مرزا جواد (تبریز) حاجی سید

[۱] دیکھو ضمیمہ

علی اکبر شیرازی[۱]، حاجی شیخ ہادی نجم آبادی[۲]، مرزا حسن اشتبان، صدرالعلما حاجی اقا حسن (عراق)، حاجی شیخ محمد تقی (اصفہان)، حاجی ملا محمد تقی۔

پھر ایک مضمون میں ایران کے حالات کا نقشہ کھینچتے ہیں:۔

" ایرانیوں کی آبادی کا پانچواں حصّہ ترکی اور روسی ممالک میں بھاگ گیا ہے جہاں تم اُن کو آوارہ اور بے وطن دیکھ سکتے ہو۔ سڑکوں اور بازاروں میں مارے پھرتے ہیں کہیں بہشتی ہیں، کہیں بھنگی ہیں، کہیں خاکروب کہیں قلی، پھٹے ہوئے کپڑوں میں اور باوجود افلاس اور عسرت کے وہ خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ جان سلامت لے آئے۔ گورنر اور اُن کے حاشیہ نشین اب وہ رقمیں وصول کرتے ہیں جو انھوں نے رشوت میں دربار کو دی تھیں اور جن کو جمع کرکے بادشاہ کے خزانہ میں داخل کرنے کا انھوں نے اقرار کیا تھا۔ اپنے تمام زمانۂ حکومت میں وہ ہر قسم کی پاجیانہ و ذلیل حرکتیں اور خوفناک مظالم کرتے ہیں تاکہ اُن کے مقاصد حاصل ہوں۔ عورتوں کے بال باندھ کر لٹکایا جاتا ہے۔ مردوں کو خونخوار کتّوں کے ساتھ تھیلوں میں بند کیا جاتا ہے اُن کے کان لکڑی کے تختوں میں کیلوں سے ٹھونکے جاتے ہیں اُن کی ناک کے اندر رسیاں ڈالی جاتی ہیں اور پھر وہ اس حال میں شہر کی سڑکوں پر اور بازاروں میں گشت کرائے جاتے ہیں۔ اُن کے لیے سب سے نرم سزا لوہے سے داغنا اور کوڑوں سے مارنا ہے"

" ضیاء الخافقین " ہی میں شیخ نے ایک دفعہ شاہِ ایران کو تخت سے اُتارنے اور ذلیل کرنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ۔

[۱] دیکھو ضمیمہ نمبر ۳۵ — [۲] دیکھو ضمیمہ نمبر ۳۶



مرزا محمد رضا کرمانی

جس نے ناصرالدین شاہ کو بتاریخ یکم مئی ۱۸۹۶ع گولی کا نشانہ بنایا
اس کو بتاریخ ۱۲ اگست ۱۸۹۶ع پھانسی پر لٹکایا گیا۔

"اُس کا معزول کر دینا اتنا بھی مشکل نہیں جتنا کہ پانو سے جوتے اتارنا"
شیخ اپنی کوششوں کے نتائج کو امید افزا پاتے تھے اور اچھی طرح دیکھ رہے تھے کہ علما کی مخالفت اور رعایا کی شورش نے ناصرالدین شاہ کے تخت کو ہلا دیا ہے۔ وہ اپنی تحریک کے جن انتہائی نتائج کا انتظار کر رہے تھے وہ نتائج ان کی رحلت کے چند سال بعد انقلاب ایران کی صورت میں پیدا ہوئے لیکن اِس سے پہلے ہی ناصرالدین شاہ کو بحکم خدا اپنے اعمال کی پوری قیمت ادا کرنی پڑی۔ ۶ رمئی ۱۸۹۶ء کو جب شیخ قسطنطنیہ میں مقیم تھے شاہ عبدالعظیم کے دروازہ پر جہاں شیخ ٹٹو کی کمر سے باندھے گئے اور سڑک پر گھسیٹے گئے تھے۔ ٹھیک وہیں ناصرالدین شاہ کی عمر کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک گیا۔ اگرچہ کہ ناصرالدین شاہ کا قتل اور اُس کے بعد کے واقعات اس داستان کے تسلسل سے باہر ہیں لیکن ایرانی واقعات کے تسلسل کو جاری رکھنے کے لیے بہتر یہی ہے کہ ایران میں اصلاح ملّت اور انہدام مطلقیت کے متعلق شیخ کی کوششوں کو یکجا بیان کر دیا جائے۔
۱۸۹۶ء میں قسطنطنیہ میں بیٹھے ہوئے شیخ اپنی زندگی کی آخری منزل پر آچکے تھے۔ لیکن وہ ایران کے حالات کا مطالعہ کرتے رہتے تھے اور اپنے ایرانی معتقدین سے ان کے رسل و رسائل کا سلسلہ جاری تھا۔ نیز وہ ایران کے معاملات کے متعلّق مجتہدین سے بھی خط و کتابت کرتے رہتے تھے۔ یکم مئی ۱۸۹۶ء کو ناصرالدین شاہ اپنی سالگرہ کی تقریب میں درگاہ شاہ عبدالعظیم پر حاضر ہوئے اور وہیں درگاہ کے دروازہ پر قتل کر دیئے گئے۔ ان کا قاتل مرزا رضا خاں کرمانی شیخ کے معتقدین میں سے تھا۔ شاید اسی بنا پر یہ خیال کیا گیا کہ اس واقعہ کے

محرک در اصل شیخ ہی تھے۔ حالانکہ خود رضا خاں ایران میں بہت سخت مظالم برداشت کرچکا تھا اور کچھ تعجب نہیں کہ یہ واقعہ خود اسی کے انتقامی جذبات کا تقاضہ ہو۔ یہ سچ ہے کہ وہ قسطنطنیہ میں کچھ عرصہ شیخ کے پاس قیام کرکے طہران واپس آیا تھا لیکن بیّن ثبوت اس امر کا موجود نہیں کہ شیخ نے کرمانی کو اس کام کے کرنے کا اشارہ کیا ہو۔ رضا خاں نے جو بیان مرزا ابوتراب خاں ناظم الدولہ کے روبرو لکھوایا تھا وہ اس واقعہ کی بہت سی تفصیلات پر حاوی ہے گو یہ ضروری نہیں کہ وہ تمام تفصیلات صحیح ہوں۔ پروفیسر براون نے اس طویل بیان کے کچھ ضروری اقتباسات "انقلاب ایران" میں درج کیے ہیں اور اُن میں سے بعض اس جگہ نقل کیے جاتے ہیں۔

"سوال:- جب تم قسطنطنیہ میں تھے تو یہ تین شخص مرزا اقا خاں، مرزا حسن خاں اور شیخ ابو القاسم کس جرم میں گرفتار کیے گئے تھے؟

جواب:- مشہور ہے کہ ایرانی سفیر علاءالملک ان تینوں سے بغض رکھتا تھا چونکہ یہ لوگ اُس کی پروا نہ کرتے تھے .... اِن پر یہ الزام لگایا گیا کہ یہ لوگ خبریں جمع کرتے ہیں۔ اور ایران میں فساد کراتے ہیں ...... یہ تو اِن دونوں کا قصور بتایا گیا مگر حاجی مرزا حسن کو اس وجہ سے پکڑا گیا کہ اُن پر یہ الزام تھا کہ انھوں نے چند خطوط نجف اور کاظمین کے علما کو لکھے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ خطوط سید جمال الدین کے اشارہ اور اُن کی ہدایت کے مطابق لکھے گئے تھے اور اِن خطوط میں مجتہدین کو ترغیب دی گئی تھی کہ عثمانی خلافت کی تائید کریں۔ یہ خطوط ایرانی وزیرِ اعظم کے ہاتھ میں پہنچ گئے ...."

سوال:- ہمیں یہ اطلاع ملی ہے کہ قسطنطنیہ سے روانگی کے وقت

تمھارا ہم سفر کوئی اور شخص بھی تھا علاوہ شیخ ابوالقاسم کے اور یہ کہ سید جمال الدین نے تم کو کچھ ہدایات کی تھیں۔ واقعات کیا ہیں ؟

جواب :۔ سوائے ابوالقاسم کے میرے ساتھ کوئی نہ تھا۔

سوال :۔ مگر تم اُن ہدایات کو نہیں بتاتے جو قسطنطنیہ سے لائے تھے۔

جواب :۔ مجھے کوئی خاص ہدایات نہیں ملی تھیں۔ مگر سید جمال الدین کے خیالات سب کو معلوم ہیں اور اُن کا طریقۂ گفتگو بھی معلوم ہے۔ وہ اپنی گفتگو میں معتدل نہیں ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ شاہ اور اُس کے وزرا ظالم ہیں۔ اُن کی گفتگو کا یہی انداز ہے۔

سوال ....۔ ہم اُن لوگوں کے نام معلوم کرنا چاہتے ہیں جو تمھارے ہم خیال اور ہم رائے ہیں تاکہ اگر آئندہ اصلاحات کے سلسلہ میں ہمیں ضرورت ہو تو اُن سے مشورہ لے سکیں۔

جواب :۔ ...... میں اپنی عزت اور جان کی قسم کھاتا ہوں کہ جھوٹ نہ بولوں گا اور اُن لوگوں کی تعداد اس شہر میں اور اِس ملک میں بہت ہے جو میرے ہم خیال ہیں۔ علما میں۔ وزرا میں۔ امرا میں۔ تجار میں اور تمام دوسرے طبقوں میں ایسے لوگ بہت ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جب سید جمال الدین اس شہر میں آئے تو ہر طبقہ کے لوگ طہران میں بھی اور شاہ عبدالعظیم میں بھی اُن سے ملنے اور ان کی خدمت میں رہنے کے لیے آتے تھے اور آپ کو معلوم ہے کہ وہ کس طرح اُن کے لیکچر اور وعظ سنتے تھے اور چونکہ جو کچھ سید جمال الدین کہتے تھے وہ خدا کے لیے اور عامۃ الناس کی بھلائی کے لیے ہوتا تھا اس لیے ہر شخص ان کے بیان سے متاثر ہوتا تھا اور سب مسحور ہو جاتے تھے۔ اس

طرح انھوں نے لوگوں کے دلوں میں اُن خیالات کا بیج ڈالا اور اس طرح عامۃ الناس جاگے اور اپنے ہوش میں آگئے۔ اب ہر شخص وہی خیالات رکھتا ہے جو میں رکھتا ہوں۔ مگر میں خدائے برتر و قادر کی قسم کھاکر کہتا ہوں کہ میرے اس خیال اور شاہ کو قتل کرنے کے ارادہ سے سوائے میرے کوئی واقف نہ تھا .... جو کچھ تم سے ہو سکے کرلو.......؟

سوال :- کیا اُس کے (شیخ ہادی کے) جمال الدین سے خاص تعلقات ہیں اور اُس کی مسلسل خط و کتابت سید سے رہتی ہے۔

جواب :- میں کیا کہہ سکتا ہوں مجھے معلوم نہیں کہ حاجی شیخ ہادی کی براہِ راست خط و کتابت ہوتی ہے یا نہیں۔ مگر شیخ ہادی سید کے بہت معتقد ہیں اور اُن کو بہت بڑا آدمی سمجھتے ہیں۔ جس کسی میں ذرا سی عقل بھی ہوگی وہ سمجھ سکتا ہے کہ سید اپنے زمانہ کے اِنسانوں میں سب سے جُدا ہیں۔ ہر چیز کی حقیقت اُن کی نظر میں واضح ہوتی ہے۔ یورپ اور تمام دنیا کے فلاسفروں اور عقلا کی گردنیں اُن کے سامنے جھکی ہیں۔ اِس زمانہ کا ایک بھی عالم و فلاسفر اُن کا خادم یا شاگرد ہونے کی اہلیت نہیں رکھتا.........

ایرانی حکومت اُن کی قدر و قیمت نہ سمجھ سکی اور اُن کے محترم وجود سے فائدہ نہ اٹھا سکی۔ اُس نے سید کو بے عزتی اور حقارت کے ساتھ نکالا۔ اب جاکر دیکھو کہ سلطان ترکی اُن کی کس قدر قدر و منزلت کرتے ہیں۔ جب سید ایران سے لندن گئے تو سلطان نے اُن کو کئی دفعہ تار دیئے کہ افسوس ہے آپ کا مقدس وجود اسلامی ممالک سے اِس قدر دُور چلا جائے اور مسلمان اُس سے فائدہ نہ

اُٹھا سکیں۔ مرکزِ اسلام پر آتے تاکہ مسلمانوں کی اذان کی آواز آپ کے کانوں میں جائے اور ہم یک جا رہیں۔ اوّل تو سید رضا مند نہ تھے مگر پرنس ملکم خاں اور بعض دوسرے دوستوں کے کہنے سے وہ قسطنطنیہ گئے اور سلطان نے اُن کو ایک بڑا محل رہنے کے لیے دیا اور دوسو پونڈ ماہوار ان کا وظیفہ مقرر کیا اور کھانا شاہی باورچی خانہ سے دونوں وقت بھیجا جاتا ہے اور شاہی گھوڑا گاڑی ہر وقت ان کی خدمت میں حاضر ہے۔ جس دن سلطان نے ان کو یلدیز میں بلایا تو ان کے چہرہ پر بوسہ دیا۔ وہ دونوں اسٹیم بوٹ پر جو شاہی باغ کی جھیل میں چلتی ہے بیٹھے ہوئے عرصہ تک باتیں کرتے رہے اور سید نے وعدہ کیا کہ وہ بہت جلد اسلامی سلطنتوں کو متحد کر دیں گے۔ اور ان سب کو خلافت کی طرف راغب کر دیں گے اور سلطان کو تمام مسلمانوں کا امیر المؤمنین بنا دیں گے۔ اس کے بعد اُنھوں نے کربلا و نجف و ایران کے تمام شیعہ علما سے خط و کتابت شروع کی اور وعدوں اور امیدوں اور دلائل سے ان کو سمجھایا کہ اگر مسلمان سلطنتیں متحد ہو جائیں گی تو دنیا کی تمام اقوام بھی مل کر ان کے خلاف کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ اُن کو چاہیے کہ عمرؓ اور علیؓ کے متعلق اپنے زبانی جھگڑوں کو الگ رکھیں۔ اور خلافت کے مسئلہ پر غور کریں۔ اسی زمانہ میں سامرا میں شیعہ سُنّی کا جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا۔ سلطان ترکی نے یہ خیال کرکے کہ شاہ ایران نے خاص طور پر یہ قضیہ شروع کرایا ہے تاکہ عثمانی سلطنت میں بدنظمی پیدا ہو سید سے اس معاملہ کے متعلق مشورہ کیا۔ سید نے کہا کہ چونکہ ناصر الدین شاہ عرصہ سے تخت پر قابض ہے اس لیے اُس کا اثر ایسا ہے کہ شیعہ علما اور اہلِ ایران ہمارے مقاصد کی تائید کرنے پر آمادہ نہ ہوں گے۔

سوال :۔ تم سلطان اور سیّد کی ملاقات کے وقت موجود نہ تھے تو یہ سب باتیں تم کو کیسے معلوم ہوئیں۔

جواب :۔ مجھ سے زیادہ سید کا رازدار کوئی نہ تھا وہ مجھ سے کسی بات کو نہ چھپاتے تھے۔ جب میں قسطنطنیہ میں تھا تو وہ میرے ساتھ اس قدر عزت کا برتاؤ کرتے تھے کہ لوگ مجھے درجہ میں ان کے بعد سمجھتے تھے۔ سوائے سیّد کے میرے برابر کسی کی عزت نہ کی جاتی تھی۔ یہ تمام معاملات خود سیّد نے مجھ سے بیان کیے اور اس قسم کی وہ بہت سی باتیں مجھ سے کہا کرتے تھے جو مجھے اس وقت یاد نہیں۔ جب وہ باتیں کرنا شروع کرتے تھے تو مسلسل کیے جاتے تھے جس طرح ٹوٹی ہوئی کمانی والی گھڑی کو چابی دی جاتی ہو! میں کس طرح سب باتیں اُن کی یاد رکھ سکتا تھا

- - - - - - - - - - - - -

سوال :۔ . . . . . . اس کے بعد کیا ہوا۔ جو خطوط سیّد نے علما کو لکھے تھے اُن کا کوئی اثر ہوا۔

جواب :۔ ہاں سب نے جواب دیا اور ان کی خدمت کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ بعض حریص اخوند اور ملا روپیہ اور عزت کے وعدوں کو سن کر کہیں خاموش رہ سکتے ہیں۔ المختصر جب سیّد نے اپنی تجویز کو پختہ کرلیا اور اس کا نتیجہ نکالنے والے ہی تھے تو سلطان کے بعض آدمیوں نے، بعض ایسے مکّاروں نے جو سلطان کو گھیرے رہتے ہیں جیسے ابوالہدیٰ[۵] یہ چاہا کہ اس کام کا سہرا اپنے سر باندھے۔ چنانچہ انھوں نے سلطان کو

---

۵ سلطان کا منجم اور پیر بھی کہا جاتا تھا۔ عبدالحمید خاں اُس کے بہت معتقد تھے۔ نوجوان ترکوں نے اپنی تحریک کے سلسلہ میں اِس شخص کو اپنے زیر اثر کرلیا تھا اور اُسی کے ذریعہ سے (بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۲۶۳)

سید کی طرف سے مشتبہ کر دیا اور یہ بتایا کہ وہ خدیو مصر سے ملے تھے۔ اور سلطان سے مایوس ہو کر خدیو کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ سلطان کچھ افسردہ خاطر اور مجنون سے رہتے ہیں۔ اُن کو ہمیشہ یہ خطرہ رہتا ہے کہ محل کی عورتیں انھیں قتل نہ کر ڈالیں۔ پس وہ مشتبہ ہو گئے۔ سید کی نگرانی کے لیے پولیس مقرر کر دی گئی اور سواری بھی اُن سے لے لی گئی۔ سیّد کو بہت ناگوار ہوا اور انھوں نے لندن جانے پر اصرار کیا۔ اُس کے بعد پھر دونوں میں صلح ہو گئی اور پولیس کی نگرانی بھی نہ رہی اور گھوڑا گاڑی بھی آگئی۔ اس مصالحت کے بعد کہا کرتے تھے کہ افسوس ہے یہ شخص (سلطان) مجنون ہے ورنہ میں تمام مسلمان قوموں کو اس کا عقیدت مند بنا دیتا۔ مگر چونکہ اُس کا نام بڑا ہے اس لیے یہ کام اُسی کے نام سے کرنا ہوگا۔" جس کسی نے سیّد کو دیکھا ہے وہ جانتا ہے کہ سیّد کس قدر ضدّی آدمی ہیں۔ وہ کبھی اپنے فائدہ کا خیال نہیں کرتے نہ اپنے لیے روپیہ چاہتے ہیں نہ عزّت نہ حقوق۔ وہ بہت پرہیزگار آدمی ہیں۔ وہ صرف اسلام کی عزّت بڑھانا چاہتے ہیں۔ اب بھی اگر مظفر الدین شاہ کو اس حقیقت کا احساس ہو اور وہ سید کو بلائیں اور ان سے مصالحت کریں تو یہ کام (نصب خلافت) ان کے نام سے کریں گے۔

سوال:۔ کیا تمھارا یہ مطلب ہے کہ اِن تمام واقعات کے بعد جو تم نے بیان کیے ہیں سیّد کو اپنے یہاں محفوظ رہنے پر اس قدر بھروسہ ہوگا کہ وہ بے خوف چلے آئیں گے۔

جواب:۔ ہاں میں سید کو خوب جانتا ہوں۔ اگر شاہ کسی غیر سلطنت کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۲) سلطان پر زور ڈلوایا تھا کہ اصلاحات کو قبول کریں گر نوجوان ترکوں نے اپنی تحریک کی کامیابی کے بعد اس شخص کو برطرف کر دیا۔

اُن کی جان کا ضامن بنانا پسند کریں گے تو وہ کسی بات کی پرواہ نہ کریں گے۔ وہ آئیں گے اور شاید اسلام کی بہت بڑی خدمت انجام دیں گے۔ علاوہ بریں وہ جانتے ہیں کہ اُن کی جان کوئی قیمت نہیں رکھتی اور اُن کا خون اگر بہایا جائے گا تو قیامت تک خشک نہ ہوگا۔"

پھر پھانسی لگنے سے ایک دن پہلے رضا خاں نے ایک بیان دیا جس میں اپنے ان جذبات کا اظہار کیا جو اس قتل کے محرک ہوئے تھے:۔

"جو کچھ ہوگیا ہوگیا۔ میرا ایمان ہے کہ خدا کے حکم کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں گرتا۔ میں نے اپنی رائے میں انسانوں قوم اور ملک کی ایک خدمت انجام دی ہے۔ میں نے تخم پر پانی ڈالا ہے اور اب وہ جمتا ہے۔ سب لوگ سو رہے تھے اور اب وہ جاگتے جاتے ہیں۔ میں نے ایک سخت اور بے ثمر درخت کو اُکھاڑ کر پھینک دیا ہے جس کے سایہ میں ہر قسم کے زہریلے اور خونخوار بہایم جمع تھے۔ میں نے اُن جانوروں کو منتشر کر دیا ہے..........."

ناصرالدین شاہ کے قتل سے شیخ کا تعلّق کیا تھا یا کچھ نہ تھا اس کے متعلّق قیاسات تو بہت ہیں مگر کوئی صریح شہادت موجود نہیں۔ بلنٹ۔ سعید پاراس (مولف جمال الدین افغانی مطبوعہ قسطنطنیہ) اور آقا مرزا حسین خاں دانش اور بعض دوسرے لوگوں نے قیاسات سے کام تو لیا ہے مگر کوئی شہادت فراہم نہ ہوسکی۔ البتہ مرزا لطف اللہ شیخ کے متعلّق اس شبہ کو بالکل بے بنیاد سمجھتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"مرزا رضا این کہ می گوید کہ این قضیہ قتل ناصرالدین شاہ باجازہ سید بودہ نگارندہ تکذیب می کنم زیرآنچہ بر بندہ ثابت و معلوم شد درآن وقت

سید بہ ایں کار میل نداشت ۔چنانچہ وقوع ایں مسئلہ اغلب نقشہ ہائے سید را بہم زد ۔ سر مرتکب شدن مرزا رضا بقتل شاہ ایں بود کہ از فرط عشق و محبت و ارادتے کہ نسبت بہ حضرت داشت واقعاً نہ توانست بشنود کہ کسے نام مرحوم سید جمال الدین را بتوہین ببرد۔"

اور مرزا لطف اللہ کا یہ خیال قرین قیاس بھی معلوم ہوتا ہے۔

قصہ مختصر شیخ ایران میں اپنی تعلیمات کا ایک ایسا چراغ روشن کر گئے جس نے بڑی بڑی آندھیوں اور بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کیا اور اس چراغ سے سیکڑوں اور ہزاروں چراغ روشن ہوئے۔خود ان کی زندگی میں بھی اور اُن کے بعد سے آج تک یہ روشنی بڑھتی رہی ہے۔

ایران میں شیخ کے ارشد تلامذہ اور مخصوص معتقدین کی ایک بہت بڑی فہرست ہمارے سامنے ہے "صاحب بیداری ایران" لکھتا ہے کہ۔

"وزیں قبیل متجاوز از پنجاہ نفر بودند کہ در مجالس سید مات دمبہوت و ساکت می نشستند دبخدمتش افتخار می نمودند"

اُن پچاس میں سے بھی جو درحقیقت قومی تحریک میں شیخ کے نائب اور معتمد تھے صرف چند ہی کے نام اس موقعہ پر لیے جا سکتے ہیں۔ شیخ علی قردینی مرزا آقا خاں ۔مرزا محمد علی خاں طہرانی ۔ شیخ احمد روحی کرمانی ۔جمال الدین واعظ اصفہانی۔ شیخ محمد خیابانی ۔ شیخ ہادی نجم آبادی ۔اقائے طباطبائی ۔ امین الدولہ ۔مشیر الدولہ۔ آقا مرزا نصر اللہ خاں۔ آقا مرزا فرج اللہ خاں ۔ ذکا ء الملک ۔اعتماد السلطنت۔ ڈاکٹر مہدی خاں ۔مرزا داؤد خاں ۔ مرزا عبد اللہ خراسانی ۔محمد حسن امین الضرب۔ آقا مرزا علی اکبر۔ آقا مرزا ارباب ۔مرزا حسن علی ۔عبد العظیم ہراتی اور شیخ الرئیس ملائے طالقانی ۔ اگر ان ہی چند کی زندگی کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھے جائیں تو انقلاب

ایران کی مکمل تاریخ قلمبند ہوسکتی ہی۔ اِس گروہ کا ہر فرد ایران کے عہدِ نو کا ایک معمار تھا۔ انشا اللہ اس کتاب کی دوسری جلد میں کوشش کی جائے گی کہ تمام ممالک اسلامی میں شیخ کے اُن معتقدین اور شرکارِ کار کے حالات کو یکجا کر دیا جائے جو اُس زمانے میں اُن کی تحریکات کے اعضائے رئیسہ تھے۔ القصہ شیخ جب اس جماعت کو ایران میں چھوڑ کر نکلے تو اُن کی ہجرت کے بعد اُن ہی لوگوں میں سے اکثر نے اِس آتشدان کی آگ کو روشن رکھا۔ ۱۹۰۹ء میں انقلاب ایران اور آخر کار خاندانِ قاچار کا زوال اور شاہ رضا خاں پہلوی کا عروج یہ سب اُسی درخت کی سرسبز شاخیں ہیں جو شیخ نے سرزمین ایران پر نصب کیا تھا۔

اب ہم اِس منزل پر ایران کی داستان سے قطع نظر کر کے شیخ کی زندگی کے حالات پھر اُس وقت سے شروع کرتے ہیں جب وہ ایران سے خارج کیے گئے تھے۔

خانقین۔بغداد بصرہ و لندن

اس داستان کے تسلسل کا ٹوٹا ہوا رشتہ اس طرح پھر جوڑا جاتا ہی کہ خانقین سے بغداد ہوتے ہوئے شیخ لندن آئے۔ بغداد کے قیام کی کوئی تفصیل معلوم نہیں مگر بصرہ کے متعلق حالات گزشتہ صفحات سے واضح ہوتے ہیں۔ شیخ ایک دفعہ پھر لندن جاکر ملکم خاں کے ساتھ ایران کے متعلق کچھ کام کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ سلطان عبدالحمید خاں کی دعوت کو رد کر کے شیخ نے لندن کا رُخ کیا۔

"سید جمال الدین افغانی بعد حصولِ صحت بموجب درخواست تلغرافی یکے از وزرائے لندن بہ انگلستان عازم شد"۔ [۱]

مجلہ کابل میں اُعظمی کے اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہی کہ حکومت انگلستان نے شیخ کو انگلستان آنے کی دعوت دی تھی۔ لیکن اس واقعہ کی — اگر یہ

[۱] جریدہ مصورہ اسلامبول۔

واقعہ ہی۔ کوئی تصدیق کسی بیان سے نہیں ہوتی۔ ایسا ہوتا تو کم از کم بلنٹ ضرور کوئی ذکر کرتے لیکن ایک دوسرے بیان سے یہ قیاس ہوتا ہی کہ بہر صورت شیخ کے ورود لندن کو انگریزی حکومت نے اُس وقت ناپسند نہیں کیا تھا اس لیے کہ۔

"در لندن از طرف جریدہ ٹائمس وبعض معززین دیگر استقبال کردہ می شود و رئیس الوزرائے حکومت انگلستان ہم چندیں بار برائے ملاقات او بہ ہوٹلے کہ دراں اقامت داشت می آید۔

تعجب ہی کہ بلنٹ نے اس زمانہ کے حالات کہیں قلمبند نہیں کیے۔ اگر شیخ سے اور برطانوی مدبرین سے اس زمانہ میں واسطہ رہا تو یہ ممکن نہیں کہ بلنٹ اُن معاملات سے بے تعلق رہے ہوں درآں حالیکہ اس دفعہ شیخ لندن میں بہت نمایاں رہے اور مختلف ذرایع سے معلوم ہوتا ہی کہ سیاسی اور پبلک معاملات میں شیخ اکثر حصہ لیتے رہتے تھے۔ نیز اُس زمانہ میں مصر اور ایران کے متعلق اُن کے مضامین بھی لندن کے اخبارات میں شایع ہوتے رہے۔

"در روز جشن ولادت ملکہٴ وکٹوریہ کہ تمام اشراف و بزرگان ونمایندہائے خارجہ حضور داشتند اربابِ حکومت از سید خواہش نمودند کہ بہ مجمع بزرگ نقطے ایراد نماید۔ سید ہم چنان نطق موثر ایراد فرمود کہ حکومتِ نطق عالی را بہ اہتمام نوٹ کردہ بجراید شایع کرد"۔ ؎۵

بہر حال معلوم ہوتا ہی کہ شیخ کے متعلق اِس زمانہ میں انگریزی حکومت کا رویہ بدلا ہوا تھا۔ ڈیڑھ سال تک شیخ اس طرح لندن میں رہے لیکن اُن کی

؎۵ اعظمی در مجلہٴ کابل۔

زندگی کے اس زمانہ کا بڑا حصّہ نظر سے پوشیدہ ہی۔ اُس زمانہ میں شیخ کے بڑے دوست اور شریکِ کار شاہزادہ ملکم خاں تھے شیخ کی صحبتیں اکثر ہالینڈ پارک میں اُن ہی کے مکان پر جما کرتی تھیں۔ چنانچہ آخر ۱۸۹۱ء میں پروفیسر براؤن بھی شیخ سے اُسی جگہ ملے تھے اور اپنی کتابوں میں اُن صحبتوں کا ذکر کرتے ہیں۔

جب شیخ لندن میں ایران کے متعلق جد و جہد کر رہے تھے تو قسطنطنیہ سے سلطان عبدالحمید خاں نے اُن کو پھر ترکی آنے کی دعوت بھیجی ترکی سفیر رستم پاشا شیخ کے پاس سلطان کا پیام لے کر آئے مگر شیخ نے پھر بھی انکار کیا۔ تب سلطان نے قسطنطنیہ سے خود دو تین تار بھیجے۔ شیخ ابھی کچھ روز اور لندن سے جانا نہ چاہتے تھے لیکن پرنس ملکم خاں نے اُن کو مشورہ دیا کہ بار بار دعوت کو رد کرنا مناسب نہیں نیز یہ کہ شیخ کا ترکی جانا ایران کے معاملات کے متعلق بھی مفید ثابت ہوگا۔ بالآخر ۱۸۹۲ء میں شیخ لندن سے رخصت ہوکر اپنی زندگی کی آخری منزل کی طرف روانہ ہوئے۔

قسطنطنیہ | جس وقت شیخ آلِ عثمان کے دارالخلافہ میں پہنچے تو دولتِ عثمانیہ زوال وانحطاط کے مدارج بہت تیزی کے ساتھ طے کر رہی تھی۔ یوروپین تدبر کی قوت نے اُس کو بالکل بے دست و پا کر دیا تھا۔ شیخ اس بیمار کے بستر کے پاس اُس وقت آئے جب نزع کا عالم شروع ہوچکا تھا۔ مرض الموت کی یہ داستان ۱۸۲۱ء سے شروع ہوتی ہی جب محمد علی پاشا خدیو مصر کی قوت روز بروز بڑھ رہی تھی اور یونان بھی ترکی کے خلاف پوری تیاریاں کر رہا تھا۔ چنانچہ سلطان کو مجبور ہوکر محمد علی سے امداد مانگنی پڑی اور اس امداد کے معاوضہ میں مور یا شام اور دمشق کی گورنری دینے کا وعدہ کرنا پڑا۔ بالآخر ۱۸۲۶ء میں محمد علی کے بیٹے ابراہیم پاشا نے

یونانیوں کو شکست دے کر اِس بغاوت کو ختم کر دیا اور ایتھنز پھر ایک دفعہ چند روز کے لیے ترکوں کے قبضہ میں آیا۔ لیکن انگلستان، روس اور ترکی یونان کی حمایت پر آمادہ ہوئے۔ اور سینٹ پیٹر سبرگ میں یونانی مسئلہ پر غور کرنے کے لیے ایک کانفرنس منعقد کرائی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی کو بادلِ ناخواستہ یونان کو آزاد کرنا پڑا اور اُس کی سیادت محض برائے نام باقی رہ گئی۔ نیز بحرِ اسود میں روسی جہازوں کو آمد و رفت کی اجازت بھی دینی پڑی۔ ترکی کے گلے کے پھندے اس طرح روز بروز تنگ ہوتے جاتے تھے۔ دوسری طرف سلطنت کے داخلی در و بست کی یہ صورت تھی کہ جانثاری سیاہ سفید کے مالک ہو گئے تھے حتیٰ کہ سلطان کا عزل و نصب اور وزرا کا تقرر بھی اُنھیں کی رائے پر منحصر ہو گیا تھا۔ بالآخر سلطان محمود نے تنگ آکر ۱۸۲۶ء میں جانثاریوں کا قتلِ عام کر دیا اور ملک کا انتظام ایک نئی اور بہتر قسم کی فوج کے ہاتھ میں آیا۔ جانثاریوں کی بیخ کنی نے کچھ عرصہ کے لیے ملک کی اندرونی تباہی کو روک دیا اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ ترکی کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ مگر اس نئی تعمیر میں بھی خرابی کی صورتیں مضمر تھیں۔ نئی فوج میں جرمن اور فرانسیسی افسر اور معلم مقرر کیے گئے لیکن اُدھر تو سلطان محمود اندرونی اصلاحات کی تکمیل میں مشغول تھا اور اِدھر روسی فرانسیسی اور برطانوی بیڑوں نے مصری اور ترکی جہازوں کو یونان کے قریب پسپا کر کے تباہ کر ڈالا۔ گو کہ اُس کے بعد روس کے متعلق اپنے رقیبانہ جذبات سے متاثر ہو کر انگلستان پھر ترکی سلطنت کے وجود کو قایم رکھنے کی پالیسی پر واپس آگیا۔ لیکن اِس خارجی ہنگامے نے داخلی اصلاحات کی بنتی

ہوئی عمارت کو روک دیا اور باوجودیکہ ٹرکی نے ایک بہت سخت جنگ کے بعد روس کو شکست بھی دی لیکن بالآخر دول کی مداخلت نے ۱۸۳۲ء میں یونان کو کلیتاً آزاد کر دیا۔

اسی زمانے میں ترکی کے خارجی ملحقات بھی یکے بادیگرے اغیار کے قبضہ میں چلے گئے۔ بوسینا اور البانیا میں بغاوت شروع ہوئی، فرانس نے الجزایر پر قبضہ کرلیا۔ فرانس کی امداد کے بھروسہ پر محمد علی پاشا نے عثمانی تاج و تخت پر قبضہ کرلینے کی فکریں شروع کر دیں چنانچہ دمشق اور حلب پر محمد علی کا قبضہ ہوگیا۔ سلطان نے چاہا کہ مصریوں اور فرانسیسیوں کے مقابلہ میں انگریز ان کی حمایت کریں لیکن اُدھر سے بھی صاف جواب ملا۔ بالآخر سلطان کو روس کی امداد مانگنی پڑی اور روسی فوجیں باسفورس کے ساحل تک بلالی گئیں۔ جنھوں نے محمد علی کی پیش قدمی کو کچھ عرصہ کے لیے روک دیا لیکن روس نے اِس موقعہ پر جو امداد کی اس کا معاوضہ بھی ہاتھ کے ہاتھ وصول کرلیا۔ ۱۸۳۳ء کے عہد نامہ کی رو سے روسی جہازوں کو آبنائے باسفورس میں گزرنے کی اجازت مل گئی حالانکہ کسی دوسری یورپین سلطنت کے جہازوں کو آبنائے سے گزرنے کا حق حاصل نہ تھا۔ محمد علی نے جو اپنی ناکامی کو بھولا نہ تھا ۱۸۳۹ء میں پھر ایک دفعہ شام میں ترکی کو شکست فاش دی اور معرکۂ کارزار گرم ہوگیا۔ اسی زمانہ میں سلطان عبدالحمید اوّل تخت نشین ہوئے۔ وہ وقت بہت نازک تھا۔ محمد علی کی قوت اب اس قدر بڑھ چکی تھی کہ امیرالبحر احمد پاشا کی غداری کی وجہ سے ترکی بیڑہ پر بھی محمد علی قبضہ کرچکا تھا۔ لیکن اُس کے بڑھتے ہوئے اثرات سے خائف ہوکر دول کی ایک کانفرنس

بمقام لندن ۱۸۴۰ء میں منعقد کی گئی ۔ اور اِس کانفرنس میں فیصلہ کیا گیا کہ مصر کی گورنری نسلاً بعد نسلٍ محمد علی کو دی جائے اور آبنائے باسفورس کو تمام دول کے جہازوں کے لیے بند کر دیا جائے اور بحیرہ اسود میں بھی روسی جہازوں کو داخل ہونے کی اجازت نہ دی جائے ۔ سلطان عبدالمجید دول کی سازشوں کے مقابلہ میں اپنی کمزوری اور لاچاری کو بخوبی محسوس کر رہے تھے ۔ اور خارجی معاملات میں اپنی بے بسی اور ناکامی سے متاثر ہوکر انھوں نے ارادہ کرلیا کہ پہلے اپنی تمام قوتِ داخلی اصلاحات پر صرف کریں ۔ چنانچہ مصطفیٰ رشید پاشا جو ترکی کے وزیر خارجہ رہ چکے تھے اور لندن میں سفیر تھے واپس بلائے گئے اور انھوں نے اندرونی اصلاحات کی ایک اسکیم تیار کی جس کو ترکی تاریخ میں "تنظیمات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ اِن تنظیمات کی منظوری سلطان نے دے دی اور پہلا "خط ہمایونی" جاری ہوا ۔ گویا ترکی میں آئینی اصلاحات کا یہ پہلا قدم تھا ۔ تنظیمات کے نفاذ نے ملک کے انتظامی حالات کو بہتر بنانا شروع کیا ۔ لیکن اصلاح حال کی اس بڑھتی ہوئی تحریک نے روس کو بے چین کر دیا اور روسی مدبرین یہ سمجھنے لگے کہ اگر ترکی میں آئینی اصلاحات بخوبی نافذ ہوگئیں تو مداخلت کے امکانات قدرتاً کم ہو جائیں گے اور روسی منصوبے خاک میں مل جائیں گے ۔ چنانچہ ۱۸۴۴ء میں زارِ روس نے خود لندن جاکر یہ تجویز پیش کی کہ برطانیہ اور روس عثمانی سلطنت کو آپس میں اس طرح تقسیم کریں کہ انگلستان کریٹ اور مصر پر قبضہ کرلے اور قسطنطنیہ کو ایک آزاد بین الاقوامی شہر بنا دیا جائے اور ریاستہائے بلقان کو آزاد کر کے اُن پر روسی سیادت قایم

کردی جائے۔ لیکن انگلستان کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہتا تھا جس سے فرانس ناخوش ہو جائے اسی لیے اِس تجویز پر عمل نہ ہو سکا۔ مگر اِس تجویز کے ناکام ہونے کے بعد رُوس نے ترکی عیسائی رعایا کے حقوق کا سوال اٹھا کر پھر ایک دفعہ انگلستان پر دباؤ ڈالا۔ اور انگلستان کو رضامند نہ پاکر آخر اُس نے براہِ راست ۱۸۵۳ء میں ترکی کو الٹی میٹم دے دیا کہ رُوس کے تمام ہم مذہب جو ترکی میں آباد ہیں رُوس کی حفاظت میں دے دیے جائیں۔ انگریزی سفیر کے مشورہ سے ترکی نے رُوس کے اس مطالبہ کو نامنظور کر دیا اور اس طرح رُوس اور ترکی کے درمیان جنگ شروع ہوگئی۔ اس جنگ میں فرانس اور انگلستان اپنی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ترکی کے طرفدار بنے ۱۸۵۶ء میں رُوس کو مجبور ہو کر صلح کرنی پڑی۔ لیکن وہ ترکی کی عیسائی رعایا کو تنظیمات کے خلاف بھڑکاتا رہا۔ چنانچہ ۱۸۵۹ء میں ڈنیوب کی چند ریاستوں نے متحد ہو کر حکومتِ رومانیا قایم کرلی ۱۸۶۰ء میں لبنان میں بغاوت کرادی گئی۔ دول نے بظاہر تنظیمات کی تائید کی مگر بہ باطن اُن کی مخالفت کے نئے نئے طریقے پیدا کیے اور کسی نہ کسی بہانے سے معاملات میں مداخلت جاری رہی۔ لیکن خود ترکی میں اب ایک جماعت ایسی پیدا ہوگئی تھی جو تمام مشکلات اور خطرات کے مقابلہ میں ملک کے آئینی اصلاحات کے لیے جدو جہد کرنے پر کمربستہ تھی اور یہی آغاز تھا نوجوان ترکوں کی تحریک کا۔

۱۸۶۱ء میں جب سلطان عبدالعزیز تخت پر بیٹھے تو انھوں نے تنظیمات کی متعلق حکومتی تجاویز کی تجدید کی۔ لیکن رُوس نے اب "تحریک

اتحاد سلافی" کے نام سے ترکی کی عیسائی رعایا کو حکومت کے خلاف متحد کرنے کی ایک خطرناک کوشش شروع کردی تھی۔ چنانچہ مانٹی نیگرو اور سرویا میں بغاوت شروع ہوگئی۔ اور جزیرہ کریٹ بھی آزاد ہوگیا گو وہ محض برائے نام ترکی حکومت کے زیر سیادت رہا۔ اس عام بے چینی اور بدامنی کے زمانے میں مدحت پاشا کی اصلاحی تجاویز کا بہت چرچا ہونے لگا اور مرکزی حکومت بھی اُن کے زیر اثر تنظیمات کے دوبارہ نفاذ پر آمادہ ہوچکی تھی۔ اُسی زمانے میں عالی پاشا[1] اور فواد[2] پاشا جیسے مدبرین نے بھی اپنی کوششوں سے ملک کی داخلی اصلاحات کی رفتار کو بہت تیز کردیا تھا۔ لیکن یہ رفتار جس قدر تیز ہوتی تھی اُسی قدر یورپین دول اور خصوصاً روس کی بے چینی زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ اس لیے کہ وہ سب جانتے تھے کہ اگر ترکی کی تنظیم مکمل ہوگئی تو پھر اُن کی مداخلت کے امکانات باقی نہ رہیں گے اور یہ شکار پنجہ سے نکل جائے گا۔ چنانچہ اصلاحات کی بڑھتی ہوئی تحریک کو روکنے کے لیے پھر ایک دفعہ روس نے بلغاریہ میں بغاوت کرادی اور اس ہنگامہ میں پھر اصلاحات کا کام کچھ عرصہ کے لیے رُک گیا۔ اُسی زمانہ میں عالی پاشا اور فواد پاشا کا بھی انتقال ہوگیا اور مرکز پر ایسے لوگ حاوی ہوگئے جو روس کے زیر اثر تھے۔ چنانچہ سلطان کی مطلقیت کو پھر فروغ ہونے لگا۔ مگر سطح کے نیچے اصلاحات کی جو خفیہ تحریک قوی تر ہوتی جاتی تھی اور عالی پاشا کے زمانہ میں نوجوان عثمانیوں کے نام سے جو انجمن قایم ہوگئی تھی اُس

---

[1] دیکھو ضمیمہ [2] دیکھو ضمیمہ

نے یورپین دول کی ریشہ دوانیوں کا مقابلہ کرنا شروع کیا۔ مشہور ترکی شاعر نامق کمال[۱] نے اور ضیا پاشا نے پیرس میں بیٹھ کر پمفلٹ اور رسائل و اشتہارات شایع کرنے شروع کئے اور ترکوں کو ترغیب دینی شروع کی کہ وہ مکمل اصلاحات کا مطالبہ کریں۔ مدحت پاشا اِس جماعت کے ہمخیال تھے اور انھوں نے بعض دوسرے اراکین مجلس وزرا کو بھی اپنا ہمخیال بنالیا تھا۔ چنانچہ علما کا فتویٰ حاصل کرکے ۱۸۷۶ء میں سلطان عبدالعزیز کو معزول کر دیا گیا اور اُن کے بھائی مُراد پنجم تخت نشین کیے گئے۔ لیکن مُراد تین مہینہ کے بعد ہی پاگل ہو گئے اور اُن کی جگہ عبدالحمید دوم تخت نشین ہوئے۔

تخت نشینی سے پہلے عبدالحمید خاں نے مدحت پاشا سے اصلاحات کے متعلق بہت سے وعدے کیے تھے اور تخت نشینی کے بعد بھی ایک اُمید افزا فرمان شایع کیا گیا لیکن واقعہ یہ تھا کہ فطرتاً عبدالحمید اصلاحات کے نام سے گھبراتے تھے اور اُن کو کسی طرح گوارا نہ تھا کہ اُن کی مطلقیت میں کوئی کمی کی جائے۔ چنانچہ چند ہی ماہ کے بعد انھوں نے مدحت پاشا کو برطرف کرکے خارج البلد ہونے پر مجبور کر دیا۔ ۱۸۷۷ء میں پھر روس نے ٹرکی کے خلاف اعلانِ جنگ کیا اور ترکوں کو اناطولیا اور یورپین ترکی میں سخت شکستیں اُٹھانی پڑیں۔ عبدالحمید خاں نے جنگ شروع ہوتے ہی اُس پارلیمنٹ کو برخاست کر دیا جس کا انتخاب مدحت کی کوششوں سے ہوا تھا۔ ۱۸۷۸ء میں جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ رومانیا اور سرویا قطعاً آزاد ہو گئے اور بلغاریہ کو ترکی سلطنت کا ایک ٹکڑا دلوا دیا گیا۔

---

[۱] دیکھو ضمیمہ

قارص اردھان اور بایزید کے صوبے روس کے حوالہ ہوئے۔ اور چند ہی روز بعد ترکی کو انگلستان سے بھی معاہدہ کرنا پڑا جس کی رو سے قبرص انگریزوں کے حصہ میں آیا۔ عبدالحمید اپنی ہر شکست کے بعد اپنے اختیارات بڑھاتے چلے جاتے تھے۔ چنانچہ پارلیمنٹ اور وزرا کے تقریباً تمام اختیارات سلطان کے ہاتھ میں منتقل ہوگئے اور شاہی محل جاسوسی اور سازش کا واحد مرکز بن گیا۔ مدحت پاشا کو سمرنا کا گورنر بنا کر بلایا گیا۔ مگر اُن کے اس طرح بُلائے جانے کا اصلی سبب کچھ اور ہی تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ عبدالحمید خاں یہ نہ چاہتے تھے کہ نوجوان عثمانیوں کی یہ جماعت اُن کے قابو سے باہر رہ کر اصلاحات کا پروپگنڈا جاری کر سکے۔ چند ہی روز بعد پاشا پر سلطان عبدالعزیز کے قتل کا الزام لگا کر مقدمہ چلایا گیا اور بعد کو یورپین دول کے دباؤ سے مجبور ہو کر اُن کی سزائے موت کو نظر بندی سے بدل دیا گیا۔ چنانچہ مدحت طائف میں نظر بند کیے گئے اور وہیں کچھ عرصہ بعد مار ڈالے گئے۔ اب عبدالحمید علانیہ اصلاحات کی مخالفت پر اُتر آئے۔

۱۸۸۵ء میں مشرقی رومیلیا میں بغاوت ہوئی اور وہ صوبہ بالآخر روس کے قبضہ میں آگیا۔ اس عرصہ میں ارمنیوں نے بھی کئی دفعہ بغاوتیں کیں اور اُن پر ترکوں کے مظالم کی داستانیں بہت نمک مرچ لگا کر یورپ میں سنائی جانے لگیں۔ لیکن عبدالحمید نے اب اصلاحات کے تخیل کو ایک جرم قرار دیدیا اور اپنے خیال میں نوجوان عثمانیوں کی تحریک کو گویا ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ ملک کے اخبار اور

جرائد کی زبان بالکل بند کر دی گئی۔ اور محض جاسوسی کے ایک وسیع تنظیم کے بھروسہ پر حکومت کی جانے لگی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اصلاحات کی تحریک کا وہ عارضی التواجس کو عبدالحمید خاتمہ سمجھتے تھے خود اُن کی مطلقیت کے خاتمہ کا آغاز تھا۔ دولِ یورپ کے بڑھتے ہوئے دباؤ سے بچنے کے لیے عبدالحمید نے خلافت اسلامی کا ایک سیاسی تخیل دنیا کے سامنے پیش کیا اور اسی تخیل کی تقویت کے لیے وہ شیخ کو اپنا حامی بنانا چاہتے تھے تاکہ شیخ کے ذریعے سے دوسرے اسلامی ممالک میں خلافت کی تحریک کو قوی بنایا جاسکے۔ شیخ کی جانب اُن کا یہ التفات زیادہ تر ذاتی اغراض پر مبنی تھا۔

ترکی کے یہ حالات تھے جب ۱۸۹۲ء میں شیخ وہاں پہنچے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ عبدالحمید نے خلافت کی تحریک کو اپنی بساط سیاست کا ایک مہرہ بنایا ہے اور وہ عبدالحمید کے ارادوں اور خیالات سے ناآشنا نہ تھے۔ لیکن جس طرح عبدالحمید اُن کی ذات سے اپنے مقاصد پورے کرانا چاہتے تھے اسی طرح شیخ عبدالحمید کے نام اور وقار سے تحریک اتحادِ اسلام کو تقویت پہنچانے کی فکر میں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ باوجودیکہ وہ عبدالحمید کے متعلق اچھی رائے نہ رکھتے تھے مگر بالآخر ترکی جانے پر رضامند ہوگئے۔ یقیناً وہ جانتے تھے کہ اتحادِ اسلام کے متعلق اُن کے اور عبدالحمید کے ارادے اور خیالات مختلف ہیں۔ شیخ اسلامی دنیا کو یورپ کے دست و برد سے محفوظ رکھنے کے لیے اتحاد اسلامی کی ایک شہر پناہ تعمیر کرنا چاہتے تھے اُن کی تحریک دفاعی تھی مگر عبدالحمید محض اپنے تخت و تاج کو دول کے ہاتھ سے محفوظ رکھنے کے لیے

یہ سیاسی چال چلنا چاہتے تھے تاکہ وہ اپنے دشمنوں کو ڈرا دھمکا سکیں۔ اور بحیثیت خلیفہ کے دنیائے اسلام میں اپنا وقار قایم کرکے اپنی مطلقیت کو قوی کرلیں۔ شیخ کا تخیل وسیع اور عبدالحمید کی نظر تنگ تھی۔ ایک طرف تحفظ ناموس اسلام اور اتحاد مشرق کے ذریعہ یورپین دول کی جارحانہ پیش قدمی کا مقابلہ مدِ نظر تھا اور دوسری طرف تحفظِ تخت و تاج کی حفاظت۔ شیخ سمجھتے تھے کہ اسلامی ممالک کے تحفظ کا کوئی ذریعہ سوائے اتحادِ اسلامی کے نہیں اور عبدالحمید سمجھتے تھے کہ آلِ عثمان کے تخت پر اُن کی ذات خطرہ میں رہے گی جب تک کہ تمام اسلامی ممالک اُن کو خلیفۂ اسلام نہ مان لیں۔ شیخ چاہتے تھے کہ خلیفہ اور مرکزِ خلافت خواہ ترکی میں ہو یا ایران یا مصر یا عرب میں مگر اس مرکز پر تمام دنیا کے مسلمان متحد ہو جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کا تخیل اس قدر مذہبی نہ تھا جس قدر کہ سیاسی تھا۔ انھوں نے ہندوستان کے حالات کا مطالعہ کیا تھا، انھوں نے مصر میں خارجی اقتدار کی شدت دیکھی تھی، انھوں نے ایران کے ابتلا پر غور کیا تھا اور اس تمام عالمگیر مصیبت کا علاج اُن کے نزدیک صرف ایک ہی تھا۔ یعنی اتحاد اسلام۔ مگر عبدالحمید کو کو اگر ایران یا مصر یا کسی دوسری اسلامی سلطنت کے مصائب کا کچھ احساس تھا تو صرف اس لیے کہ وہ اُن مصائب کو اپنی ذات کے لیے خطرناک سمجھتے تھے۔ تخیل کا یہی اختلاف تھا جس کی وجہ سے زیادہ عرصہ تک شیخ اور عبدالحمید کے درمیان اتحاد خیال قایم نہ رہ سکا۔

مرزا لطف اللہ نے شیخ اور سلطان کے درمیان مسئلہ خلافت پر جو گفتگو ہوئی اُس کا ایک حصہ لفظاً نقل کیا ہے۔ لیکن حسب معمول

اپنے بیان کی کوئی سند پیش نہیں کی اور نہ یہ امر قرین قیاس ہے کہ وہ گفتگو لفظاً لفظاً لطف اللہ کے علم میں آئی ہو۔ اسی لیے اُس کا ان صفحات میں نقل کرنا ضروری نہیں۔ تاہم شیخ کی اس تجویز کے متعلق کہ تمام ممالک کے مسلمان نمایندوں کی ایک کانگریس منعقد کی جائے مرزا کا یہ مجمل بیان مبالغہ آمیز نہیں معلوم ہوتا کہ۔

"مقصود سید از تشکیل این کنگرہ (کانگریس) اسلامی این بود کہ وسائل ترقی و تکامل عمل اسلامیہ را مشترکاً فراہم نمودہ شوکت و عظمت اولیہ اسلام را تجدید نماید۔ و ہرگاہ کہ یکے از دول آرو پائی بے اعتدالی را نسبت بہ یک مملکت اسلامی روا داشت فوراً ان کنگرہ عالی اسلامی اعلان جہاد مقدس را بتمام مسلمین دنیا برعلیہ آن دولت صادر نمودہ گزشتہ از تحریم امتعہ و کالائے تجارتی آن دولت ہمہ مسلمین برلئے اطاعت از مبارزۂ قیام و شمشیر از نیام کشند۔"

پھر مرزا لطف اللہ ایک جلسہ کا ذکر کرتے ہیں جس میں منجملہ دوسرے اکابر کے حسب ذیل اصحاب بھی شریک تھے۔

"رضا پاشا شیعی۔ سید برھان الدین بلخی۔ ابوالحسن مرزا شیخ الرئیس عبدالکریم بک، نواب حسین ہندی۔ شیخ احمد روحی۔ مرزا آقا خاں کرمانی۔ مرزا خاں خبیرالملک۔ صمدی بک۔ جواہرزادہ اصفہانی، شیخ محمود افضل الملک روحی وغیرہ۔ اس جلسہ میں شیخ نے دوران تقریر میں فرمایا کہ۔

"امروز مذہب اسلام بمنزلہ یک کشتی است کہ ناخدائے آن محمد بن عبداللہ صلعم است و قاطبۂ مسلمین از خاص و عام کشتی نشینان این سفینۂ مقدسہ اند۔ و یومنا ہذا این کشتی در دریائے سیاست دنیا

دو چار طوفان و متصل به غرق گردید به آں جریانات پولیٹیکی دنیا و حوادثِ کہ در غرق و افنائے ایں کشتی رجہد کردہ و می کنند آیا سکنہ و راکبین ایں کشتی کہ مشرف بغرق و امادہ ہلاک آمد۔ آیا نخست باید در حـــراست و نجات ایں کشتی از طوفان و غرق آب کوشند یا در مقام دوئیت و اختلاف کلمہ و پیروی اغراض و نظریات شخصی برآمدہ خرابی و ہلاکی یک دیگر را ساعی باشند.......»

پھر مرزا بیان کرتے ہیں کہ ۵۰۰ خطوط عربی ہندی فارسی اور ترکی زبانوں میں ایران ہندوستان الجزائر مصر طرابلس شام حجاز اور تمام اسلامی ممالک کو بھیجے گئے اور شیخ نے یہ تجویز پیش کی کہ چھ ایسے اشخاص جو غیر زبانوں سے واقف ہوں ممالک اسلامی کا دورہ کریں۔ بہت سے خطوط کے جوابات وصول ہوئے اور شیخ نے ان کو سلطان کی خدمت میں پیش کیا۔ عبدالحمید بہت مسرور ہوا لیکن ناصرالدین کو جب اس خط و کتابت کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت متردد ہوا اور اُس نے اپنے سفیرِ متعینہ اسلامبول کو ہدایت کی کہ کسی طرح شیخ اور اُن کے شرکائے کار کو گرفتار کرکے ایران بھجوا دیا جائے۔ ایرانی سفیر محمود خاں علاالملک نے مدیر نظمیہ محمود پاشا سے ساز باز کرکے یہ طے کیا کہ اگر اُن لوگوں کو گرفتار کرا دیا جائے تو شاہ ایران وزیر مذکور کو اعزاز اور منصب سے سرفراز کرے گا اور اُن اشخاص کے بدلہ میں اُن تمام ارمنی باغیوں کو جو ترکی سے بھاگ کر ایران چلے گئے تھے گرفتار کرا کے حکومت ترکیہ کے حوالہ کر دے گا۔ چنانچہ مرزا آگے چل کر اس سازش کے نتائج کا اس طرح ذکر کرتا ہے کہ۔

"جب ایرانی سفیر نے وزیر نظمیہ سے سازش کرکے سلطان کا حکم اُن اشخاص کی گرفتاری کے لیے حاصل کرلیا اور وہ لوگ گرفتار کرکے ایران روانہ کردیے گئے تو شیخ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی۔ شیخ فوراً سلطان کے پاس گئے اور کہا کہ یہ لوگ وہ ہیں جو میرے ساتھ تحریک اتحادِ اسلامی میں کام کررہے ہیں۔ سلطان کو بہت افسوس ہوا کہ بے خبری میں وہ ایسا حکم دے بیٹھے اور اُس وقت کوشش کی گئی کہ قیدیوں کو واپس لیا جائے۔ لیکن سفیر ایران نے محل میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ اب اگر حکم منسوخ کرکے اُن لوگوں کو واپس لیا جائے گا تو حکومتِ ایران کی سخت توہین ہوگی اس لیے اس وقت قیدیوں کو واپس نہ لیا جائے مگر وعدہ کیا کہ چند روز بعد یہ لوگ ایران سے واپس بھیجدیئے جائیں گے۔ بہرحال وہ سب لوگ ایران پہنچے اور وہاں فوراً تبریز میں قتل کرڈالے گئے۔ شیخ کو اِس واقعہ کا بہت ہی صدمہ ہوا اور وہ سلطان سے بھی کبیدہ خاطر رہنے لگے۔ چنانچہ جب روحی کے بھائی نے پھر ایک دفعہ شیخ سے جاکر کہا کہ وہ روحی کی جان بچانے کی کوشش کریں اور ایک دفعہ سلطان سے کہیں تو شیخ نے کہا کہ۔

"اگر بفرض پسرا بہ قتل گاہ برند و از یک شفاعت من نجات یابد تن بہ کشتن می دہم اما عار تقاضائے از عبدالحمید را دیگر بر خود نمی بندم"

غالباً اسی واقعہ کے بعد سے سلطان اور شیخ کے درمیان ناچاقی شروع ہوئی اور پھر کبھی صفائی قلب پیدا نہ ہوسکی۔ ایک دوسرے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہِ ایران نے شیخ کو گرفتار کرانے کی بھی سخت کوشش کی تھی مگر اس پر سلطان کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ یہ امر بالکل



سلطان عبدالحمید

قرین قیاس ہی کہ ناصر الدین شاہ کے قتل نے عبدالحمید کو بھی بہت خائف کردیا تھا اور غالباً وہ سمجھتے تھے کہ یہ واقعہ شیخ کے اثرات کا ایک ثبوت ہی۔ اس لیے وہ ڈرتے بھی تھے مگر شیخ سے اپنے مقاصد بھی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ گرفتاری کے واقعہ کے بعد سے وہ مطمئن نہ تھے لیکن شیخ اور سلطان کے ظاہری تعلقات پھر بھی بہت خوشگوار تھے اور اُس کی بہت سی معتبر شہادتیں موجود ہیں۔ چنانچہ اس زمانہ کے حالات پر بلنٹ کے بیانات بہت کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔ انقلاب ایران میں براون نے بلنٹ کا ایک بیان درج کیا ہی۔

"میں نے قسطنطنیہ میں اُن کو سلطان کا خاص مقبول و منظور پایا وہ نشان طاش کے مسافر خانہ میں مقیم تھے جو یلدیز کی باغ کی دیوار سے ملا ہوا ہی جب میں پہلی دفعہ اُن سے ملا .... تو مجھے دیکھکر وہ بہت خوش ہوئے۔ جن کمروں میں وہ ٹھرے ہوئے تھے وہ بہت خوبصورت تھے اور ان کے گرد بہت سے علما اور فضلا بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ اُٹھے اور میرے دونوں رخساروں پر بوسہ دیا .... اور مجھے چائے اور کافی پلائی اور عربی اور فارسی زبان میں مجھ سے بہت سی باتیں کرتے رہے ...."

بلنٹ ۹۳-۱۸۹۲ء میں قسطنطنیہ گئے تھے اور اپنے روزنامچہ میں وہ جا بجا شیخ کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۵ ر اپریل ۱۸۹۲ء :- سلطان جوہر نے سلطان عبدالحمید خاں سے ملاقات کرنی چاہی۔ سلطان آمادہ نہ تھے مگر شیخ جمال الدین نے کوشش کی۔ جمال الدین خود بھی شاہی دعوت میں شریک تھے .... آج کل

یلدیز میں اُن کا بہت اثر ہی... اُنھوں نے محض اپنی صاف گوئی اور جرأت کی وجہ سے سلطان پر اپنا اثر جما لیا ہی۔ سلطان نے ہر قسم کے اعزاز انھیں دینے چاہے مگر انھوں نے ہمیشہ انکار کیا........"

۲۶ را پریل .... کمرہ ترکوں سے بھرا ہوا تھا ابراہیم موہلی بھی موجود تھے انھوں نے مجھ سے مصر کے متعلق گفتگو کی۔ میں نے شیخ سے کہا کہ وہ میری سلطان سے ملاقات کرائیں۔ میں سلطان سے جو ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہی کہ اگر برطانوی حکومت وولف کمیشن کی بنیاد پر پھر گفت و شنید کرنا چاہیے تو سلطان بھی آمادہ ہوں گے یا نہیں۔ مگر جمال الدین کی رائے ہی کہ پہلی ملاقات میں اِس حد تک گفتگو کا بڑھانا ناممکن ہوگا.........

یکم مئی .... ہم اب انگلستان جاتے ہیں مگر یہ طی ہوگیا ہی کہ جمال الدّین اس طرح کار روائی کریں کہ سلطان خود مجھے موسمِ گرما میں بلائیں اور شیخ میری بیوی کے لیے تمغۂ شفقت حاصل کریں گے۔ اور میں اِس عرصہ میں جمال الدین کو خطوط لکھوں گا جو وہ سلطان کو دکھاسکیں۔

اِس وقت تک شاہی دربار میں شیخ کا اقتدار اِس قدر زیادہ تھا کہ ایک دفعہ عید بیرام کے موقعہ پر شیخ کو دربار عام کے دروازہ پر کسی افسر نے روکا۔ شیخ بہت تند مزاج آدمی تھے اور اتنی سی بات کو بھی گوارا نہ کرسکتے تھے۔ اُن کو سخت غصّہ آیا اور کہنے لگے کہ بحیثیت عالم اور سیّد کے میرا درجہ کسی سے کم نہیں ہی اور یہ کہ کر دربار میں گھس گئے۔ سلطان نے اِس واقعہ کو دُور سے دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ شیخ کو بلا کر اپنی کرسی کے پیچھے جگہ دی۔ اُس

زمانہ میں شاہی دربار کے موقعہ پر التفاتِ شاہانہ کا ایسا مظاہرہ عجیب و غریب سمجھا جاتا تھا۔ شیخ کی تند مزاجی اور سلطان کی نوازش کے متعلق ایک واقعہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جب شاہِ ایران نے خاص طور پر سلطان سے شکایت کی کہ شیخ قسطنطنیہ میں بیٹھے ہوئے اس کی تخریب کے درپے رہتے ہیں تو سلطان نے شیخ سے کہا کہ "شاہِ ایران آپ سے بہت خائف ہیں اُن کو آپ معاف کیجیے" اور شیخ نے بہت سختی سے جواب دیا کہ ایسا نہیں ہوسکتا پھر جب سلطان نے بہت اصرار کیا تو بالآخر شیخ نے کہا کہ بہتر ہے میں خلیفۂ وقت کے حکم کی تعمیل کرنے کے لیے شاہ کو معاف کرتا ہوں۔ اس قسم کی ایک اور روایت میں نے ایک افغانی فاضل کی زبان سے سُنی۔ وہ واقعہ یوں ہے کہ اس زمانہ میں جب کہ بعض سیاسی مصالح کی بنا پر سلطان عبدالحمید خاں چاہتے تھے کہ شیخ اُن کے اشاروں پر کام کریں انھوں نے شیخ کو خوش کرنے کے لیے اُن کی خدمت میں وہ شاہی تمغہ بھیجا جو سوائے وزرا کے کسی کو عنایت نہ ہوتا تھا۔ جس وقت یہ تمغہ لے کر شاہی قاصد شیخ کی صحبت میں حاضر ہوا تو وہ طلبا کو درس دے رہے تھے اور اُن کے پاس ایک بلّی بیٹھی ہوئی تھی۔ شیخ نے تمغہ کو اُس کے غلاف سے نکال کر دیکھا اور بلّی کے گلے میں ڈال دیا۔ شاہی قاصد کو شیخ کی یہ حرکت بہت ناگوار ہوئی اور اُس نے کہا کہ حضرت! آپ عطائے شاہی کی توہین کر رہے ہیں۔ راوی کہتا ہے کہ شیخ یہ سن کر مسکرائے اور کہنے لگے کہ جن لوگوں کے گلے میں یہ تمغے ڈالے جاتے ہیں وہ عموماً خاین ہوا کرتے ہیں اسی لیے میں نے بلّی کو اس اعزاز کا زیادہ

اہل سمجھا ہے! اس قسم کی بہت سی روایتیں مشہور ہیں جو بظاہر مبالغہ سے پاک نہیں تاہم اس میں شک نہیں کہ باوجود شیخ کی تنک مزاجی کے عرصہ تک سلطان کی نظر میں اُن کا وقار بہت زیادہ رہا اور یہی وجہ تھی کہ سلطان کے مصاحبین میں سے اکثر اُن سے حسد کرنے اور اُن کو زک پہنچانے کی فکر میں رہنے لگے۔

شاہِ ایران کے قتل سے چند روز پہلے شیخ کے خلاف دربار میں ایک قوی جماعت تیار ہوگئی تھی۔جو اِس فکر میں رہتی تھی کہ کوئی موقعہ ملے تو شیخ سے سلطان کو بدگمان کر دیں۔ چنانچہ ایک موقعہ اس کو مل گیا۔اُسی زمانہ میں خدیو مصر قسطنطنیہ آئے ہوئے تھے سلطان سے کہا گیا کہ شیخ خدیو سے خفیہ طور پر ملاقاتیں کر رہے ہیں اور مشورہ یہ ہو رہا ہے کہ خدیو کو خلیفہ بنایا جائے۔اِس خبر کا سلطان پر بہت بُرا اثر ہوُا اور وہ شیخ سے بدظن ہوگئے اِس واقعہ کے متعلق کئی بیانات ہمارے سامنے ہیں اول تو ایک جرمنؔ سیاح کا بیان ہے جس نے شیخ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ۔

شیخ نے مجھ سے کہا کہ نوجوان خدیو مصر عباس پاشا پہلی دفعہ قسطنطنیہ آئے ہوئے تھے وہ مجھسے ملنا چاہتے تھے مگر سلطان کا منشاً نہ تھا۔لیکن خدا جانے کس نے خدیو سے کہہ دیا کہ میں ہر شام کو کاغذ خانہ پر ٹہلنے جاتا ہوں۔ خدیو ایک دِن وہاں اس طرح پہنچ گئے کہ گویا اتفاقاً آگئے ہیں۔ میری طرف آئے اپنا مجھ سے تعارف کرایا اور کوئی پندرہ منٹ تک مجھ سے باتیں کرتے رہے۔اِس کی خبر

Enaycl opadea of Islam ۔ ۵ے

سلطان کو ہوئی اور اُن کو بتایا گیا کہ ملاقات اتفاقیہ نہ تھی بلکہ پہلے سے اس کا انتظام کیا گیا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ دورانِ گفتگو میں نے خدیو سے کہا کہ وہی سچے خلیفہ ہو سکتے ہیں۔ مگر اس وقت تک سلطان اس قسم کی سازشوں سے متاثر نہ ہوا کرتے تھے"

اس بیان کی تصدیق ایک دوسرے بیان سے بھی ہوتی ہے۔

"سید صاحب کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ مصر کے مشہور ادیب عبداللہ ندیم کی صحبت میں وہ کاغذ خانہ کے پارک میں تفریح کر رہے تھے۔ وہاں اتفاقاً عباس حلمی پاشا خدیو مصر سے اُن کی ملاقات ہو گئی۔ تینوں نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر پندرہ منٹ باتیں کیں۔ کہا جاتا ہے کہ ابو الہدیٰ نے سلطان تک یہ خبر پہنچائی کہ عبداللہ ندیم اور شیخ نے کاغذ خانہ کے پارک میں خدیو سے ملنے کا انتظام کیا اور دونوں نے قول و قرار کئے" ؎

عبدالحمید جیسے شکی اور وہمی مزاج والے آدمی کو بھڑکانے کے لیے یہ خبر کچھ کم نہ تھی چنانچہ چند روز تک شیخ پر پولیس کی نگرانی رہنے لگی۔ لیکن بعد میں پھر معاملات صاف ہو گئے۔ البتہ سلطان کی اس بدگمانی نے شیخ کو بہت بدل کر دیا اور یہ دیکھ کر کہ تحریک خلافت کی آڑ میں عبدالحمید محض اپنے ذاتی مقاصد حاصل کرنے کی فکر کر رہا ہے شیخ اور بھی زیادہ آزردہ خاطر ہو گئے۔ اسی زمانہ میں نوجوان ترکوں کی طرف سے مشروطہ کا مطالبہ پھر شروع ہو گیا۔ اور دارالخلافہ میں ۴۰ ہزار خفیہ پولیس محض "سیاسی" اشخاص کی نگرانی کے لیے

؎ جمال الدین افغانی۔ از سعید پاررس۔

مقرر کر دی گئی۔ اسی کے ساتھ ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ۔

"سید عبداللہ خادم مدینہ منورہ بہت غیر معمولی طور پر ذی حمیت تھے اور اُن سے ایک دفعہ ولی عہد عثمانیہ سے جھگڑا ہو گیا۔ وہ جھگڑے کے بعد جمال الدین کے پاس چلے آئے جب گرفتاری کے لیے اُن کی تلاش شروع ہوئی تو شیخ نے اُن کو حوالہ کرنے سے انکار کر دیا۔ بلکہ جس وقت خدیو مصر قسطنطنیہ سے جانے لگے تو اُن کے سپرد کر دیا اور وہ سید عبداللہ کو اپنے ساتھ قاہرہ لے گئے"۔ ؎۵

اس واقعہ نے شیخ کے مخالفین کو سلطان کو بھڑکا دینے کا ایک اور موقعہ دیا۔ حالات کو دیکھ کر شیخ نے بھی پھر لندن جانے کی اجازت چاہی لیکن سلطان جانتے تھے کہ جس طرح ایران سے نکل کر شیخ نے لندن میں شاہ ایران کے خلاف ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا اِسی طرح وہ ترکی کے متعلق بھی اپنے قلم اور زبان سے کام لیں گے اور پھر معاملات سنبھالے نہ سنبھل سکیں گے۔ اس لیے ترکی میں شیخ معزز مہمان کی طرح بلائے گئے اور خطرناک قیدی کی طرح بند کر لیے گئے۔ اُن کا سب سے بڑا مخالف سلطان کا سب سے بڑا پیر اور ندیم اور مصاحب ابوالہدیٰ تھا۔ اس شخص کے متعلق شیخ کے جذبات بھی بہت قوی تھے اور بقول سعید پاراس۔

"سلطان عبدالحمید کے پیر شیخ ابوالہدیٰ سے سید کو اول ہی دن سے نفرت تھی وہ ہمیشہ اُس کو شیطان کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک دن سلطان کے سامنے بھی اُس کو اسی نام سے

؎۵ مرزا لطف اللہ خاں

یاد کیا۔ سلطان نے کئی دفعہ کوشش کی کہ شیخ ان کے پیر سے صلح کرلیں لیکن اُنھوں نے ہمیشہ سختی کے ساتھ انکار کیا۔ ایک دن سلطان نے اپنے اے۔ڈی۔سی منیر پاشا کو شیخ کے پاس بھیجا اور حکم دیا کہ شیخ سے کہو کہ ابوالہدیٰ سے صلح کرلیں اس لیے کہ دونوں کی شکر رنجی ہمارے لیے تکلیف دہ ہے۔ سید صاحب یہ سُن کر بہت برہم ہوئے اور فرمایا کہ جاکر کہ دو کہ اگر جبریل آکر میرا دروازہ کھٹکھٹائیں اور جب میں دروازہ کھولوں تو اپنے پر میرے سر پر ہلائیں اور کہیں کہ رب السماوات نے مجھے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ جمال الدین ابوالہدیٰ سے صلح کرلے تو بھی میں یہی کہوں گا کہ میں اس شیطان سے صلح نہیں کر سکتا۔ پھر بتاؤ تمھارے سلطان کی کیا بساط ہے....."

شیخ کی تند مزاجی اور تیز گفتاری ہمیشہ اُن کی مشکلات میں اضافہ کرتی رہتی تھی۔ اور اُن کے دشمنوں کو اُن کے خلاف لوگوں کو بدگمان کرنے کے بہت اچھے موقع مل جاتے تھے۔ اُسی زمانہ میں بقول سعید پاراس ابوالہدیٰ نے شیخ کے خلاف ایک رسالہ شایع کیا۔

"جس میں اُس نے سید فضل علوی شیخ طاقر مدنی طرابلسی۔ شیخ طریقت شاذلی اور سید جمال الدین افغانی پر حملے کیے تھے۔ .... اس منشور میں سید صاحب پر الحاد و فساد اعتقادات کی تہمت لگائی گئی تھی۔ سید صاحب نے ایک دفعہ مجھ سے فرمایا تھا "کہ بندر لو کے درختوں کے اطراف میں مَیں اس طرح چکر لگاتا ہوں جس طرح حاجی لوگ کعبہ کا طواف کرتے ہیں۔

یہ جگہ ایک تفریح گاہ ہے جہاں پانی کے بند بندھے ہوئے ہیں۔ اور باغات ہیں۔ جمال الدین کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے ایک خیال کو شاعرانہ انداز میں ظاہر کیا مگر اسی طرح کی شاعرانہ گفتگو کو ابوالہدیٰ نے الحاد اور کفر سے تعبیر کیا......"

شیخ کے خلاف اِس قسم کے تمام اسباب جمع ہوتے رہے اور ناصرالدین شاہ کے قتل نے عبدالحمید کے رہے سہے حواس گم کر دئے۔ غالباً سلطان کو یہ محسوس ہوا کہ اگر جمال الدین کا ذاتی وقار اِس قدر زیادہ ہے کہ اُن کے معتقدین بادشاہوں پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت کر سکتے ہیں تو پھر اُن کا وجود بلاشبہ خطرناک ہے۔ یہ بات ہزار ہا تہمتوں اور سازشوں سے زیادہ موثر تھی۔ اور اُسی وقت سے شیخ قسطنطنیہ میں شاہی مہمان کے بجائے شاہی قیدی بنا دیے گئے۔ وہ پولیس اور جاسوسوں کی سخت نگرانی کے ماتحت زندگی بسر کرنے لگے۔ چنانچہ بلنٹ جب اُن سے آخری دفعہ قسطنطنیہ میں ملے تو انھوں نے شیخ کو بہت افسردہ خاطر پایا۔

"پھر جب میں دوبارہ قسطنطنیہ گیا تو اُن سے ملا اُنھوں نے یلدیز کی عجیب دنیا میں اپنی پوزیشن مجھے بتائی۔ جہاں وہ آدھے مہمان اور آدھے قیدی کی طرح رہتے تھے۔ وہ اُس وقت اس حالت میں بھی خوش تھے۔ اُن کے لبوں پر تو مُہر نہ تھی وہ ہمیشہ بہت صاف صاف باتیں کیا کرتے تھے۔ اور یہ اُن کی عادت تھی...... [ے]

نگرانی اور قید کے شدائد آخر زمانہ میں اور بھی زیادہ ہو گئے تھے

ے "انقلاب ایران" براؤن

لیکن شیخ کی زبان اُس وقت بھی بے تکان چلتی تھی۔ جو جی میں آتا تھا کہتے تھے اور سلطانی جاسوس اُن کی تمام گفتگو سلطان تک روزانہ پہنچاتے تھے جس کو سن سن کر سلطان اور زیادہ خوف زدہ ہوتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ شیخ کے آخری عمر کے اِن مصایب کا بڑا باعث شیخ کی تنک مزاجی اور صاف گوئی تھی۔ اِس زمانہ کی حالت شیخ کے شاگرد برہان الدین جو اکثر نظر بندی کی حالت میں بھی حاضر رہتے تھے اس طرح بیان کرتے ہیں: کہ

"چون در اسلامبول اوا زش ملتِ احرار کہ ازظلم و استبداد او (سلطان) می نالیدند شنیدند بالطبع بہ ہیجان آمدند۔ بنا رعلیہ نظر بہ ضرب المثل مشہور کہ" "راست گو را در شہر نمی گزارند" از طرف مامورین خفیہ سلطان عبدالحمید خاں زیر سانسور و سنسرہا و تعقیدات گرفتہ شدند تا ایں کہ بہ علامہ مشہور افغان در اقامت گاہِ شان نشان طاش تماماً زیر تعقیدات گرفتہ شدند۔ فقط من با وجود ہر قسم ممانعت و مشکلات و تعقیدات حکومت ہر وقت بحضور شان مشرف گردیدہ و عرض تسلیت می نمودم" ؎

مرض الموت وفات وتدفین نظر بندی اور پریشانی کی اس حالت میں شیخ مرض سرطان میں مبتلا ہوئے ڈاکٹر جمیل پاشا اُن کے معالج تھے۔ اوّل شیخ کے چھ دانت نکال دیئے گئے اُس کے بعد مرض پھر زور پکڑ جاتا تھا۔ اس حالت میں شیخ نے علاج کی غرض سے

؎ در جریدہ "ملتسر" ترکی۔ ؎ جمیل پاشا بعد کو خلیفہ عبدالحمید کے اسسٹنٹ سکرٹری ہوگئے تھے او چھ سال ہوئے فرانس میں بمقام نیس مقیم تھے جہاں میں اُن سے شیخ کی بیماری کے حالات معلوم کرنے کے لیے ملا تھا۔

دینا جانے کی اجازت طلب کی مگر سلطان نے اجازت نہیں دی۔ آخر چند روز مرض کی تکلیفیں برداشت کرکے ۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو انتقال فرمایا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔ شیخ کی عمر سن عیسوی کے حساب سے ۵۸ سال اور سن ہجری کے حساب سے ۶۰ سال ہوئی۔

"مشاہیر الشرق" کے صفحہ ۵۹ پر شیخ کی ایک تصویر شایع ہوئی ہی جس میں وہ بحالتِ مرض بستر پر بیٹھے ہوئے ہیں گود میں ایک کتاب رکھی ہی ہاتھ میں تسبیح ہی سامنے New York herald کا ایک پرچہ پڑا ہوا ہی اور بستر کے پاس ایک میز پر ہاتھی کا ایک مجسمہ رکھا ہوا ہی۔ آخری وقت بھی اُن کے گرد و پیش جو چیز تھی وہ اُن کی گزری ہوئی زندگی کا ایک عکس تھی۔

قبرستان شیوخ (شیخ لرمزاراتی) محلہ ماچقا میں دفن کیے گئے جنازہ ایک بیان کے مطابق بہت تزک و احتشام کے ساتھ اور ایک بیان کے مطابق بہت خاموشی سے صرف چند اشخاص کے کندھوں پر اٹھایا گیا۔ اور اس طرح وہ اپنی آخری منزل پر سپردِ خاک کردیے گئے۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

عبدالحمید کے انتقام پسند اور ضدی طبیعت کو دیکھتے ہوئے اُسی زمانہ میں یہ خبر اُڑی تھی کہ شیخ کو زہر دلوایا گیا۔ بعض ایرانی سوانح نگار تو صاف صاف کہتے ہیں کہ ایسا ہوا۔ لیکن ترک اِس سے انکار کرتے ہیں اور جمیل پاشا نے مجھ سے کہا کہ یہ خبر محض بدگمانی پر مبنی ہی۔ حسن صابری شیخ کے ایک مرید خاص کہتے ہیں کہ زہر دیا گیا۔ مرزا لطف اللہ کا بھی یہی خیال ہی۔ بلنٹ تو بالکل



آخری آرام‌گاه

صاف صاف کہتے ہیں کہ

"میں اِس امر پر یقین کرنے پر آمادہ ہوں کہ ان کی مہلک بیماری زہر کا نتیجہ تھی۔ اُن کے دشمن بہت تھے اور اُن کا وجود عبدالحمید کے لیے عذابِ جان ہوگیا تھا۔"

مرزا لطف اللہ بھی یقین کے ساتھ اس واقعہ کے تفصیلات بیان کرتے ہیں۔

"مسموم نمودنِ آن سید بزرگوار ہم صحیح است ......

ناصر الملک برائے قتل و جلب آن سید و حکیم وحید منتخب و مامور شد۔ ازین کہ دولتِ ترکیہ سید را تسلیم نمود و سفیر ایران و مامور مخصوص کہ از ایران برائے ایں کار رفتہ بود ہمراہ و متفق می شوند و در سال ۱۳۱۴ھ ہجری قمری آن سید مظلوم معصوم غریب وحید را مانند اجدادِ کبارش بہ شربت ناگوار سم قتیل شہید نمودند۔"

مگر لطف اللہ قتل کی ذمہ داری سلطان کے بجائے حکومتِ ایران پر رکھتے ہیں۔

آقا مرزا حسین دانش کا خیال ہے کہ اپریشن کے بعد زہر پیدا ہوگیا ......

"سید گرفتار سرطانے در دھان شد و در انجام قطع آن سرطان از طرف والیان ترک واگذاشت میگویند کہ سید در ہنگام مرض اذن رفتن بہ اروپا برائے مداورت از سلطان طلبید وے نتوانست گرفت برخے نیز می گویند کہ در ہنگام اجرائے عمل جراحی در دھنِ مسموم

گردید و نیز گویند کہ در دمِ واپسیں جز یک خادم صادق نصرانی کسے در پیش نبود و در آغوش او جاں بجاں بخش داد و در بشک طاش در حظیرہ "یحیٰی افندی درگاہی" بخاک سپردہ شد رحمتہ اللہ علیہ و غفرانہ"

پروفیسر براون نے بھی اس مسئلہ پر بحث کی ہے مگر اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کی صرف "العلم عند اللہ" کہہ کر خاموش ہو گئے۔

اگر ہم عبدالحمید کے سیاسی رویہ کو پیش نظر رکھیں اور یہ بھی یاد رکھیں کہ اس کے عہد میں مدحت پاشا کی طرح کتنے نامور اشخاص سیاسی اختلاف کی بنا پر قتل ہوئے تو شیخ کے قتل میں بھی شبہ کی گنجایش کم رہ جاتی ہے۔ ابو سعید العربی نے بھی اخبار جہانِ اسلام میں صاف صاف لکھا تھا کہ۔

"سلطان سید کی آزاد خیالی سے خوف زدہ ہو گیا تھا اور اُن کی بیماری کی وجہ سے گھبراتا تھا۔ سید کو خلال کرنے کی بہت عادت تھی سلطان نے بہت سے خلال بھیجے۔ جن میں زہر لگا ہوا تھا شیخ ان خلالوں کو استعمال کرنے کے بعد بیمار ہو گئے۔ نیچے کا جبڑا سڑ گیا اور اسی مرض میں انتقال ہوا لیکن مشہور یہ کیا گیا کہ سرطان ہو گیا۔"

سید علی خاں نے اخبار وطن قسطنطنیہ میں اس خبر کے ہر پہلو پر بحث کر کے اپنا خیال صرف اتنا ہی ظاہر کیا ہے کہ

"در بارہ مسموم کردن او دلایل قطعی نیست۔"

اس قسم کے کسی معاملہ میں جن کا تعلق ایک سلطنت اور بادشاہ کی پالیسی سے ہو" دلایل قطعی" کا حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہی۔ قراین عبدالحمید خاں کے خلاف ہیں لیکن ایک وقایع نگار پروفیسر براون کی طرح سوائے اس کے کچھ نہیں کہ سکتا کہ "العلم عند اللہ" شیخ کے انتقال کے بعد ہی اُن کے سیکرٹیری جارجی بے کو گرفتار کرلیا گیا اور شیخ کے تمام کاغذات بحقِ حکومت ضبط ہوگئے۔ کہا جاتا ہی کہ شیخ کے انتقال سے چند روز پیشتر کسی روسی وزیر نے بھی شیخ کے بعض اہم سیاسی خطوط عبدالحمید کے حوالہ کردئے تھے۔ جارجی بے تو بعد میں رہا کردیئے گئے لیکن شیخ کے کاغذات ہمیشہ کے لیے ناپید ہوگئے۔ آج اُن کاغذات میں سے چند بھی ہمارے ہاتھ آتے تو معلوم نہیں اس سوانح عمری کی تاریخی حیثیت کس قدر اہم ہو جاتی۔

شیخ کی قبر عرصہ تک بے نام ونشان رہی لیکن ۱۹۱۹ء یا ۱۹۲۰ء میں ایک امریکن نے اُس کو پختہ کرادیا شیخ کے شاگرد محمد برہان الدین بلخی نے اس واقعہ کو جریدہ ملت ترکی میں بیان کیا ہی۔

"تخمیناً یک ونیم سال پیش ایں محب تورک مسٹر چارلیس کرین امریکائی کہ از سیاحت وتتبعات علمیہ خود از حوالی ترکستان بلخ مزار شریف جار جوی وسمرقند فراغت یافتہ بہ اسلامبول آمد بامشارٌالیہ اشنا شدم۔ روزے یکے دوستانم مدیر سابق "سیر وسفین" عمومی حسین بک آمدہ بمن گفت کہ ایں مستشرق امریکائی می خواہد کہ باشما

ملاقات کند بنا بران با حسین بک برائے ملاقات او بہ ہوتل "پارلا پالاس" رفتم در اثنائے ملاقات راجع بہ علم دفن حضرت اُستادم سید جمال الدین افغانی بحث کردہ درضمنِ ملاقات از من خواہش کرد کہ مدفنِ حضرتِ اُستادم بہ او نشان بدہم درعین آن روز بعد از فراغ ملاقات برابر بہ مزارستانِ شیوخِ اسلامیہ بمحلہ ماچقارفتہ قبر الیشان را برائے مسٹر چارلس کرین امریکائی نشان دادم مشارٌ الیہ بمن گفت کہ قبر این عالم بزرگ اسلام را خود من تعمیر خواہم کرد۔ چندے بار مدیر خلیل بک بمن گفت کہ قبر حضرت استاد را مسٹر کرین امریکائی بہ اصول درستی انشاد تعمیر کردہ است۔ ...."

اسی زمانہ میں ایک قوم پرست ترک نے ترکی اخبارات میں شیخ کی قبر کے متعلق ایک مضمون لکھا تھا اُس کے چند الفاظ اس لیے نقل کیئے جاتے ہیں کہ اُن سے شیخ کے متعلق ترکوں کی نئی نسل کے احساسات کا اندازہ ہوتا ہی۔

"اس بڑے مسلمان عالم کے لیے امریکن مسٹر کرین نے نہایت شاندار سنگِ مرمر کا مزار بنایا ہی۔ یہ امریکن کروڑپتی ہمیشہ مسلمان دوست اور محبِ ترک رہا ہی۔ مگر اُس کی تازہ ترین قدرشناسی نے نہ معلوم کیوں میرے دل میں حسرت اور افسوس سے ملا ہوا ایک جذبہ پیدا کیا۔ جمال الدین کا ایک محتشم و شاندار مزار بنایا جانا درحقیقت ایک ایسا کام ہی جس سے رُوح تسلی پاتی ہی۔ جمال الدین اپنی تمام زندگی میں دنیوی جاہ جلال سے بے پروا رہا اور اپنی وضع کے

شایان اُسی کو سمجھا کہ اپنی قبر کے لیے دو گز سے زیادہ زمین نہ لے۔ اُس میں فراعنۂ مصر کا غرور نہ تھا کہ اپنی لاش کی حفاظت کے لیے اہرام بنوائے۔ اِس لحاظ سے ایک محتشم مزار کا بنایا جانا اُن کے مراتب میں کوئی اضافہ نہیں کرتا۔ مگر انصاف شرط ہی۔ کیا اُس کی یاد کی حرمت کے لیے اس قدر اہتمام بھی اُس کے مداحین پر لازم نہ تھا۔ ....

لیکن ایک بات پر غور کیجئے جمال الدین افغانی اور ایک امریکن میں کس قدر فاصلہ ہی۔ دین کا فاصلہ۔ زبان کا فاصلہ جیات کا فاصلہ۔ محیط دماحول اور اُن کے بے پایان تاثرات کا فاصلہ۔ اُن میں سے ہر ایک ایک لمبی منزل ہی جو مسٹر کرین کو جمال الدین سے دُور رکھتی مگر مسٹر کرین نے اِن سب مسافتوں کو طی کیا اور جس محترم کو ہم سب بھول گئے تھے اُس کا مزار بنایا........

میں اس خیال سے تو خوش ہوں کہ جمال الدین کا مزار اس کی مادی یادگار ہوگا مگر میرے قلب کے ایک گہرے اور مغرور گوشہ میں ایک خفیف سی ٹھیس لگی ہی اور میرا دل سوال کرتا ہی کہ جمال الدین کے مزار کو ایک ترک یا ایک افغان یا ایک ایرانی نے (جس کو جمال الدین کے ایرانی ہونے پر بہت اصرار رہتا ہی) کیوں نہ تعمیر کرایا......"

شیخ کی زندگی کی داستان پیدایش سے قبر اور طلوع سے غروب تک ختم ہوتی ہی دنیا کا حافظہ بہت کمزور ہی۔ وہ بہت جلد بھول جاتی ہی۔ پیغمبروں کو بھول جاتی ہی۔ بڑے بڑے سربلند بادشاہوں کو بھول جاتی ہی۔ جمال الدین کو اگر بھول گئی تو تعجب کیا ہی۔ اب

اُن کی خاک پر سنگِ مرمر کا جو خول چڑھایا گیا ہی تو کیا یہ مرمریں غلاف اُن کی اُن یادگاروں اور اُن کی زندگی کے اُن نقوش کے مقابلہ میں جو تاریخ عالم کے صفحات پر ثبت ہیں اہلِ نظر کے لیے کچھ زیادہ اہمیت رکھ سکتا ہی؟

اپنی نظر بندی کے زمانہ میں شیخ نے اپنے ایک ایرانی دوست کو ایک خط لکھا تھا جو غالباً اُن کا آخری خط تھا۔ یہ خط اُن کے نفس کی کیفیات اور اُن کے بلند ارادوں اور اُن کے اسلامی جذبات و افکار کا ایک مجلّا آئینہ ہی۔ اِس خط میں جو اُن کے افکار عالیہ کا آخری مظاہرہ ہی اُن کے الفاظ ایک آخری وصیت کا وزن رکھتے ہیں۔

"بر سر این موقع نامہ را بہ دوست عزیز خود می نویسم کہ در محبس محبوس و از ملاقات دوستانِ خود محروم۔ نہ انتظار نجات دارم نہ امیدِ حیات یسیم، نہ از گرفتاری حیران و کشتہ شدن متوحش۔ خوشم بہ حبس و خوشم برایں کشتہ شدن محبوسم برائے آزادی نوع، کشتہ می شوم برائے زندگی قوم، ولے افسوس می خورم ازیں کہ آرزوے کہ داشتم کاملا نایل نہ گردیدم و شمشیر شقاوت نہ گذاشت کہ بیداری عمل مشرق را ببینم۔ دستِ جہالت فرصت نہ داد کہ صدائے آزادی از حلقوم مشرق بشنوم۔ اے کاش من تمام تخمِ افکارِ خود در مزرعہ مستعد افکارِ ملت کاشتہ بودم چہ خوش بود کہ تخم ہائے بارور خود در زمین شمورہ زار سلطنت فاسد نمی نمودم۔ انچہ در آں مزرعہ کاشتم بہ نموّ نہ رسید و ہر چہ دریں زمین کویر غرس نمودم فاسد گردید۔ دریں مدت ہیچ یک از تکالیف خیرِ خواہانہ من بگوش

سلاطین مشرق فرد نہ رفت ، ہمہ را شہوت و جہالت مانع از قبول گشت ۔ امید داری ہا بہ ایرانم بو دند ۔ اجر ز حماتم را بفتراش غضب حوالہ کردند بہ ہزاران وعدہ وعید بہ ترکیہ احضارم کردند ایں نوع مفعول و مقہورم نمو دند غافل ازیں کہ انہدام نیت نمی شود صنعہ روزگار صرف حق را ضبط می کند بارے من ازیں دوست گرامی خود خواہشمندم، ایں آخریں نامہ را بنظر دوستانِ عزیز ہم مسلکہائے ایرانی من بہ رسانید و زبانی بہ آن ہا بگو ئید کہ شما میوۂ رسیدہ ایران ہستید ۔ برائے بیداری ایران دامن ہمت بہ کمر زدہ آئید ۔ از حبس وقتال نہ ترسید ۔ از جہالت ایران خستہ نہ شوید از حرکات مذبوحانہ سلاطین متوحش نہ گردید ۔ با نہایت سرعت بکوشید ، بکمال چالاکی کوشش کُنید ۔ طبعیت بہ شما یار است وطبیعت مددگار سیل تجدد بہ سرعت بہ طرف مشرق جاری است بنیاد حکومت مطلقہ منہدم شدنی است ، شما ہا می توانید در خرابی حکومت مطلقہ بکوشید ....

موانع راکہ میان الفت شما و سایر عمل واقع شدہ رفع نماید.....''

اس خط کے اختصار و اجمال میں شیخ نے اپنی زندگی کے فلسفہ کی پوری تشریح و توضیح کر دی ہے ۔ یہ اُن کی آخری وصیت، آخری پیام ، آخری آواز ، اہلِ نظر کے دلوں میں آج بھی .... چالیس برس بعد .... گونج رہی ہے ۔ سُننے والے اُس کو سُن رہے ہیں اور " سیل تجدید " کے ساتھ بڑھنے والے بڑھے چلے جا رہے ہیں ۔ شمع گل ہو چکی مگر اُس کا نور باقی ہے ۔ سبب

ہنگامہ محفل محوِ خواب ابد ہے مگر وہ محفل قایم ہے۔

" انعدام صاحب نیت اسباب انعدام نیت نمی شود "

یہی وہ یقین محکم تھا جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر اور سمندر کی موجوں میں جمال الدین کو سرفرازنہ لے گیا۔

جسد فانی فنا ہو چکا مگر اس کی روح زندہ ہے۔

اقوال

(۱) "لاصداقتہ الا باتحاد المشرب ولاقرابتہ الالوحدت المارب"[۱]

(۲) "من در جوانی شعرمی سرودم ولیکن در بزرگی بہ ترکش گفتم"[۲]

(۳) "الدنیا لعب ہر کہ بردبرد وہر کہ باخت باخت"[۳]

(۴) "انعدام صاحب نیت اسباب انعدام نیت نمی شود"[۴]

(۵) "دو نوع فلسفہ در دنیا ہست یکے آنکہ ہیچ چیز در دنیا مال ما نیست وقناعت بہ یک لقمہ باید کرد و دیگر آن کہ ہمہ چیز ہا خوب و مرغوب دنیا مال ماست و باید مال ما باشد۔ ایں دو یمی خوب است۔ ایں دو یمی را باید شعار خود ساخت نہ اولیٰ را کہ بالشریت نمی ورزد"[۵]

۱؎ از مکتوب شیخ بنام آقائے طباطبائی۔ ۲؎ روایت از مرزا لطف اللہ: سید جمال الدین در افکار و اطوار چناں تند و صلابت بود کہ طبع جوال و آتشینش بیشتر مایل بہ مطالب حقیقی سیاسی و مجادلات علمی شفاہی یا قلمی بود و چنداں با موضوعات باریک ادبی سازش نداشت۔ و شاعری را کمتر از پایۂ خود انگاشت و اغلب می گفت من در جوانی شعرمی سرودم ولیکن در بزرگی بہ ترکش گفتم"۔ ۳؎ روایت از مرزا لطف اللہ

۴؎ از مکتوب شیخ بہ یکے از دوستان خود مندرجہ باب آخر۔

۵؎ روایت از آقا مرزا خاں دانش۔

(۶) "جوانان را ادب زیب و زیور کمال است معہذا نہ باید بدین اکتفا نمود۔ چنان قناعت بعدی از درجات کمال باوصف این کہ او را حد و پایانے نیست از دون ہمتی و پست فطرتی است"۔ [۶]

(۷) "میں کتابیں لکھتا نہیں۔ میں زندہ کتابیں تصنیف کر رہا ہوں"۔ [۷]

(۸) اگر کوئی شخص اپنے حق میں نیکی کرنا چاہتا ہے تو یہ مشکل ہے لیکن اگر وہ اپنے ملک کی خدمت کرنا چاہتا ہے تو اس کو اپنی ذاتی خواہشات قربان کرنی ہوں گی۔ [۸]

(۹) "در موضوع انحطاط مسلمین شکوہ از اروپیان خطا است۔ و خرابی حال مسلمانان از اخلاط فاسدہ دردنی خود مسلمانان است"۔

(۱۰) "حق وہ ہے جو دلیل و برہان رکھے"۔ [۹]

(۱۱) "شیر جہاں جاتا ہے اپنے لیے غذا مہیا کر لیتا ہے"۔ [۱۰]

(۱۲) چند اشعار جو شیخ اکثر پڑھا کرتے تھے (بقول مرزا لطف اللہ)

نخستیں بادہ کاندر جام کردند ز چشم مست ساقی وام کردند
چو خود کردند سر خویشتن فاش عراقی را چرا بدنام کردند

باز سخن پیرم یک حرف مرا یاد است۔ ویران نشود عالم تامیکدہ آباد است

[۶] روایت از مرزا لطف اللہ خاں [۷] روایت از علامہ رشید رضا، کہ جب شیخ مصر سے جا رہے تھے تو شاگردوں میں سے کسی نے کہا کہ اپنی یادگار کوئی کتاب تصنیف کیجیے۔ اُس کے جواب میں یہ فقرہ فرمایا تھا۔ [۸] روایت از مرزا لطف اللہ [۹] از یک خطبہ در مجلس وطنی مصر۔ [۱۰] مصر سے خارج البلد ہوئے تو روانگی کے وقت ایرانی سفیر نے کچھ روپیہ بطور زادِ راہ پیش کیا اُس کو جواب دیا کہ "مجھ سے زیادہ تم کو اس چیز کی ضرورت ہے۔ شیر جہاں جاتا ہے اپنے لیے غذا مہیا کر لیتا ہے"۔

یا دل کہ تواند بُرد یا جاں کہ تواند داد
دل بردن و جاں دادن ایں ہر دو خدا داد ست

آسمان رشک برد بہر زمینے کہ درو۔ یک دو کس بہر خدا یک نفسے بنشیند

من آن شوخ طناز رامی شناسم
من آن مایۂ ناز رامی شناسم
بگوش من آمد دی آواز پائے
من آن صاحبِ آواز رامی شناسم

اخلاق و اوصاف و عادات و علم و فضل و عقاید مذہبی و سیاسی

شیخ کی زندگی کے تینوں دور بیان کر دینے کے بعد اب اخلاق و عادات و فضایل اور اسی قسم کے جزیات کا بیان کرنا چنداں ضروری تو نہ تھا لیکن عذر صرف یہ ہی کہ۔

"لطیف بود حکایت دراز تر گفتم"

جس کسی نے گزشتہ اوراق کو بغور پڑھ لیا وہ اب مزید تشریح اور توضیح کا حاجتمند نہیں۔ شیخ کی زندگی خود ایک آئینہ ہی۔ اس لیے صرف دو تین ہی باتیں اور عرض کی جائیں گی۔

شیخ کے علم و فضل پر اُن کے سیاسی مشاغل نے ایک پردہ سا ڈال دیا تھا متبحر عالم ایک سیاسی مدبر کے لباس میں روپوش ہوگیا تھا فضیلتِ علمی پر اُن کا ذوقِ سیاست اس قدر چھا گیا تھا کہ جب تک دو چار پردے اٹھائے نہ جائیں علم و فضل کے نقطۂ نظر سے شیخ کا اعلیٰ مقام عام طور پر نظر نہ آسکتا تھا۔ دنیا نے اُن کی عظیم الشان سیاسی طاقت کو محسوس کیا لیکن سوائے مخصوص شاگردوں کے بہت کم لوگ معلوم کر سکے کہ اُن کا

تبحرّ علمی کتنا عظیم الشان تھا۔ اگر شیخ کی خداداد ذہانت اور زود فہمی تمام تر علمی دنیا میں بر روئے کار آتی تو آج اُن کا نام عہدِ قدیم و جدید کے معزز ترین علما کے ساتھ لیا جاتا اپنے زمانے کے علما پر جو تفوق اُن کو حاصل تھا وہ یہ تھا کہ بر خلاف دوسرے علما کے شیخ کا علم عمل سے محروم نہ تھا۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور بر خلاف علما حاضر کے وہ جدید علوم کے متعلق اپنی معلومات میں ہمیشہ اضافہ کرتے رہتے تھے۔ وہ اس تاریک حجرہ سے باہر آ گئے تھے۔ جس میں آج بھی ہمارے علما بند پڑے ہیں۔ وہ علما کی جماعت میں اجتہاد کی قوت کے فقدان کو محسوس کرتے تھے۔ اسی لیے وہ قدامت پسند علما کی نظریں کھٹکتے تھے لیکن اُن کو اس کی پروا نہ تھی۔ سیاست علم اور مذہب ہر میدان میں وہ اپنے لیے طاقتور مدِ مقابل تجویز کرتے تھے اور اُن کی ہمت بلند اپنے سے کم سے مقابلہ کرنے پر کبھی آمادہ نہ ہوتی تھی بقول مرزا حسن خاں دانش

"سید ہموارہ خوش می داشت کہ با بزرگ تر از خود بیا و یزد و با قوی از خود بستیزد"۔

براون نے اُن کی اِس ادا کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

"خطرہ کے مقابلہ میں جری اور بہادر صاف گو اور خوش خلق تیز مزاج ہر شخص کے ساتھ خوش اخلاق مگر بڑے لوگوں کے ساتھ بہت آزاد طبع اور بے پروا"

اب ذرا دوسروں ہی کی زبان سے شیخ کے کچھ اور فضایل بھی سُن لیجئے۔

سید رشید رضا یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ۔

"ایک دفعہ سید صاحب نے یورپ کی تاریخ پر ایک کتاب کا

مطالعہ شروع کیا کتاب ایک ہزار صفحے کی تھی اور باریک لاطینی حروف میں چھپی ہوئی تھی۔ آٹھ بجے شب کو کتاب شروع کی اور دوسرے دن صبح کے نو بجے تک مسلسل پڑھتے رہے حتیٰ کہ کتاب ختم کر دی۔ انہماک کا یہ عالم تھا کہ پتہ ہی نہ چلا کہ دن نکل آیا ہے جب کبھی اس کتاب کے مضامین پر گفتگو کی یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے حافظ ہیں۔ سید صاحب جو کتاب ایک مرتبہ پڑھ لیتے تھے پھر اُن کو اس کی احتیاج نہ رہتی تھی۔ دماغ ایسا ہمہ گیر تھا کہ جس فن کی کتاب ایک دفعہ پڑھ لیں اُس کے مضامین اپنے اصلی خد و خال کے ساتھ اُن کے دماغ میں محفوظ ہو جاتے تھے۔"

ابو سعید العربی نے اخبار جہان اسلام میں ایک واقعہ یوں لکھا ہے کہ

"قسطنطنیہ کے زمانۂ قیام میں ایک علمی اسکیم پر شیخ الاسلام سے گفتگو ہوئی اور اختلاف رائے پیدا ہو گیا سید نے کہا کہ میں تین مہینہ بعد اس اسکیم پر ترکی زبان میں خطبہ دوں گا۔ لوگوں نے اِس دعوے پر تعجب کیا اور مذاق اُڑایا کیونکہ سید اس وقت تک ترکی زبان سے بالکل ناآشنا تھے لیکن سید نے تین مہینے میں ایسی مشق بہم پہنچائی کہ ٹھیک تین مہینے بعد شیخ الاسلام وزیر معارف اور مشاہیر دارالسلطنت کے سامنے فصیح ترکی زبان میں خطبہ دیا اور سب سے اپنی رائے منوالی۔"

بلنٹ لکھتے ہیں کہ :

"محمد عبدہ بیان کرتے تھے کہ شیخ کا حافظہ غضب کا تھا وہ جس کتاب کو ایک دفعہ پڑھ لیتے تھے اُس کے تمام الفاظ اُن کے حافظہ میں فوراً محفوظ ہو جاتے تھے اُن کی طاقت لسانی بھی عجیب تھی اور

مشرق و مغرب کی دانائی سے ان کا دماغ لبریز تھا۔"

صاحب "اشہر مشاہیر ادبا الشرق" (محمد عبد الفتاح) نے تو یہاں تک لکھ دیا ہی کہ:-

مرحوم بمنزلہ سقراط تھے شیخ محمد عبدہٗ افلاطون سعد پاشا زاغلول ارسطو یعنی جمال الدین سے شیخ محمد عبدہ کو وہی نسبت تھی جو سقراط سے افلاطون کو۔"

بلنٹ لکھتے ہیں کہ:-

"............ جمال الدین ایک بڑے شخص تھے ان کی تعلیمات میں ایک خاص اثر اور کشش پائی جاتی تھی یہاں تک کہ آخری تیس سال میں دنیائے اسلام میں ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں ہوا۔ میں اپنے کو بہت زیادہ معزز اور مفتخر سمجھتا ہوں کہ وہ انگلستان میں میرے یہاں تین مہینے مقیم رہے۔ وہ اپنے خیالات میں پکّے اور پوری طرح ایشیائی تھے اور آسانی کے ساتھ یورپین رسوم اور عادات سے مانوس نہ ہوتے تھے۔"

مرزا آقا خان کرمانی:-

"عرب دیدہ و ترک و تاجیک دردم۔ زہر جنس در نفس پاکش علوم۔"

مفتی عبدہ:-

"میں بھی اُن کے شاگردوں میں سے ایک ہوں اور اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ اللہ تعالیٰ انبیا کے علاوہ جن نفوس کو قوتِ ذہن اور وسعتِ عقل اور دقتِ نظر عطا کیا کرتا ہی وہ سب اُن میں (شیخ میں) بدرجۂ اتم موجود ہیں تو میرا یہ کہنا مبالغہ آمیز نہیں۔"

فیلسوف فرانس:-

"کمتر اشخاص در من تاثیرے شدید تر ازیں تولید کردہ اند ۔ ہمیں مکالمہ من با وے (سید جمال الدین) بیشتر از ہمہ مرا آمادہ کرد کہ موضوع کونفرنس خودم را در "سوربون" بہ قرار ذیل انتخاب کنم "روابطِ روح علمی و اسلام" شیخ جمال یک افغانی است کہ کاملاً از خرافات اسلام آزاد و وارستہ است............ شیخ بہترین دلیلے است بہ وجوہ آن حقیقتِ بزرگ کہ غالباً اعلام کردہ ایم و آن عبارت است ازیں کہ قیمت ادیان بقدر آن قیمتے است کہ پیروان آن ادیان دارند ۔ حریت افکار شیخ، طبیعت نجیب و درست وے در موقعہ صحبت مرا بہ ایں اعتقاد واداشت کہ من درپیش خودم یکے از آشنایانِ قدیم خویش را مثلاً ابن سینا یا ابن رشد یار دیگر زندہ شدہ می بینم ۔ یا یکے ازاں آزاد مرداں بزرگ را کہ در دنیا نمایندۂ روح انسانیت بودہ اند مشاہدہ می کنم......"

فرانس کے مشہور ادیب موسیو ہنری راشفو (جو شیخ سے لندن میں ملے تھے) تو اپنی کتاب "میری سرگذشت" میں شیخ کا ذکر کرتے ہوئے یہاں تک لکھ گئے کہ ۔

"سید جمال الدین افغانی آلِ نبی سے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ وہ خود ایک نبی سے مشابہت رکھتے ہیں"

مرزا حسین خاں دانش :۔

"زبان تازی را بایک فصاحت فوق العادت و بقولِ خودش بہتر از زبان مادر زاد خود کہ فارسی باشد می گفت و می نوشت و فارسی را اندکے بشیوۂ عرب متکلم بود"

مرزا لطف اللہ شیخ کے حسب ذیل خیالات نقل کرتے ہیں :۔

"دین اسلام و قرآنِ مجید من اوله الیٰ آخرہ مساعد و رہنمائے ترقی روحی و جسمی طبیعت انسانی است وتا وقتیکہ اسلاف ما علماً وعملاً متمسک ومنتسب بہ حقیقت او بودند در منتہی درجۂ عرش سعادت استوار بودند۔ پس از آن کہ ازیں رہنمائے الٰہی اخلاف مادور شدند بہ ایں حال نزول رسیدند۔ پس در موضوع انحطاط مسلمین شکوہ از اروپائیاں خطااست و خرابی حالِ مسلمانان از اخلاط فاسدہ دردنی خود مسلمین است وحبل المتین استخلاص مسلمانان ازیں ہفتم طبقہ پستی وخواری تمسک علی بعروۃ الوثقی قرآنِ متین است۔"

آقا حسین خاں عدالت یکے از تلامذہ:۔

"ہرکس از دین مرحوم شیخ سوال می کرد می فرمود مسلمانم۔ روزے در مجلسِ درس یکے از علمائے تسنن صاحبِ مجلس از سید مرحوم پرسیدہ بود کہ درچہ عقیدہ می باشی۔ فرمودہ بود مسلمانم۔ صاحبِ مجلس دوبارہ پرسیدہ بود ازکدام طریقت۔ سید فرمودہ بود کسے را بزرگ تر از خود نمی دانم کہ طریقت او را قبول نمایم۔ صاحبِ مجلس باز گفتہ بود کہ رائے شما باکدام یک از چہار طریقت مطابقت دارد۔ سید فرمودہ بود مختلف است در بعضے بایکے در بعضے بادیگرے ......۔ حضرت رسول صلعم را خیلے محترم می داشت۔"

مرزا دانش لکھتے ہیں کہ:۔ خطاب بہ پیامبر آخرالزماں کردہ می گفت

دین ترا درپے آرایش اند درپے آرایش و پیرایش اند
بسکہ بہ بستند برو برگ وساز گرتو بہ بینی نشناسیش باز

مرزا آقا حسین خاں لکھتے ہیں کہ:۔

"سید جمال الدین باوجود داشتن یک مذہب فلسفی در ظاہر بہ طریقت صوفیہ سالک مذہبِ حنفی بود و اہتمام شدید بہ اداے فرائض مذہبیہ داشت"

مرزا لطف اللہ خاں بحوالۂ مرزا حسین خاں دانش :-

"سید جز از یک مقلب Revolutionery بسیار آتشیں بابصیرت و دانائی و یک محرک Agitator فلسفی مشرب چیزے دیگر نبود بپیشرفت یک ملت از راہ تکامل اعتقاد نہ داشت تمامی روئے زمین بچشم جمال الدین یک تختۂ شطرنج ......"

پروفیسر براؤن :-

"یہ بزرگ شخص ایک ایسا زبردست سیاح اور عالم تھا کہ باوجود اس کے کہ دولت دنیا میں سے فصیح زبان و قلم وسیع علم سیاسی فہم و فراست و معلومات مختلفہ اور اسلام کے لیے (جس کے انحطاط کو وہ اپنے دل میں محسوس کرتے تھے) سچے عشق کے سوائے اُن کے پاس اور کچھ نہ تھا تاہم یہ بات بلا مبالغہ کہی جاسکتی ہے اور حرف بہ حرف صحیح ہے کہ انھوں نے بادشاہوں کے تخت و تاج کو ہلا ڈالا تھا اور مدبرین یورپ کے بعض متفقہ تجاویز کو درہم برہم کردیا تھا۔ انھوں نے ان غیر معمولی قوتوں کو استعمال کیا جن کی جانب مشرق اور مغرب کی سیاست دونوں میں کوئی شخص بھی ملتفت نہ ہوا تھا اور نہ کبھی ادنیٰ سے فائدہ اٹھانے کا خیال ان کے دل میں آیا تھا۔ صرف انھیں کے ذریعہ مصر میں حب الوطنی اور مذہبی اتحاد کے جذبات پھیلے ......"

اسٹنڈرڈ اپنی کتاب New world of Islam میں شیخ کے متعلق اپنے خیالات اس طرح ظاہر کرتا ہے :-

"جمال الدین بہت بڑے سیاح تھے اور نہ صرف دنیائے اسلام سے کماحقہٗ واقف تھے بلکہ مغربی یورپ سے بھی پوری واقفیت رکھتے تھے۔ مسلسل سیاحتوں اور وسیع مطالعہ کی وجہ سے ان کی معلومات بیحد وسیع ہوگئی تھی جسے انھوں نے گوناگوں تحریکوں میں موثر طریقوں سے استعمال کیا۔ وہ پیدائشی مبلغ تھے اور اس حیثیت سے لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرلیتے تھے۔ دنیائے اسلام میں جہاں کہیں وہ گئے ان کی زبردست شخصیت نے ذہنی انقلاب پیدا کرنا شروع کردیا۔ برعکس شیخ سنوسی کے انھوں نے مذہب سے بہت کم سروکار رکھا اور تمام و کمال سیاست میں منہمک رہے۔ ...."

جمال الدین پہلے مسلمان تھے جنھوں نے مغربی غلبہ کے آنے والے خطرہ کو اچھی طرح محسوس کرلیا تھا اور انھوں نے بقیہ عمر اسلامی دنیا کو اس خطرہ سے آگاہ کرنے اور مدافعت کرنے کے ذرایع معلوم کرنے میں صرف کردی۔ یورپین آبادیوں کے حکام اُن کو شورش پسند قرار دیتے تھے بالخصوص انگریز جو اُن سے خائف رہتے تھے اور اُن سے سخت سلوک روا رکھتے تھے...... نہایت ذکی اور فہیم شخص تھے اور ان میں بہت زیادہ مقناطیسی قوت ودیعت کی گئی تھی۔ وہ کام کرنے کی غیر معمولی طاقت رکھتے تھے......"

"مشاہیر الشرق" میں جرجی زیدان لکھتا ہے:۔

"ان کی زندگی اور کارناموں کے مختصر حالات پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ مقصد جو ہمیشہ ان کے پیشِ نظر رہا اور وہ مرکز جس پر ان کی اُمیدیں ہمیشہ مجتمع رہیں اتحاد اسلام تھا جس کا مطلب یہ تھا

کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو متحد کر کے واحد خلیفہ اسلام کے ماتحت لایا جائے ۔ اس کوشش میں انھوں نے دنیوی خواہشات کو خیرباد کہدیا حتیٰ کہ شادی بھی نہیں کی[۵] اور کوئی خاص پیشہ بھی اختیار نہیں کیا۔ لیکن باوجود اس کے وہ اپنے مقصد میں ناکام رہے ...... لیکن انھوں نے اپنے دوستوں اور مریدوں کے دلوں میں ایک زندہ اسپرٹ پیدا کردی جو ہمیشہ اُن کی قوتوں کو بیدار اور ان کی تحریکوں کو تیز کرتی رہتی ہے اور مشرق نے اُن کی ان جانفشانیوں سے فایدہ اٹھایا اور ہمیشہ اٹھاتا رہے گا۔"

ایک مصری مصنف ودسی محمد اپنی کتاب "سرزمین فراعنہ" میں شیخ کی تعلیمات کا اس طرح ذکر کرتا ہے :-

"شیخ جمال الدین ہمیشہ یہ تلقین کرتے تھے کہ زمانۂ موجودہ میں اسلامی حکمرانوں کی روز افزوں استبدادیت سراسر اسلام کی اسپرٹ کے خلاف ہے جو درحقیقت جمہوریت پر مبنی ہے جہاں ہر مسلمان کو جلسوں میں آزادانہ تقریر کرنے کا پورا حق حاصل ہے اور جہاں ہر حکمراں کی حکومت کی کامیابی قانون اور رائے عامہ سے مطابقت کرنے میں مضمر ہے۔"

سید عیسیٰ خان :-

---

۵ بقول آقا مرزا حسین خان دانش ۔ ایک دفعہ سلطان نے دختران سرائے خلافت میں سے اُن کا نکاح کرانا چاہا مگر شیخ نے قبول نہ کیا فرمایا کرتے تھے "سلطان می خواہد کہ من زن کنم من زن نمی خواہم چہ کنم۔ من دنیائے بایں خوبی و بزرگی را بہ زنے نہ گرفتہ ام"۔

"یکے از مجاہدین کہ بہ مساعی ملت ہائے مظلوم شرق در ساخت تجدد دنیا کرسی سعی نمودہ اند شیخ جمال الدین است۔ ؎

رنڈلف چرچل :۔ ؎

جمال الدین بہت صاف گو اور صحیح رائے رکھنے والے آدمی ہیں۔۔"

ہانس کان :۔

"جمال الدین یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کی پاکیزگی اور اُس کے ابتدائی فلسفہ کی عظمت کا احیا ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے مسلمان اقوام اپنی قدیم سیاسی قوت اور برتری حاصل کر سکیں گی۔ جمال الدین کے اثراتِ گزشتہ صدی میں سب سے بڑے روحانی انقلاب کا سبب ہوئے۔۔۔"

مصر کے فلاحین کی فوجی تحریک نے اپنے کو ان اصلاحی تحریکات سے متحد کر لیا جو اسلامی تعلیمات کے مشہور مرکز الازہر میں جاری ہو چکی تھیں جمال الدین افغانی کو ہم اُن تحریکات کا بانی کہہ سکتے ہیں کیونکہ وہی اسلام کی جدید سیاسی بیداری کے پیدا کرنے والے تھے۔ انھوں نے اپنے اثرات کے نشانات تمام مشرقی ممالک میں چھوڑے ہیں۔۔۔۔"

ارنسٹ رنیان فیلسوف فرانس :۔

"این عجوبہ دہر۔ کہ بحقیقت یکے از تجلیات مستثنائے قدرت فاطرہ بود مانند یک شعلۂ برق درمیان یک طوفان بر جہاں تافت و گزشت و چیزے از خود باقی نہ گزاشت مگر این کہ بگویم کہ اگر سی سال

؎ در جریدہ وطن اسلامبول شمارہ ۳۰ ۱۹۲۴ء

؎ برطانوی وزیر ہند سنہ

پیش ازیں تحریکات و مجادلات سید در ایران بہ قصد تخریب سلطنت مستبدۂ ناصر الدین شاہ و ہدم سطوت او وقوع نہ پیوستہ بود ملت ایرانی چندیں مسافات درراہ آزادی و تجدد نہ پیمود بلکہ روئے آزادی را ہم بہ ایں زودی نہ دیدہ بود۔"

شیخ کی سیاسی ذہنیت کا یہ خاکہ مکمل نہیں، جس طرح یہ ساری کتاب ہنوز غیر مکمل ہی، بہرحال ان سطور میں اس "شعلۂ برق درمیان یک طوفان"، کا ایک جلوہ منتشر ضرور موجود ہی۔

شیخ اپنے سیاسی مسلک اور اوضاع میں اس درجہ پختہ ..... اور کہا جا سکتا ہی کہ شدت کے ساتھ ضدی تھے۔ کہ باوجود شدید ناکامیوں اور قوی ترین ترغیبات کے وہ اپنے راستہ سے ایک قدم نہ ہٹے۔ ایک دفعہ ان کے دوست اور معتقد حاج سید ہادی نے ان کو ایک خط لکھا جس میں ان کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے خیالات میں کچھ اصلاح کرلیں ورنہ اُن کی جان خطرہ میں رہے گی۔ شیخ کے جواب کی بلاغت اور اُس بلاغت میں استہزا کی تلخی ملاحظہ ہو۔

"سید ہادی جان من۔ مکتوب تو بسہو محانی درشتافت، الفاظش درحقیقت چوں بستانے بود کہ میدان اشجار ملتفہ اش بہ انواع ازہار مرصع باشد و لے صد حیف کہ سالک بین اشجار ہمہ مملو بود از قبور غار بہ وعظام بالیہ و جثث قتلی و سیل و بار کہ نگاہ کردنش موجب کراہت و تعبورش سبب نفرت می گردید۔ و نتن رائحہ ایں باقوۂ شامہ را از استشمام ان انوار و ازہار باز می داشت، والسلام"

دوستوں کی اس قسم کی خیر طلبی پر ان کی جرات عمل ہنسا کرتی تھی۔

اُن کی صحبت میں اکثر اُن کا یہ کمال ظاہر ہوتا تھا کہ وہ حاضرین کو اپنی فصاحت و بلاغت سے بہت جلد اپنا ہم آواز کر لیتے تھے مرزا آقا خاں دانش نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ :-

"بہ ضربِ قدرتِ ناطقہ غرّا و بہ تاثیر جادوئے دو چشم گیرا بود کہ شیخ جمال الدین ہمہ را اسیر موانست خود می کرد و دلہارا از دست می بُرد"

اسی طرح آقا سید حسین خاں عدالت لکھتے ہیں کہ :-

"صحبت بیانِ ایشان در ہر بابِ انسان را خستہ نمی کرد گاہی می باشد کہ در یک اطاقِ چہار ساعت با من کہ ہمہ گوش بودم صحبت می کرد و من خستہ نمی شدم و بر ہمہ مجالس آن را ترجیح می دادم ------"

اُس جلوہ بزم سیاست مشرق و مغرب کے متعلق یہ ایک مختصر سا بیان ہے ------------ برسرِ راہ --

تصنیف و تالیف

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے تصنیف و تالیف کی طرف شیخ کا رجحان بہت کم تھا وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں زندہ کتابیں تصنیف کرتا ہوں" اور بلا شبہہ اُنھوں نے ہزار ہا زندہ کتابیں تصنیف کیں۔اُن کی دماغی قوت تمامتر سیاسی مشاغل میں صرف ہوتی تھی اور نہ کبھی اُن کو سفر و سیاحت سے اتنی مہلت ملی کہ تصنیف و تالیف کی طرف توجہ کرتے۔ ان کے قلم کا تمام سرمایہ جرائد و رسایل کے صفحات پر بکھرا ہوا ہے۔ اس سرمایہ کو امتدادِ زمانہ نے بہت کچھ ضایع کر دیا پھر بھی اہلِ ذوق چاہیں تو تلاش اور جستجو کا میدان تنگ نہیں ہے: آثارِ جمال الدین" کی دوسری جلد میں شیخ کے تمام مضامین جو مل سکے جمع کر دئے گئے ہیں۔ لیکن ابھی زمانہ کے گرد و غبار سے ڈھکے ہوئے بہت سے جواہر ریزے متفرق اور منتشر ہیں جن کو شیخ کا مجھ سے کوئی زیادہ قابل و اہل سوانح نگار جمع کر سکے گا۔

کتابی صورت میں شیخ کی تالیف صرف ایک ہی ہے یعنی "تتمہ البیان فی تاریخ افغان" یہ پہلے فارسی زبان میں مرتب ہوئی پھر مصر میں اُس کا

عربی ترجمہ شایع ہوا اس کے بعد ہندوستان میں اُردو ترجمہ چھاپا گیا اس کے بعد شیخ کا ایک مضمون " رد علی الدھرین " فارسی سے عربی میں ترجمہ ہوا - یہ مضمون سب سے پہلے حیدر آباد میں لکھا گیا اور پھر رسالہ کی صورت میں شیخ کے مصری شاگردوں نے اس کو شایع کیا مستقل تالیف و تصنیف کا سرمایہ تو بس اِسی قدر ہے - چند مضامین اُردو اور فارسی زبان میں "مقالات جمالیہ" کے نام سے کلکتہ میں شایع ہوئے اس رسالہ کے نسخے اب کمیاب ہیں - ایک نسخہ دار المصنفین اعظم گڈھ کے کتب خانہ میں موجود ہے جس سے راقم الحروف کو بہت مدد ملی اس کے علاوہ شیخ کے حسب ذیل مضامین بھی مصر اور ہندوستان میں بصورت رسایل شایع ہو چکے ہیں -

(۱) "حجۃ البالغہ" - (۲) جملہ القرآن" (۳) فلسفہ الدین و اللغت (۴) المحافظہ علی الدین (۵) القضاۃ و القدر (۶) الوصیۃ لبا سقہ الاسلامیہ -

"عروۃ الوثقیٰ" میں شیخ کے جتنے مضامین شایع ہوئے وہ سب کتابی صورت میں مصر میں شایع ہو چکے ہیں البتہ "ضیاالخافقین" میں شایع شدہ مضامین کا پتہ نہ چل سکا - اسی طرح پرنس ملکم خاں کے رسالہ "قانون" میں جو مضامین شایع ہوئے اُن تک بھی رسائی نہ ہو سکی - حیدر آباد کے رسالہ معلم اور معلمِ شفیق میں شیخ کے حسب ذیل مضامین شایع ہوئے تھے -

(۱) فلسفہ وحدت و جنسیت (۲) تعلیم و تربیت (۳) اسباب حقیقت سعادت و شقاۓ انسان (۴) فوائد جریدہ (۵) فوائد فلسفہ (۶) شرح حال

ے - الطبعۃ الاولیٰ بمطبع الموسوعات بباب الخلق مصر ۱۹۰۱ء - (۱۶۰) صوفی پرنٹنگ و پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ پنڈی بہاؤ الدین پنجاب مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور -

ے - مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۸۸۰ء - (۱۶۲) -

اگھوریان ۔ اخبار" دارالسلطنۃ " (کلکتہ) میں شیخ کا ایک مضمون تفسیر مفسر کے عنوان سے شایع ہوا ۔ بطرس البستانی کے رسالہ دائرۃ المعارف مصر میں بھی شیخ نے بابی مذہب کے متعلق کچھ مضامین لکھے ۔ اخبار مصر (اسکندریہ) میں دو مضامین تعلیم اور صنعت پر شایع ہوئے ۔ رسالہ المنار (مصر) میں بھی شیخ کے حالات کے سلسلہ میں اُن کے بعض مضامین نقل کئے گئے ہیں، جن میں دو مضامین " فی الحکومۃ الدستبدادیہ " کے عنوان سے بہت مشہور ہیں ۱۸۶۰ - ۶۴ء میں Edenburgh Review نے بھی شیخ کے دو تین مضامین شایع کئے تھے ۔

علاوہ مندرجہ بالا رسائل و مضامین کے بعض کا ذکر مرزا لطف اللہ نے کیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ کہاں اور کب شایع ہوئے ۔ اُن رسائل کے عنوانات بقول مرزا لطف اللہ یہ ہیں ۔ (۱) طفل رضیع (۲) رسالہ حقیقت آشنا (۳) کیفیت شہادت ۔ حضرت سیدالشہدا ۔ باوجودیکہ شیخ کے مضامین کچھ زیادہ حاصل نہیں ہوسکے، پھر بھی اتنے ہیں کہ اُن کے مجموعہ کو ایک علیحدہ جلد میں شایع کرنا پڑیگا ۔

* * *

* *

*

ے مطبوعہ بیروت ۱۸۸۱ء

ے المنار جلد ۳

ضمیمہ جات

ضمیمہ جات

۱۔ علامہ موسی جاراللہ۔ روسی

راستوف (روس) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم قازان، بخارا، مصر اور حجاز میں حاصل کی۔ ۱۹۱۵ء میں اُن کی عمر ۳۰ اور ۴۰ سال کے درمیان تھی۔ اس لیے جب وہ شیخ سے ملے تو یقیناً بالکل نوجوان ہونگے۔ مصری سیاح ارشاد بک لکھتا ہو کہ روسی مسلمانوں میں موسی جاراللہ کا وہی پایہ تھا، جو مصر میں مفتی عبدہ کا تھا کہا جاتا ہو کہ جب شیخ روس میں مقیم تھے تو علامہ موصوف بھی کبھی کبھی اُن کی خدمت حاضر ہوا کرتے تھے۔ علامہ موصوف آج کل ہندوستان آئے ہوئے ہیں۔ لیکن افسوس ہو کہ اُن کے زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے۔

۲۔ پروفیسر ایڈورڈ گارڈنر براؤن

۷ فروری ۱۸۶۲ء کو پیدا ہوئے ۱۸۸۷ء میں جب اُن کی عمر ۲۴ سال کی تھی پہلی دفعہ ایران گئے اور اُس کے بعد ایران کے کچھ ایسے گرویدہ ہوئے کہ ساری عمر اُسی ملک اور قوم کی خدمت میں گزار دی۔ سند یافتہ ڈاکٹر بھی تھے مگر کبھی مطب نہیں کیا۔ کیمبرج میں فارسی اور عربی کے پروفیسر رہے اور دنیا کے قابل ترین مستشرقین میں سے ایک مانے جاتے تھے۔ بلکہ ایران کی ادبیات ذوقیات۔ معنویات یعنی شعرا۔ حکما اور اربابِ مذاہب کے افکار کے متعلق کسی دوسرے مستشرق نے اس قدر خاص اور خالص محبت کا ثبوت نہیں دیا۔ اُن کی تصانیف میں ۱۲ بڑی کتابیں اور ۲۳ رسالے ہیں جن میں سے

(۱) "ایک سال ایرانوں کی صحبت میں" سنہ ۱۹۲۶ء

(۲) مسافر کی داستان (سنہ ۱۸۹۱ء

(۳) تاریخ ادبیات ایران سنہ ۱۹۰۲ء

(۴) انقلاب ایران سنہ ۱۹۰۵ء

(۵) ترجمہ چہار مقالہ سنہ ۱۹۲۱ء

(۶) عربی طب سنہ ۱۹۲۱ء

(۷) اشعار و مطبوعات ایران سنہ

(۸) البہا سنہ ۱۸۹۱ء

(۹) ترجمہ تاریخ جدید مرزا حسین ہمدانی سنہ ۱۸۹۳ء

(۱۰) ترجمہ مقالہ سیاح

(۱۱) بعض اسناد در بارہ مذہب بابیہ سنہ ۱۹۱۸ء

زیادہ مشہور ہیں اور تاریخ ادبیات ایران تو بلاشبہ اُن کا شاہکار ہی جو نہ صرف یورپ میں اپنے رنگ کی بے نظیر کتاب ہی بلکہ فارسی زبان میں بھی اس مضمون پر کوئی کتاب اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ سیاسیات ایران کے متعلق براون کی دو کتابیں سب سے زیادہ مشہور اور مستند ہیں یعنی انقلاب ایران اور اشعار و مطبوعات ایران بابی مذہب کے متعلق بھی اُن کا مطالعہ بہت گہرا تھا اور انھوں نے جو کچھ لکھا خوب لکھا علامہ موصوف کی تالیفات کی بڑی خصوصیت ہمیشہ یہ رہی ہی کہ اُن کی صحت معلومات مشتبہ نہیں ہوتی وہ جو کچھ لکھتے تھے بہت تحقیق و تفتیش کے بعد لکھا کرتے تھے۔ اُن کی مالی حالت بہت اچھی تھی لیکن وہ خود نہایت سادہ علمی زندگی بسر کیا کرتے تھے حافظہ عجیب و غریب تھا اور السنہ اسلامی کا خاص ذوق رکھتے تھے۔

عربی، ترکی اور فارسی بہت اچھی طرح بولتے تھے۔

ایران کے ساتھ براؤن کی ہمدردیاں بے حد و انتہا تھیں اور وہ سچے دل سے ایران کے ہوا خواہ اور ہمدرد تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے قلم سے ایرانی قوم پرستوں کی بہت معاونت کی۔ ایران کے حالات کے متعلق اُن کے دل میں جو جذبات موجزن رہتے تھے اُن کا اندازہ خود ان ہی کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ قزوینی نے اپنے ایک مضمون میں براؤن کے بعض مکتوبات کا حوالہ دیا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے دل میں ایران اور ایرانی قوم کے متعلق کس قدر درد تھا۔ انگریزوں کی ایران میں مداخلت کے متعلق اپنے خیالات اِن الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں۔

"ازیں خبر وحشت انگیز تمہید نامہ انگلش بحکومت ایران یاس بر یاس افزود۔ یک طریقے مانده بود برائے خلاصی ایران ازچنگ حریفاں و بنیان آن اولاً بر اتحادِ کامل بود و فداکاری از برائے وطن و قرض گرفتن از زردشتیاں بمبئی کہ حاضر بودند بہ شروط معقولہ و تدارک جیش بہ ہر زودی کہ ممکن باشد و تمسک باریان مجتہدین کبار خصوصاً جناب ملا محمد کاظم خراسانی کہ از وطن پرست ہائے حقیقی و عقلائے دور بین است ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ از کثرتِ حزن حالتے ندارم کہ بیش ازیں نویسم و مخلص خود خیال داشتم کہ بہ ملا محمد کاظم عریضہ بنویسم مراتب امور را معروض دارم ولے یاس بطوریے غالب شده است کہ عزم من بہ چیزے قرار نمی گیرد ۔ ۔ ۔ ۔"

پھر مغربی اقوام کی تعدیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"....... ولے قوت ظلم دریں دنیا خیلے است گاہے می ترسم کہ عدل وحب حریت کم کم نادر تراز کبریت احمر شدہ است و شکے نیست کہ بیشتر ایں تعدیات از تحریکات مالیون است کہ ہمیشہ حاضر اند کہ بہ سرخ خون مردم بخرند نہ از خدا می ترسند و نہ از آہِ مظلومان اے کاش کہ می توانستم ازیں عالم سیاسیات رہائی یابم دور در عالم افکار و معانی روحانیات آرام بگیرم۔ حاضرا دو سہ سال است بہ واسطۂ اوضاع ایران مثل حالتِ نزع از برائے من حاصل شدہ است ۔۔"

میں نے جب آخر دفعہ ۱۹۲۵ء میں اُن کو دیکھا تھا تو عارضۂ قلب میں مبتلا اور حالتِ ضعف میں لیٹے ہوئے تھے لیکن بستر کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی میزوں پر سینکڑوں کتابیں اور کاغذات سب ایران کے متعلق انبار در انبار رکھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے مجھے صرف پندرہ منٹ ملنے کی اجازت دی تھی مگر اُنھوں نے ڈھائی گھنٹے تک اُٹھنے نہ دیا اس لیے کہ ذکر چھڑ گیا تھا۔ جمال الدین اور ایران کا!

وہ ایک بہت بڑا انسان ایک بہت بڑا عالم اور مستشرق تھا جو ۵ جون ۱۹۲۶ء کو اِس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

۳۔ ولفرڈ اسکاون بلنٹ Wilfred Scawn Blunt ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے ابتدائی عمر میں برطانوی سفارت خانوں میں ملازم رہے۔ پہلے یونان کے برطانوی سفارت خانہ میں تعینات کیے گئے ایک معزز اور دولت مند خاندان کے رکن تھے۔ جوانی کا زمانہ تھا

پیرس کی دلچسپیوں میں مبتلا ہوگئے اس لیے وہاں سے پرتگال بھیجے گئے۔ اس کے بعد انگلستان واپس آئے
سفارت خانہ میں بھیجدیے گئے۔ اس کے بعد انگلستان واپس آئے
اور لیڈی اینا بیلا نیول Annabella Neol سے شادی کرلی
یہ آرل آف لوولیس Earl of lovelace کی بیٹی تھیں اور اُن کی ماں
شاعر بائرن کی پوتی تھیں۔ شادی کے کچھ روز بعد بلنٹ کے بڑے
بھائی کا انتقال ہوگیا اس لیے وہ آبائی جاگیر کے وارث قرار پائے
ملازمت ترک کرکے وہ چھ برس تک اپنی جائداد کے انتظام میں
مصروف رہے۔ اُن کی بیوی کا محبوب مشغلہ مصوری تھا اور وہ خود
نقاش اور شاعر تھے۔ لیکن شروع ہی سے اُن کو مشرقی ممالک سے
خاص دلچسپی تھی اور اُن کی بیوی کو بھی سیاحت کا بہت شوق تھا
چنانچہ یہ دونوں مشرقی ممالک کی سیاحت کے لیے گھر سے نکلے اور
گھوڑوں پر اسپین الجزائر ایشیائے کوچک عراق ایران نجد اور وسط
عرب کا سفر کیا۔

۱۸۸۱ء تک بلنٹ کے تعلقات انگریزی مدبرین اور اعلیٰ
عہدیداران حکومت سے بہت اچھے تھے۔ برطانوی دفتر خارجہ میں
ان کا ذاتی اثر بہت تھا۔ گلیڈسٹن سے ذاتی تعلقات کی بنا پر
براہِ راست اُن کی خط و کتابت ہوتی تھی۔ انگلستان میں بلنٹ
مشرقی ممالک اور سیاسیات کے اچھے ماہر سمجھے جاتے تھے۔
اسی زمانہ میں انھوں نے اپنی پہلی کتاب "مستقبل اسلام"
Future of Islam شائع کی۔

صحیح طور پر معلوم نہیں کہ شیخ سے پہلی دفعہ کہاں اور

کیونکر اُن کی ملاقات ہوئی لیکن مصر کے معاملات میں بلنٹ برطانوی پالیسی پر شدت کے ساتھ نکتہ چینی کر رہے تھے اس لیے شیخ کے اور اُن کے درمیان اشتراکِ عمل ہوگیا۔ اعرابی پاشا کے معاملہ میں اُن کی کوششوں نے تمام مصری قوم پرستوں کو اُن کا گرویدہ کر دیا۔ اعرابی کے مقدمہ کی پیروی میں انھوں نے اپنی جیب سے ۵۴ ہزار روپیہ خرچ کیا اور انگلستان میں حکومت کی پالیسی کے خلاف اس قدر سخت پروپگنڈا کیا کہ آخر تنگ آکر حکومت نے دو برس تک اُن کو مصر میں داخل ہونے کی ممانعت کردی۔ اپنی ایک مشہور نظم The wind and that whirlwind میں انھوں نے برطانوی سیاست پر شدید نکتہ چینی کی۔

اسی طرح آئرلینڈ کے معاملات میں بھی انھوں نے وہاں کے قوم پرستوں کا ساتھ دیا اور ایک دفعہ باوجود سرکاری ممانعت کے ایک جلسہ منعقد کیا اور اِس خلاف ورزی احکام کی پاداش میں دو مہینہ قید کی سزا پائی اُس قید کی حالت میں انھوں نے ایک نظم لکھی جس سے اُن کے عالی خیالات کا پتہ چلتا ہے:-

" خدا جانتا ہے کہ میں نے پہلے سے اِس کارروائی کا ارادہ نہ کیا تھا نہ میں کسی خاص سیاسی مصلحت سے اپنے گھر کی اسائش چھوڑ کر اِن خدا کے نامقبول بندوں سے لڑنے آیا تھا نہ میں کسی ذاتی غرض سے سالہا سال قوت اور تشخیص کا مقابلہ کرتا رہا ہوں۔ میری روح اِن جھگڑوں سے پہلے ایک بھائی کی طرح تمام

انسانوں سے محبت کرتی تھی خدا جانتا ہے کہ انسانوں پر انسانوں کے مظالم کس طرح میرے دل پر اثر کرتے ہیں اور خدا ہی گواہ ہے کہ اِن قاتلوں کے خلاف کس طرح میرے غصہ کی آگ بھڑکی جو دولت کے لیے قتل کرتے ہیں۔ اور خدا ہی جانتا ہے کہ میں نے اُن کا کیا مقابلہ کیا اور خدا ہی جانتا ہے کہ اُس دِن سے آج تک ایک مسلحہ دنیا غصہ اور خوف کی حالت میں کس طرح میری زندگی پر حملے کر رہی ہے۔"

مصر اور آئرلینڈ کے علاوہ بھی جہاں کہیں آزادی کا علم بلند ہوا بلنٹ کی آواز بھی بلند ہوتی رہی۔ ۱۹۰۵ء میں ونشوائی میں جب لوگوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا تو بلنٹ نے سختی کے ساتھ بر سرِ عام احتجاج کیا۔ اسی طرح ۱۹۰۹ء میں اہلِ طرابلس پر اطالیوں کے مظالم کے خلاف انھوں نے غم و غصہ کا اظہار کیا پھر ۱۹۱۶ء میں جب آئرلینڈ کے مشہور انقلاب پسند جارج کیمنسٹ کو سزائے موت دی گئی تو وہ خاموش نہ رہ سکے۔

ایک دولت مند اور بے فکر اِنسان کی زندگی کے یہ مشاغل تعجب انگیز ہیں بلنٹ اگر چاہتے تو اُن کے پاس ایسے وسائل موجود تھے کہ وہ سیاست اور حکومت کے حلقوں میں اعلیٰ مناصب حاصل کر لیتے مگر انھوں نے ہمیشہ قوی کی قوت سے قطع نظر کر کے ضعیفوں اور کمزوروں کی اعانت و حمایت میں اپنی دولت خرچ کی اور عمر بھر اُن کا سیاسی مسلک یہی رہا۔

اُن کی تصانیف میں سے، نثر کی کتابیں اور ۹ نظمیں بہت مشہور

ہیں۔نشر ہیں -

(۱) تاریخ دخل مصر History of the occupation of Egypt
سنہ ۱۹۰۷ء

(۲) گارڈن خرطوم میں Gordon at Khurtum سنہ ۱۹۱۱ء

(۳) مستقبل اسلام Future of Islam سنہ ۱۸۸۲ء

(۴) خیالات متعلقہ ہند Ideas about India سنہ ۱۸۸۵ء

(۵) ہندوستان بعہد حکومت رپن India under Ripon سنہ ۱۹۰۹ء

(۶) جنگ زمینداری در آئرلینڈ Land war in Ireland سنہ ۱۹۱۲ء

(۷) روزنامچہ جلد اول My diaries vol. 1 سنہ ۱۹۱۹ء

(۸) روزنامچہ جلد دوم My diaries vol 2 سنہ ۱۹۲۰ء

بہت مشہور ہیں اور نمبر (۱) و (۲) تو اپنی قسم کی بہت اہم اور مستند کتابیں مانی جاتی ہیں جن میں اس زمانہ کی برطانوی حکمت عملی کی بے محابا پردہ دری کی گئی ہے - سنہ میں انتقال ہوگیا۔

۴۔ مدحت پاشا

ابوالاحرار مدحت پاشا ملّت عثمانی میں تحریک قوم پرستی کے بانی سنہ ۱۸۲۲ء میں بمقام قسطنطنیہ پیدا ہوئے۔ ۲۲ سال کی عمر میں فائق آفندی کے سکریٹری مقرر ہوگئے اس کے بعد رومیلیا کے گورنر بناکر بھیجے گئے وہاں کی بغاوت فرد کرنے کے بعد وہ پھر اپنی جگہ واپس آگئے۔ سنہ ۱۸۵۵ء میں جب بلغاریہ میں بغاوت ہوئی تو پھر اُس کو فرد کرنے کے لیے بھیجے گئے نیش کی گورنری کے زمانہ میں انھوں نے وہاں کی داخلی حکومت کے نظم و ترتیب کے متعلق کچھ اصلاحی

تجاویز تیار کیں اس کے بعد سلطان نے ان کو تمام سلطنت کے لیے اصلاحی تجاویز بہ مشورہ فواد پاشا وعالی پاشا تیار کرنے کا حکم دیا۔ ۱۸۶۶ء میں انھوں نے مجلس حکومت کے قواعد میں ترمیم کرائی لیکن کچھ روز بعد عراق کے حالات کو درست کرنے کے لیے بغداد کے گورنر بنا دیئے گئے باوجودیکہ دار السلطنت میں اُن کا قیام مستقل طور پر نہ تھا لیکن وہ تمام عمر یہی کوشش کرتے رہے کہ ملک کے اندرونی انتظامات میں ایسی اصلاحیں کرائی جائیں جن سے حکومت تقویت حاصل کرے اور رعایا کو مشکلات و مظالم سے نجات حاصل ہو لیکن قسطنطنیہ میں اُن کے خیالات کے سخت مخالف ندیم پاشا وزیر اعظم تھے اور وہ مدحت پاشا کی تجاویز کو کسی طرح قبول نہ ہونے دیتے تھے مگر مدحت سلطنت کی بد حالی کو اچھی طرح دیکھ رہے تھے اور بار بار سلطان کو اُس کی طرف متوجہ کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ تو اُنھوں نے تنگ آکر یہ جرأت کی کہ سلطان کو ایک خط لکھا جس میں صاف صاف لکھ دیا کہ "آپ ایک بڑی خندق کے کنارے آگئے ہیں" اس زمانہ میں ایسی جرأت وہی مخلص قوم پرست کر سکتا تھا جس کو شاہی انعام و اکرام کی پروا نہ ہو یہ خط لکھنے کے بعد انھوں نے اپنے منصب سے استعفیٰ دیدیا اور قسطنطنیہ واپس آگئے۔

سرکاری ملازمت سے آزاد ہونے کے بعد اب وہ اور زیادہ جرأت کے ساتھ ملک و قوم کی خدمت پر کمربستہ ہو گئے چنانچہ اپنی جماعت کو منظم کر کے انھوں نے شیخ الاسلام کی ہمدردیاں حاصل کیں اور آخر ۱۸۷۵ء میں فتوی حاصل کر کے سلطان عبدالعزیز کو معزول

گرادیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ سلطان کو معزول لئے بغیر اصلاحات کی تجاویز روبراہ نہ ہوسکیں گی۔ سلطان عبدالحمید خاں کو آل عثمان کے تخت پر بٹھانے والی مدحت کی جماعت تھی۔ عبدالحمید نے مدحت سے یہ عہدو پیمان کر لیا تھا کہ وہ تخت نشین ہوکر مجوزہ اصلاحات کو ملک میں نافذ کریں گے اور غالباً اسی قرار داد کی بنا پر مدحت کی قوم پرست جماعت نے عبدالحمید کی تخت نشینی کا سارا اہتمام کیا تھا۔ عبدالحمید نے تخت نشین ہوتے ہی مدحت کو وزیر اعظم بنایا اور بڑی شان وشوکت سے ترکی پارلیمنٹ کا افتتاح کیا لیکن یہ سب عبدالحمید کی حکمت عملی تھی۔ وہ اپنی استبدادیت اور مطلقیت میں ایک ذرہ کمی گوارا نہ کرتے تھے اور وہ سب سے زیادہ مدحت سے بدگمان تھے۔ اور یہ سمجھتے تھے کہ مدحت کی قوت ملک میں بڑھ رہی ہے اور اگر وہ عبدالعزیز کو معزول کرا سکے ہیں تو مجھے بھی تخت سے اتار سکتے ہیں چنانچہ عبدالحمید نے جب دیکھا کہ پارلیمنٹ کی قوت بڑھ رہی ہے اور سلطانی اختیارات کم ہوتے جاتے ہیں تو انھوں نے مدحت کی طاقت کو توڑنے کا تہیہ کر لیا۔ باالاخر یہ الزام قایم کرکے کہ وہ ایک سازش میں شریک تھے اُن کو خارج البلد کرا دیا گیا۔ اور ساتھ ہی پارلیمنٹ کے دروازے بھی بہ جبر بند کرادئے گئے۔ یہ سب کچھ کرکے بھی عبدالحمید مطمئن نہ تھے وہ جانتے تھے کہ جب تک مدحت زندہ ہیں دستوریت کی تحریک بھی ٹرکی میں زندہ رہے گی اور اُن کی زندگی میں اصلاحات کے تجاویز کو قطعاً منسوخ کردینا بہت دشوار ہوگا۔ اس لیے پھر ایک دفعہ مدحت کے متعلق خوشنودی کا اظہار

کرکے واپس بلا لیا گیا۔ اور سمرنا کا گورنر بنا دیا گیا۔ پھر دفعتاً سلطان عبد العزیز کے قتل کا دوبارہ الزام ان پر عاید کرکے ان کو گرفتار کرلیا گیا۔ جھوٹے گواہ تیار کرکے ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ اور عدالت سے سزائے موت کا حکم صادر کرا دیا گیا۔ لیکن اُس وقت برطانوی سفارت خانہ کی ہمدردیاں مدحت کے ساتھ تھیں۔ ادھر سے معاملات میں مداخلت کی گئی اور عبدالحمید برطانوی اثرات سے مرعوب ہو گئے۔ اُس زمانہ میں برطانوی سفیر سر ہنری ایلیٹ نے اس مقدمہ کے متعلق اپنی ایک رپورٹ میں لکھا تھا کہ عبدالحمید کے دورِ حکومت پر یہ ایک نہ مٹنے والا دھبہ ہے۔ اب عبدالحمید نے گھبرا کر سزائے موت کو عمر بھر کی نظر بندی سے بدل دیا اور مدحت کو عرب میں نظر بند کر دیا گیا لیکن یہ نظر بندی بھی انگریزوں کو صرف چند روز مطمئن کرنے کے لیے عبدالحمید کی ایک چال تھی اُن کے دل میں وہی خیال جما ہوا تھا کہ جب تک مدحت زندہ ہیں میرا تاج و تخت محفوظ نہیں اسلیے ۲۶ رجولائی ۱۸۸۳ء کو حالتِ نظر بندی میں مدحت کو قتل کر دیا گیا اس میں کلام نہیں کہ مدحت ترکی میں مطلقیت کے سب سے سخت دشمن اور حریت و عصبیتِ قومی کے سب سے پہلے عَلَم بردار تھے جنھوں نے سلطان کی مطلقیت کے خلاف قوم پرست جماعت کو منظم کر دیا بلا شبہ ترکی میں مدحت ہی کی جدوجہد اور قربانی سے تحریک آزادی کا نیا دور شروع ہوُا اور انھیں کے نصب کیے ہوئے سنگِ بنیاد پر سید جمال الدین نے قوم پرستی کی عمارت تیار کی۔

۵۔ محمد نامق کمال بے۔

مشہور ترکی ادیب و شاعر (ولادت سنہ ۱۸۴۰ء) اُن کے والد سلطان سلیم ثالث کے چمبرلین تھے اُن کا خاندان البانی نسل سے تھا ۱۵ سال کی عمر میں شاعری شروع کی شناسی افندی کے زیر اثر جو یورپ کے تعلیم یافتہ تھے سیاسیات میں دلچسپی لینے لگے بعد کو شناسی کے اخبار "تصویر افکار" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ جب سنہ ۱۸۶۴ء میں شناسی حکومت کی تعدی سے تنگ آکر یورپ کو بھاگے تو اخبار نامق کے حوالہ کر گئے۔

حکومت نے دار السلطنت سے اُن کو دور رکھنے کے لیے ارض روم میں ایک سرکاری عہدہ پر اُن کا تقرر کر دیا۔ وہاں ضیا پاشا "نوجوان ترکوں" کی تحریک پیدا کر چکے تھے۔ نامق وہاں پہنچ تو جاتے ہی اُس جماعت میں شریک ہو گئے مگر اِن نوجوانوں کا حکومت کے جاسوسوں کی نظر سے بچنا مشکل تھا چنانچہ جب گرفتاری کا خطرہ پیدا ہوا۔ تو ضیا کمال نوری رفعت اور نامق یہ سب کے سب بھاگ کر لندن چلے گئے۔ یہ واقعہ سنہ ۱۸۶۶ء کا ہے۔ لندن سے نامق کمال بے نے اخبار مخبر جاری کیا بعد کو یہی اخبار حریت کے نام سے پیرس سے شایع کیا جاتا تھا۔

پھر جب اِن تارکانِ وطن کو وطن جانے کا موقعہ ملا تو وہاں جاکر نامق نے اخبار عبرت جاری کیا۔ پھر جب عبدالحمید خاں کی تخت نشینی کے بعد اصلاحات کا چرچہ شروع ہوا تو نامق اور ان کے تمام احباب مدحت اور ضیا پاشا کے ساتھ نیا دستور بنانے میں شریک ہو گئے . . . . . .

۱۸۸۸ء میں اُن کا انتقال ہوگیا لیکن جب نوجوان ترکوں کی تحریک بالآخر کامیاب ہوئی اور حکومتِ ترکی کے دروبست میں انقلاب عظیم پیدا ہوا اور نوجوان ترک اُس پر پوری طرح قابض ہو گئے تو نوجوان پارٹی کے تمام ممتاز اراکین نامق کی قبر پر خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے حاضر ہوئے۔ وہ مرحوم کو "معمارِ عمارتِ آزادی" کے لقب سے یاد کرتے تھے...

نامق ترکی کے بہت مشہور مصنف اور مولف تھے انھوں نے بہت سی تاریخی کتابیں اور ڈرامے لکھے جو "انقلاب" کے بعد ملک میں بہت مقبول ہو گئے تھے....

۴۔ شیخ ہادی نجم آبادی۔

ایران کے اکابر مجتہدین میں سے بہت معزز و محترم تھے اور بہت آزاد خیال تھے۔ وہ قدیم خیالات کے مقابلہ میں اپنے جدید خیالات کو بہت جرات اور صفائی کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے۔ سوائے بادشاہ کے کسی کو تعظیم نہ دیتے تھے حالانکہ اُن کی صحبت میں ایران کے بڑے بڑے امرا اور اراکینِ سلطنت حاضر ہوتے تھے۔ ناصر الدین شاہ کے قاتل رضا خاں کرمانی نے اپنے بیان میں اُن کے متعلق کہا تھا کہ

"جس دن وہ درختوں کے نیچے بیٹھے تھے تو وہ لوگوں کو آدمی بنانے میں مصروف رہا کرتے تھے اب تک اُنھوں نے ۲۰ ہزار آدمی بنائے ہوں گے جن کی آنکھوں سے اُنھوں نے پردے اُٹھا دیئے اور وہ سب بیدار ہو گئے اور معاملہ کو سمجھنے لگے"

اُس زمانہ میں جب شیخ نے ایران میں اپنی تحریک شروع کی تو "انقلاب ایران" کے لیے زمین تیار کرنے والے انجمن آبادی ہی تھے۔ اُن کی صحبت میں ہر طبقہ کے لوگ حاضر رہتے تھے۔ شیعہ سنی بابی ارمنی یہودی سب اُن کی تعلیم سے مستفید ہوتے تھے۔

اُس دورِ استبداد کے وہ بہت بڑے حریت پسند اور قوم پرست مجتہد تھے۔ سید جمال الدین سے اُن کے بہت گہرے اور مخلصانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ جب شیخ درگاہ حضرت عبد العظیم میں پناہ گزین تھے تب بھی راتوں کو چھپ چھپ کر شیخ ہادی سے ملنے طہران جایا کرتے تھے۔ رضا خاں جب ناصر الدین شاہ کو قتل کرنے قسطنطنیہ سے طہران آیا تو اُن ہی کے مکان پر مقیم ہوا تھا۔ چنانچہ ناصر الدین کے قتل کے بعد اُن کو ایران سے خارج البلد کر دیا گیا اور وہ شیخ کے پاس قسطنطنیہ آ گئے جہاں اُن کے علم و فضل کی بہت قدر کی گئی۔

شیخ ہادی عوام الناس میں بہت ہر دل عزیز تھے۔ اور اسی وجہ سے دوسرے علما کی ایک جماعت ان کے خلاف رہتی تھی حتیٰ کہ اُن کے خلاف کفر کے فتوے بھی جاری کیے گئے۔ مگر وہ کبھی کسی مخالف کی پروانہ کرتے تھے۔ بہت بے خوف آدمی تھے۔ نہ صرف شاہی خاندان کے ممتاز اراکین مثلاً نایب السلطنۃ اور امین السلطنۃ بلکہ خود بادشاہ بھی کبھی کبھی اُن کے مکان پر حاضر ہوا کرتے تھے۔

اخلاقی حیثیت سے عجیب کیریکٹر رکھتے تھے۔ کسی کا دباؤ نہ مانتے تھے اور کسی کا احسان لینا گوارہ نہ کرتے تھے۔ اور اپنے خیال و وضع میں اِس قدر پختہ تھے کہ اپنی اولاد اور مریدوں کو سوائے اکلِ حلال

کے کچھ نہ کھانے دیتے تھے۔

۷۔ مصطفیٰ کامل

اگست ۱۸۷۴ء میں پیدا ہوئے اُس وقت مصر میں خدیو اسمٰعیل برسرِ حکومت تھا۔ اُن کے والد علی افندی محمد مصری حکومت میں چیف انجینیر تھے۔ اوائل عمر میں مذہبی تعلیم حاصل کی ۱۸۹۵ء میں مشرقی و مغربی تعلیم ختم کی اور پیرس سے قانونی سند لے کر مصر آئے۔ اس کے بعد مصر کی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور ایک سیاسی جماعت احرار قایم کی اس وقت ملک میں اُن کا رسوخ و اثر بہت تھا۔ اور سلطان ترکی بھی اپنے مخصوص مصالح کی بنا پر در پردہ اُن کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ مصطفیٰ کامل مصر میں برطانوی "دخل" کے سخت خلاف تھے۔ اور اس میں کلام نہیں کہ مصری احرار کی جماعت کو اُنھوں ہی نے منظم و مستحکم کیا۔ یہی وہ جماعت تھی جس سے شیخ نے کام لیا تھا اور اِسی سلسلہ کے سب سے بڑے لیڈر بعد کو سعد زاغلول قرار پائے۔ مصطفیٰ کامل بہت با اثر مقرر اور بہت تیز قلم اخبار نویس تھے۔ انھوں نے اخبار نویسی کے ذریعہ سے بہت کچھ کام کیا اُن کا انگریزی اخبار Egyptian Standard انگریزوں کا سخت مخالف تھا اُس کے علاوہ دو عربی جرائد مجلہ الدر اور اللوآ مصر میں بہت مقبول ہوئے اُن کا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے مصر کی عام آبادی میں جمال الدین اور اعرابی کی تحریکات کو پوری طرح کامیاب بناکر مصری عوام کے اندر ایک عام بیداری پیدا کردی

حتیٰ کہ مصر کے بہت سے اکابر اور امرا بھی اُن کی تحریک میں شریک ہو گئے۔ ۱۹۰۵ء میں انتقال ہو گیا۔ اُن کی دو کتابیں بہت مشہور ہیں۔ "فتح اندلس" اور "اعجب ما کان فی الرق عند الرومان"۔

۷۔ خیر الدین پاشا۔

چرکسی نسل سے تھے۔ پہلے تونس میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے مگر صادق پاشا والی تونس سے جھگڑا ہو گیا لہٰذا پیرس چلے گئے۔ ۱۸۷۷ء میں سلطان عبدالحمید خاں نے پھر اُن کو قسطنطنیہ میں بلایا اور کونسل آف اسٹیٹ کے صدر بنا دیے گئے ۱۸۷۸ء میں روسی و ترکی کے جنگ کے خاتمہ کے بعد وہ وزارتِ عظمیٰ کے عہدہ پر فائز کیے گئے۔ لیکن چند روز بعد علما کی جماعت سے اُن کا جھگڑا ہو گیا چنانچہ وزارت سے برطرف کر دیے گئے اپنے زمانہ میں وہ اصلاح طلب جماعت کے بہت با اثر رکن تھے ۱۸۸۹ء میں بمقام قسطنطنیہ انتقال ہو گیا۔

۸۔ امیر عبدالقادر ۱۸۰۷ء تا ۱۸۸۳ء۔

اُن کے والد محی الدین شمالی افریقہ میں اپنے زہد و اتقا کے لئے مشہور تھے۔ جوانی میں باپ کے ساتھ حج کرنے گئے اور بعد میں شیخ عبدالقادر جیلانی کی درگاہ پر حاضر ہوئے۔ جب فرانس نے الجیریا پر قبضہ کرنا شروع کیا تو عبدالقادر مکارا میں الجزائر کے امیر منتخب کر لئے گئے۔ ۱۵ برس تک وہ فرانس کی فوجوں کا مقابلہ کرتے رہے ۱۸۴۸ء تک اُن کو کامیابی ہوتی رہی لیکن

بعدکو فرانس نے بعض قبائل کو رشوت دے کر اپنے ساتھ ملالیا اور اس طرح عبدالقادر کی قوت کمزور ہوگئی چنانچہ ۲۱ر دسمبر ۱۸۴۷ء کو سیدی ابراہیم کے مقام پر اُنھوں نے پسپا ہوکر اپنے کو فرانسیسی فوج کے حوالہ کر دیا۔ اُن سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اُن کو اسکندریہ جانے کی اجازت دیجائے گی مگر حوالگی کے بعد فرانس نے وعدہ خلافی کی اور ۱۸۵۲ء تک وہ فرانس میں قید رکھے گئے اُس کے بعد نپولین ثالث نے اُن سے وعدہ لے کر کہ وہ الجیریا کے معاملات میں دخل نہ دیں گے اُن کو رہا کر دیا۔ رہائی کے بعد وہ کچھ عرصہ بروسہ میں رہے اور پھر دمشق میں مستقلاً مقیم ہوگئے ۱۸۶۵ء اور ۱۸۶۷ء میں وہ دو دفعہ پھر یورپ آئے قبیلہ دروز کی بغاوت کے سلسلہ میں انھوں نے فرانس کی کچھ امداد کی جس کے صلہ میں فرانسیسی حکومت نے چار ہزار پونڈ سالانہ اُن کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ ۲۶ر مئی ۱۸۸۳ء کو دمشق میں وفات پائی۔

امیر عبدالقادر ۱۹ ویں صدی عیسوی کے اُن ابتدائی مجاہدین میں سے تھے جنھوں نے مشرق پر مغرب کی دست درازی کا مقابلہ کیا۔ زندگی کے آخری زمانہ میں اُن کو تنگ دستی نے فرانس کے دستِ کرم کا احسانمند ہونے پر مجبور کر دیا لیکن اُن کی ابتدائی خدمات اتنی ہیں کہ آخری زمانہ کی یہ ایک لغزش نظر انداز کی جا سکتی ہے۔ بحیثیتِ مجموعی وہ اسلامی حریت و عصبیت کے بہت ممتاز داعی تھے۔ وہ جمال الدین کی تحریک کے سلسلہ کی ابتدائی کڑی تھی۔

۹ - محمد بن عبد الوہاب

بیل Beal نے اپنی کتاب Oriental biaographical dictionary میں سن ولادت ۱۷۰۰ء لکھا ہے لیکن ایک دوسری روایت کے مطابق صحیح سنہ ۱۶۹۱ تھا۔ مدینہ منورہ بصرہ اور دمشق میں تعلیم پائی۔ مذہب حنبلی تھا۔ اُن کے عقاید پر زیادہ اثر ابن تیمیہ کی تعلیمات کا تھا۔ شروع میں جب اُنھوں نے عرب قبائل کے سامنے اپنے عقاید پیش کیے تھے تو اِن عقاید کی اس قدر شدید مخالفت کی گئی کہ آخر اُن کو محمد بن سعود سلطانِ نجد کے یہاں دراعیہ میں پناہ لینی پڑی۔ اُن کی تعلیمات کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے۔

(۱) صرف قرآن کی تعلیم کے مطابق اسلامی عقاید کا استحکام ہونا چاہیے۔
(۲) عثمانی یا کسی دوسری خلافت کو قبول نہ کرنا چاہیے۔
(۳) درویشوں اور فقرا کا کوئی غیر معمولی احترام نہ کیا جائے۔
(۴) نماز روزہ اور حج وغیرہ کی سختی سے پابندی کی جائے۔
(۵) شراب تمباکو جوا جادو ریشم اور سونا یہ سب ممنوع ہیں۔
(۶) مقبرے اور پختہ قبریں نہ بنائی جائیں۔
(۷) خدا کی تمام صفات صرف اُسی کے لیے مخصوص سمجھی جائیں۔ اور کسی اِنسان کو اُس میں شریک نہ بنایا جائے۔
(۸) پیغمبروں کو محض اِنسان سمجھا جائے اور صفاتِ ربانی سے اُن کی ذات کو نسبت نہ دی جائے۔
(۹) جو چیزیں خدا کے قبضہ میں ہیں وہ غیر سے طلب نہ کی جائیں۔

وغیرہ وغیرہ۔ ۱۷۴۵ء میں محمد بن سعود نے عبدالوہاب کے عقاید کو قبول کرلیا اور وہ نجد کے پہلے وہابی امیر تھے اُس کے بعد اُن کے تمام جانشین وہابی ہوتے رہے۔ محمد بن سعود کے بیٹے عبدالعزیز بن سعود نے تمام نجد میں اپنی کامل حکومت قایم کرلی اور عراق وغیرہ کی طرف بھی پیش قدمی شروع کردی۔ ایک عرصہ تک نجدیوں اور سلطانی فوجوں سے مقابلے ہوتے رہے۔ کربلا۔ مکّہ۔ عراق۔ دمشق وغیرہ پر نجدیوں نے کامیاب حملے کیے۔ اور باوجود سخت کوشش کے عرب میں اُن کے گروہ کو سلطانی فوجیں فتح نہ کرسکیں۔ مگر وہابی تحریک کے متعلّق یہ خیال صحیح نہیں کہ وہ تحریک اتحاد اسلام کے طرح کوئی سیاسی تحریک تھی۔ درحقیقت وہ ایک خالص مذہبی اور فرقہ وارانہ تحریک تھی جہاں کہیں وہ تحریک جدید تمدن اور علوم سے ٹکرائی تو کامیاب نہ ہوسکی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ وہابیت میں دوسروں کے عقاید کے ساتھ رواداری کا عنصر بہت کم موجود تھا۔ کربلا اور مکّہ و مدینہ میں اُن کے تشدد نے شیعہ اور دیگر اسلامی فرقوں کو اُن کا سخت مخالف بنادیا تھا اور واقعہ یہ ہی کہ اِس تحریک نے بجائے اتحاد پیدا کرنے کے دنیائے اسلام میں فرقہ وارانہ افتراق کو زیادہ کردیا۔ ہندوستان میں صرف ایک جماعت عبدالوہاب کی تعلیمات سے متاثر ہوئی تھی اور یہ حضرت اسمٰعیل شہید کی جماعت تھی جو عرصہ تک سکھوں کے خلاف جہاد کرتے رہے۔

۱۰۔ امام سید محمد بن علی بن السنوسی الخطابی الحسینی الادریسی المہاجری۔
فرقہ سنوسیہ کے بانی اور ۱۹ ویں صدی عیسوی کے بہت بڑے اسلامی مجاہد تھے۔ ۱۸ ویں صدی کے آخر یا ۱۹ ویں صدی کے شروع میں پیدا ہوئے تاریخ پیدائش میں اختلاف روایات ہے۔ چنانچہ سنہ ولادت ۱۷۹۱-۹۲ء، ۱۷۹۶ء اور ۱۸۰۰ء بھی بتایا جاتا ہے۔ الجزائر میں پیدا ہوئے تیس سال کی عمر تک وہاں مذہب کی اصلاح کا وعظ کہتے پھرے پھر ٹیونس اور طرابلس گئے پھر قاہرہ آئے۔ قاہرہ میں اُن کے معتقدین کی تعداد بہت ہو گئی لیکن علمائے ازہر نے مخالفت کی اس لیے مکّہ چلے گئے جہاں ابو قیس میں مکّہ کے قریب اپنا دائرہ قایم کیا اور محمد بن ادریسی کی تحریکات میں شریک ہو گئے اسی زمانہ میں نجد کے وہابیوں سے بھی کچھ تعلقات پیدا ہو گئے لیکن اِس بنا پر مکّہ کے علما اُن سے بدگمان ہو گئے چنانچہ وہ سوڈان چلے گئے جہاں امیر سوڈان اور حاکم وادی اُن کے معتقد تھے۔ سوڈان میں اُن کی تعلیمات بہت مؤثر ہوئیں۔ ۱۸۴۳ء میں ورنا کے پہاڑوں میں دائرے کے نام سے ایک جماعت قایم کی وہاں معززین طرابلس اور مراقشی مسلمانوں پر بہت اثر قایم ہو گیا۔ لیکن ترک اُن کے بڑھتے ہوئے اثر کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے اس لیے انھوں نے ۱۸۵۵ء میں اپنا دائرہ سیوا کے قریب بنایا۔ امام سیّد محمد کا ۱۸۵۹ء میں انتقال ہو گیا اُن کے بعد اُن کے بیٹے مہدی جانشین ہو گئے گو وہ بہت کم عمر تھے لیکن دائرہ کا اثر اب مراقش سے قسطنطنیہ اور ہندوستان تک قایم ہو چکا تھا۔ مہدی سوڈانی نے چاہا کہ وہ اُن کے خلیفہ

بن جائیں لیکن انھوں نے قبول نہ کیا جب سلطان عبدالحمید خاں نے دیکھا کہ بن غازی اور طرابلس میں ترکی گورنروں سے زیادہ سنوسی دائرہ کا اثر قایم ہی تو وہ بہت متردد ہوئے اسی زمانہ میں فرانسیسیوں نے طرابلس میں پیش قدمی شروع کی۔

مہدی کے انتقال کے بعد اُن کے بھتیجے احمد الشریف اُن کے جانشین ہوئے اُن کے خیالات پر تحریک اتحاد اسلامی کا بہت اثر پڑا اور انھوں نے اپنے لاکھوں معتقدین میں اس تحریک کی بہت زیادہ اشاعت کی۔

سید جمال الدین اور احمد الشریف سے ملاقات بھی ہوئی تھی (غالباً قسطنطنیہ میں، اور قرائن یہ ہیں کہ جمال الدین سے ملاقات کرنے کے بعد ہی سنوسی تحریک نے تحریک اتحاد اسلامی کا رنگ اختیار کیا) سنہ ۱۹۱۱ء سے سنہ ۱۹۱۲ء تک سنوسی جماعت اطالیوں سے لڑتی رہی اور اس جنگ میں اُن کی جمعیت کو بہت نقصان پہنچا۔ سنوسی اخوان کے عقاید وہابیوں کے عقاید سے کچھ زیادہ مختلف تو نہیں ہیں مگر اس فرقہ کے اندر تشدد اور سختی نہیں ہی اور اسی وجہ سے سنوسی تحریک عالم اسلام میں وہابی تحریک سے زیادہ مقبول ہوسکی۔ سنوسی عقاید کم و بیش مالکی فرقہ کے عقاید ہیں۔ وہ قرآن اور حدیث کو تفسیروں سے قطع نظر کرکے مانتے ہیں۔ اور رائج الوقت تفسیروں اور حاشیوں کے پابند ہونا نہیں چاہتے۔ مصری علمانے ان پر تحریف عقاید اسلامی کا الزام لگایا لیکن واقعہ یہ ہی کہ سنوسیوں کی جماعت ایک تبلیغی اور مشنری جماعت ہی۔

اور اُس کا سب سے بڑا مقصد اشاعت اسلام ہو اسی کے ساتھ یہ تحریک جمال الدین کی تحریک اتحاد اسلام سے متاثر ہوگئی اِسی لیے ۱۹۱۱ء کی جنگ طرابلس کو اگر تحریک اتحادِ اسلام کی ایک تاریخی کڑی کہا جائے تو بیجا نہیں۔

۱۱- الازہر

مارچ ۹۷۰ء میں ایک عبادت گاہ قاہرہ میں تعمیر ہوئی جس میں پانچ سال بعد درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا اور اُس وقت سے آج تک جاری ہو۔ فاطمی سلاطین مصر کو جامعہ سے خاص دلچسپی تھی اور اُن کے زمانہ میں اُس نے بہت ترقی کی۔ خلیفہ العزیز بن المعز نے جامعہ کے لیے ایک بڑا کتب خانہ وقف کیا۔ سلطان صلاح الدین کے قبضہ مصر کے بعد تقریباً ایک صدی تک ازہر کی تعلیمی تحریک مردہ رہی اور اُس کے بجائے مسجد الحاکم تعلیمی مرکز بن گئی مگر ۱۲۶۶ء ہجری میں ازہر کی تعلیمی تحریک پھر زندہ ہوئی اور اُس کا اثر و اقتدار بہت بڑھ گیا۔ ملک کے سیاسی معاملات میں بھی علمائے ازہر کی آواز مقتدر اور با اثر ہوگئی چنانچہ ۱۵۰۱ء میں فالفوالغوری کو مصر کا سلطان علمائے ازہر نے منتخب کیا۔ ۱۷۹۸ء میں جب نپولین مصر آیا تو اُس نے سب سے پہلے ازہر کے شیخ اعظم سے ملاقات کی۔ ۱۸۰۵ء میں ازہر کے علما نے محمد علی کو خدیو بنایا۔ اِسی طرح ۱۸۹۵ء تک ازہر حکومت کے اثر سے آزاد بلکہ ایک حد تک اُس پر حاوی رہتا تھا مگر اس کے بعد خدیو نے

علما کی ایک کمیٹی قایم کرکے اُس کے انتظامی اور تعلیمی حالات کی جانچ کرائی اور ۱۸۹۶ء میں جامعہ کے متعلق ایک قانون بنا دیا گیا۔ بہر حال جامعہ ازہر تقریباً ایک ہزار سال تک تعلیم اور تعلم کا مرکز بنا رہا ہے

۱۲۔ "جان نثاری"

جس زمانہ میں ترکی فوج کسی جدید تنظیم کے ماتحت نہ تھی تو اوّل سلطان ارخاں نے ترکمانوں کی ایک فوج مرتب کی مگر وہ فوجی ضبط و نظم کا تحمل نہ کرسکی اس لیے ۱۳۳۰ء میں یہ تجویز کی گئی کہ ہر سال کچھ عیسائی نوجوان اُن کے والدین سے لیے جاتے تھے اور اُن کو تربیت دیکر فوج میں داخل کیا جاتا تھا اِس فوج کا نام " فوجِ نو " تھا شروع میں اِس فوج کی تعداد ۲۰ ہزار سے زیادہ نہ تھی مگر بعد کو ۱۵۹۱ء میں اُس کی تعداد پچاس ہزار کے قریب ہوگئی اور اس کو مخصوص حقوق دیتے گئے۔ مگر سلطان ابراہیم کے زمانہ میں تعداد گھٹا کر ۱۰ ہزار کر دی گئی۔ کچھ روز بعد پھر اس تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہوا اور ۱۸۳۶ء میں ایک لاکھ ۳۵ ہزار ہوگئی۔

امن کے زمانہ میں اِن سپاہیوں کو تنخواہ نہیں ملتی تھی صرف جنگ کے زمانہ میں ملتی تھی۔ امن کے زمانہ میں ہر سپاہی کوئی نہ کوئی پیشہ کرکے اپنی روزی کماتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس فوج کی قوت میں بہت اضافہ ہوگیا۔ حتیٰ کہ وہ معاملات حکومت میں دخیل ہوگئی۔ سلطان احمد خاں کی ۲۸ سالہ عہدِ حکومت میں

انھوں نے ۱۴۰ مرتبہ حکام سے ناراض ہو کر قسطنطنیہ میں آگ لگائی اور بلوہ کیا۔ ایک دفعہ انھوں نے وزیر اعظم کے محل پر حملہ کرکے اُس کو تباہ کر ڈالا آخر کار سلطان محمود ثانی نے اُن کا قلع قمع کرنے کا تہیہ کر لیا۔ ۱۸۲۵ء میں ایک منظم فوج بھرتی کی گئی۔ مگر جان نثاروں کو نئی فوج کا بھرتی کیا جانا بہت ناگوار ہوا۔ انھوں نے بغاوت کر دی۔ اُس وقت سلطان نے پیغمبر کا جھنڈا نکال کر جہاد کا اعلان کر دیا اور سخت لڑائی کے بعد وہ لوگ گھبرا گئے اُن میں بہت سے مارے گئے کچھ گرفتار ہوئے اور کچھ جو اپنی بارگوں میں موجود تھے وہیں بارگوں میں آگ لگا کر جلا دیئے گئے۔

۱۳۔ ریاض پاشا

ایک چرکسی خاندان سے تھے مگر یہودی سمجھے جاتے تھے خدیو اسمٰعیل کے زمانہ میں کمیشن مالیات کے نائب صدر بنائے گئے ۱۸۷۰ء میں وزیر داخلہ مقرر کئے گئے لیکن زیادہ عرصہ نہ ٹھہر سکے مصر چھوڑ کر چلے گئے۔ اسمٰعیل کے معزول ہونے کے بعد برطانوی سفارت خانہ نے اُن کو پھر بلا لیا اور وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ وہ اعرابی کے سخت مخالف تھے اور انگریزی سفارت خانہ میں بہت مقبول تھے۔ اُن کی رائے یہ تھی کہ مصری قوم آزاد حکومت خود اختیاری کے قابل ہی نہیں ہے۔ عباس دویم کے زمانہ میں بھی چند روز وزیر اعظم رہے۔ اپریل ۱۸۹۲ء میں استعفٰے دیکر کنارہ کش ہو گئے باوجودیکہ انگریز اُن سے خوش تھے مگر خدیو اسمٰعیل ناخوش رہتا تھا تعجب ہے کہ شیخ سے اور ریاض پاشا سے

اچھے تعلقات کیونکر قایم رہے غالباً وہ شیخ کے محض علم و فضل کا یقین ہوا ہوگا یا خدیو اسمٰعیل سے دونوں کی نفرت ایک حد تک اشتراک خیال کا باعث ہوئی ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ اُس کا مصری قوم پرستوں کی جماعت سے کوئی تعلق نہ تھا۔

۱۴- ادیب اسحٰق

۲۱ر جنوری ۱۸۵۶ء کو دمشق میں پیدا ہوئے اور کم و بیش ۱۴ سال کی عمر میں ایک ہزار سے زیادہ اشعار کہہ چکے تھے۔ بلا کے ذہین اور صاحب فہم تھے ادبی ذوق بہت بلند اور وسیع تھا تعلیم مکمل نہ ہوئی تھی کہ اُن کو فکر معاش میں مبتلا ہونا پڑا۔ ۱۵ سال کی عمر میں وہ بیروت چلے گئے اور وہاں کی علمی صحبتوں میں عزت کی نظر سے دیکھے جانے لگے۔ کچھ عرصہ بعد سرکاری ملازمت ترک کرکے جریدہ "التقدم" کی ادارت اپنے ہاتھ میں لے لی اور اب اُن کے زورِ قلم کے چرچے عام ہوگئے اس عرصہ میں علاوہ چند تصانیف کے فرانسیسی قونسل کی فرمایش پر ایک مشہور فرنچ ڈرامہ کا ترجمہ عربی میں شایع کیا۔ یہ ڈراما عربی زبان میں جب اسٹیج پر آیا تو ادیب اسحٰق کا نام ہر بچّہ کی زبان پر آنے لگا اسی کے بعد وہ انجمن "زہرۃ الادب" کے صدر منتخب ہوگئے وہ اول اول مصر میں ایک ادیب اور اہلِ قلم کی حیثیت سے آئے۔ اسکندریہ میں اُن کے ڈرامے کھیلے جاتے تھے اور قاہرہ کی اعلیٰ صحبتوں میں وہ عزت کے ساتھ شریک کئے جاتے تھے۔ اُسی زمانہ میں سید جمال الدین

مصر آگئے تھے۔ ادیب اسحٰق جب قاہرہ پہنچے تو جاتے ہی شیخ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ شیخ کے فیض صحبت کا یہ اثر تھا کہ اب انھوں نے مصر میں آزاد اخبار نویسی اختیار کی اور ۱۸۷۷ء میں اپنا پہلا عربی اخبار مصر کے نام سے جاری کیا۔ جامعہ ازہر میں شیخ جو لکچر دیا کرتے تھے اُن کو ادیب اسحٰق اپنے اخبار مصر میں شایع کیا کرتے تھے۔ کمال یہ تھا کہ اخبار کے لیے اُن کے پاس کوئی سرمایہ نہ تھا جب انھوں نے مصر کا پہلا پرچہ شایع کیا تو اُن کی جیب میں ۲۰ فرانک (گیارہ روپے آٹھ آنے) سے زیادہ نہ تھے۔ لیکن شیخ کی صحبت نے اُن کو تمام مشکلات سے بے پروا ہونا سکھا دیا تھا اور انتہائی تنگدستی کی حالت میں بھی اُن کا ارادہ کمزور نہ تھا۔ اخبار مصر چند ہی روز میں اس قدر مقبول ہوا کہ مالی دشواریاں سب رفع ہوگئیں کچھ عرصہ بعد انھوں نے ایک دوسرا روز نامچہ "التجارہ" کے نام سے جاری کر دیا۔ اِن جراید کا جو اثر ملک کے تمام حالات پر مرتب ہوا اس کو صاحب "مشاہیر الشرق" اِن الفاظ میں بیان کرتا ہی۔

"پبلک میں ایک قسم کی حرکت اور بیداری پیدا ہونے لگی بات چیت اور اظہار خیالات میں حریت اور آزادی کا رنگ جھلکنے لگا۔ جمود اور بے حسی کے بادلوں میں جنبش اور اضطراب کی بری انگڑائیاں لینے لگی۔ اگرچہ یہ چیز عام طور پر ایک نوع کی جدّت تھی جس سے قبل ازیں بہت کم دل و دماغ آشنا تھے۔

لیکن سب سے زیادہ حکومت نے اس کو محسوس کیا اور اس کو بہت سے خطرات کا گمان گزرنے لگا۔"

چنانچہ دونوں جراید بحکم سرکار بند کر دیئے گئے۔ اس کے بعد ادیب اسحٰق پیرس چلے گئے اور وہاں سے "القاہرہ" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا "مصر اور التجارہ" سے بھی زیادہ "القاہرہ" مقبول ہوا۔ پیرس میں بیٹھ کر انھوں نے بیداری مصر کے متعلق اپنی پوری قوت صرف کردی اور بجائے اِس کے کہ اُن کے جراید کو بند کرکے حکومت مصر کچھ اطمینان حاصل کرتی اور زیادہ ترددات میں مبتلا ہوگئی۔ لیکن پیرس کی آب و ہوا سے اُن کی صحت بہت خراب ہوگئی اور نمونیا کے ایک شدید حملہ کے بعد اُن کا قیام وہاں بالکل ناممکن ہوگیا۔ چنانچہ وہ پھر مجبوراً بیروت چلے گئے۔ بیروت میں اخبار "استقدام" کے مالک نے پھر اس اخبار کے فرائض ادارت اُن کے سپرد کردیئے۔ ایک سال تک وہ بیروت میں مقیم رہے لیکن ۱۸۸۱ء کے اواخر میں جب وزارت مصریہ میں انقلاب ہوا تو وہ پھر قاہرہ گئے۔ اس مرتبہ "نظارتہ المعارف" میں اُن کو ایک عہدہ دیا گیا اور جریدۃ مصر کے اجرا کی اجازت بھی مل گئی۔ چند روز بعد وہ مصری پارلیمنٹ کے معتمد منتخب ہوگئے۔ اس لیے اخبار کی ادارت انھوں نے اپنے بھائی کی طرف منتقل کر دی لیکن وہ خود بھی اکثر مضامین لکھتے رہتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد جب مصر میں فوجی بغاوت شروع ہوئی تو اُنھوں نے اعرابی پاشا کی تائید کی اور بالآخر اُن کو

بیروت کی طرف بھاگنا پڑا۔ اسکندریہ پر انگریزوں کا قبضہ ہوجانے کے بعد وہ پھر قاہرہ واپس آئے لیکن آتے ہی گرفتار کر لیے گئے اور بعد کو خارج البلد کر دئیے گئے۔

اب تیسری مرتبہ بیروت میں انھوں نے اخبار "التقدم" کی عنانِ ادارت اپنے ہاتھ میں لی لیکن جب سے کہ پیرس میں اُن کی صحت بگڑی پھر کبھی نہ سنبھل سکی اور آخر وہ مجبور ہوکر تبدیل آب و ہوا کے خیال سے پھر اسکندریہ آئے، اس کے بعد لبنان چلے گئے اور وہیں ۱۸۹۵ء میں صرف (۲۹) سال کی عمر میں انتقال کیا۔

مرحوم اسلامی عہدِ جدید کے سب سے بڑے جادو نگار اور جادو بیان تھے۔ مزاج کی حدّت حریت کا جوش ارادوں کی قوت یہ سب چیزیں اُن کے اندر جمال الدین کا ایک صحیح عکس تھیں۔

"کتاب الدرر" مرحوم کے اقوال و مضامین کا ایک مجموعہ ہے جس میں جا بجا شیخ جمال الدین افغانی کا تذکرہ آتا ہے۔

ادیب اسحٰق مفتی عبدہ اور اُن کے اُستاد شیخ کی تعلیمات کا سب سے زیادہ موثر نمونہ تھے۔

۱۵۔ جمیس سنا۔

شیخ کے رفقا میں سے ایک مصری یہودی تھے۔ بلنٹ نے ۱۸۸۳ء میں اُن کے حسب ذیل حالات اپنی کتاب میں لکھے تھے۔

جمیس سنا "عرف ابو نظارہ" آج کل پیرس میں رہتے ہیں۔ وہ اپنا اخبار "ابو نظارہ" شایع کرتے ہیں اور زبانوں کے معلم بھی ہیں۔ وہ مصر کے قوم پرستوں کی جماعت میں شریک ہیں اور (۴۰) سال سے

پیرس میں مقیم ہیں۔ یہاں اخباری دنیا میں وہ عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ آدمی بہت ظریف اور ذہین ہیں اور مصر میں شیخ اور محمد عبدہ کی صحبت میں رہ چکے ہیں۔ اِن ہی دونوں نے سب سے پہلے اُن کو اخبار نویسی کی طرف راغب کیا۔ پہلے انھوں نے مصر سے اخبار نکالا اور خدیو اسمٰعیل کا بہت مذاق اڑاتے رہے۔ آخر وہاں سے نکالے گئے۔ تب پیرس میں قیام کرکے اپنا اخبار جاری رکھا۔ شیخ کی بے تکلف صحبت میں شریک ہوتے تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کے مخلص احباب میں سے تھے۔

۱۶۔ سعد زاغلول (۱۸۶۰ء۔ ۱۹۲۷ء)

مصری فلاحین میں سے تھے ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے۔ ازہر میں تعلیم پائی اور مفتی عبدہ کے خیالات سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اوائل عمر میں ایک سرکاری اخبار کے اڈیٹر مقرر ہوگئے مگر اعرابی کی بغاوت کے سلسلہ میں معتوب ہوئے اور جب برطانوی فوج نے اسکندریہ پر قبضہ کیا تو قید کر دیئے گئے۔ ۱۸۸۳ء میں وکالت شروع کی۔ پھر جج ہو گئے اور پھر ۱۹۰۶ء میں وزیر تعلیم اور ۱۹۱۰ء میں وزیر عدلیہ ہوگئے۔ وزیر عدلیہ کی حیثیت سے انھوں نے خدیو عباس پر غبن کا الزام لگایا۔ اس وقت لارڈ کچنر مصر میں برطانوی نمائندے تھے انھوں نے زاغلول کو استعفیٰ دینے کا حکم دیا۔ اس واقعہ کے بعد سے وہ کھلم کھلا انگریزوں کی مخالفت کرنے لگے۔ ۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد انھوں نے مصر کی آزادی کا مطالبہ شروع کیا چنانچہ ۸ مارچ

۱۹۱۹ء کو گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیئے گئے۔ اُن کی گرفتاری کی وجہ سے مصر میں سخت بلوے ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں آزاد ہو کر پھر مصر آئے مگر پھر چند روز بعد جب انگریزی "دخل" کے خلاف بلوے شروع ہوئے تو اُن کو گرفتار کر کے عدن بھیج دیا گیا۔ ۲۲ء میں الجزائر بھیجے گئے مگر ۲۳ء میں پھر آزاد ہو گئے۔ ۲۴ء میں وزیر اعظم ہو گئے اور اُسی سال برطانوی مدبرین سے سمجھوتہ کرنے کے لیے لندن گئے مگر کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ ۲۴ء میں جب سردار سوڈان سرلی اسٹیک قتل کیے گئے تو زاغلول کے خلاف انگریز بہت برافروختہ ہو گئے اور ان کو وزارت سے استعفیٰ دینا پڑا لیکن چند ہی روز بعد اُن کو مصری پارلیمنٹ نے اپنا صدر منتخب کر لیا۔ قاہرہ میں ۲۳ر اگست ۲۷ء کو انتقال ہوا۔

سعد زاغلول براہِ راست جمال الدین کی تحریک کی ایک کڑی تھے۔ اُنھوں نے جمال الدین کے عقاید اپنے استاد مفتی عبدہ کے حلقۂ درس میں حاصل کئے تھے۔ لیکن خود بھی جوانی کے زمانہ میں پیرس میں شیخ سے ملے تھے اور ان کی صحبت میں کچھ وقت گزارا تھا۔ مصری فلاحین کی بیداری کے متعلق شیخ کی مساعی کا نتیجہ یہی دو نمایاں اشخاص تھے۔ ایک اعرابی اور ایک سعد زاغلول۔

۱۷۔ شریف پاشا

مصر کے مشہور مدبر ۱۸۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ کئی بار وزیر اعظم بنائے گئے اور جب توفیق تخت پر بٹھایا گیا تو اُس وقت وزیر داخلہ اور وزیر خارجہ تھے۔ فرانس میں تعلیم پائی تھی۔ خیالات

زیادہ تر قوم پرستی کی طرف مائل تھے۔ چنانچہ ۱۸۶۶ء میں دستوری اصلاحات کی ایک اسکیم بھی پیش کی تھی مگر خدیو نے اُس کو نامنظور کیا۔ جب توفیق نے چاہا کہ سوڈان کا فیصلہ انگریزوں کے حسبِ منشار کر دیے تو اُنھوں نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی اور اسی بنا پر استعفیٰ دیدیا۔ اعرابی نے اپنی بغاوت کے موقعہ پر یہ مطالبہ کیا تھا کہ شریف پاشا کو پھر وزیر اعظم مقرر کیا جائے۔ مصری قوم پرست ان کی عزت کرتے تھے۔

اُنھوں نے مصر میں سب سے پہلے ایک قومی پارٹی بنائی تھی جس کو برطانوی حکّام پسند نہ کرتے تھے۔ آخری دفعہ وہ ۱۸۸۲ء میں وزیر اعظم بنائے گئے مگر اعرابی پاشا کی شکست کے بعد وہ برطانیہ کی پالیسی سے بیزار ہوکر دست کش ہو گئے اور ۱۸۸۷ء میں انتقال ہوگیا۔

۱۸۔ اعرابی پاشا

احمد اعرابی (۱۸۳۹ء۔ ۱۹۱۱ء) فلاحین کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے ۱۸۶۲ء میں فوج کا کمیشن ملا۔ اُس زمانہ میں مصر کے قوم پرستوں میں یہ تحریک پیدا ہورہی تھی کہ مصری حکومت اور فوج سے ترکی عنصر کو خارج کیا جائے۔ اس تحریک کے لیڈر علی روبی تھے۔ اعرابی بھی اُن کی خفیہ انجمن میں شریک ہوگئے۔ جب اسمٰعیل کی معزولی کے بعد توفیق خدیو بنائے گئے اور فرانس و انگلستان نے مصری حکومت کے اہم شعبوں پر قبضہ کرلیا تو اعرابی نے حکومتِ مصر کی کمزوری اور غیر ملکیوں کی مداخلت کے خلاف آواز بلند کرنی شروع کی۔ اُن کے ساتھ پسِ پردہ اور

بھی بہت سے مصری قوم پرست شریک تھے۔ ۱۸۸۱ء میں اعرابی کے خلاف کورٹ مارشل بٹھایا گیا مگر وہ فوج کے سپاہیوں میں اس قدر ہر دل عزیز تھے کہ فوج اُن کو زبردستی چھڑا کر لے گئی۔ خدیو نے گھبرا کر محمد سامی کو وزیر جنگ بنایا اور کوشش کی کہ کسی طرح اعرابی کو گرفتار کرایا جائے۔ ۸ ستمبر ۱۸۸۱ء کو اعرابی نے قصر عابدین کے سامنے ایک فوجی مظاہرہ کرایا اور خدیو کو مجبور کر کے ریاض پاشا کے بجائے شریف پاشا کو وزیر اعظم بنوایا۔ فوج کی تنخواہوں میں اضافہ کرایا اور دار الامرا کا اجلاس منعقد کرنے کی اجازت حاصل کی۔ اس وقت اعرابی کا اثر و نفوذ اس قدر زیادہ تھا کہ خدیو کی مجال نہ تھی کہ اُن کی خواہش کے خلاف کوئی عمل کرتا۔ چنانچہ ۱۸۸۲ء میں اُن کو معتمد صیغہ جنگ مقرر کیا گیا۔ فروری ۱۸۸۲ء میں جب شریف پاشا نے استعفیٰ دیدیا تو محمد سامی بے جو اعرابی جماعت کے رکن تھے وزیر اعظم بنائے گئے مگر اعرابی کے اس بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر برطانوی حکومت بہت بے چین ہو گئی۔ اور یہ ارادہ کر لیا گیا کہ اب فوجی کارروائی کر کے مصر میں برطانوی "دخل" کو مستحکم کر دینا چاہیئے۔ برطانوی اور فرانسیسی مدبرین کے اس ارادہ کو معلوم کر کے اہل مصر کے اندر سخت ہیجان پیدا ہوا۔ اور اسکندریہ میں کئی دن تک سخت بلوے ہوتے رہے۔ ۱۱ جولائی ۱۸۸۲ء کو برطانوی بیڑے نے اسکندریہ پر گولہ باری کی اور اپنی فوجوں کو ساحل پر اتار دیا۔ بہت کشت و خون ہونے کے بعد بلوہ فرد کیا گیا۔

اور اس کے بعد برطانوی فوج نے طل الکبیر پر اعرابی کی فوج کو شکست دی۔ کہا جاتا ہے کہ اعرابی کی فوج کے بعض افسروں کو رشوت دے کر توڑ لیا گیا تھا۔ دسمبر میں اعرابی پر مقدمہ چلایا گیا اور سزائے موت کا حکم صادر کر دیا گیا۔ یہ مقدمہ مصری قوم کی نظر میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ بلنٹ نے اس موقعہ پر مصری قوم پرستوں کے ساتھ اپنی مخلصانہ ہمدردی کا عملی ثبوت دیا اور اعرابی کی سزا کے خلاف ہر قسم کی کوشش جاری رکھی حتیٰ کہ بہت سا روپیہ اپنی جیب سے خرچ کیا اور اُن ہی کی کوششوں کا یہ نتیجہ تھا کہ اعرابی کی سزائے موت کو جلاوطنی سے بدل دیا گیا۔ وہ سیلون بھیجدیے گئے اور ۲۰ برس تک وہ سیلون میں جلا وطن رہے۔ مئی ۱۹۰۱ء میں خدیو عباس دویم نے ان کو وطن آنے کی اجازت دی اور وہ مصر آگئے۔ ۲۱ ستمبر ۱۹۱۱ء کو قاہرہ میں اُن کا انتقال ہوگیا۔

مصر کی قومی تحریک میں اعرابی کا نام بہت نمایاں ہے گو کہ وہ براہِ راست جمال الدین کی تعلیمات کے زیرِ اثر نہ آئے تھے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کا دامن اُسی تحریک سے بندھا ہوا تھا جو جمال الدین اور مفتی عبدہ نے مصر میں پیدا کی تھی۔ شیخ کے مصر سے چلے جانے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اُن سے اور اعرابی سے براہِ راست تعلقات پیدا ہوگئے تھے۔

اعرابی کی قوم پرستی کے متعلق خود لارڈ کرومر اپنی ایک کتاب میں حسبِ ذیل اعتراف کرتے ہیں:۔

"اعرابی یورپ کی نظر میں جس تحریک کے نمایندے
تھے اس تحریک کے لیڈروں کی نیت کچھ بھی ہو
مگر وہ بلاشبہ ملک کی بدنظمی کے خلاف ایک حقیقی
احتجاج کی صورت تھی" (ModernEgypt)
اعرابی کی سیاسیات خالص ملکی تھیں وہ ترک انگریز۔فرانسیسی اور تمام غیر قومی اور غیر ملکی عناصر کے خلاف تھے اور یہ چاہتے تھے کہ مصر صرف مصریوں کے لیے آزاد رہے۔

۱۹۔ مہدی سوڈانی محمد احمد ابن سید عبد اللہ (۱۸۴۳ء۔۱۸۸۵ء)
مارچ ۱۸۴۳ء میں ایک کشتی ساز کے گھر میں بمقام ڈنگولا پیدا ہوئے۔ خرطوم کے شمال میں بود باش اختیار کی اور خفیہ طریقہ پر دیہاتی آبادی میں ٹیکسوں اور محاصل کے خلاف بددلی پیدا کرنی شروع کی۔ ۱۸۷۰ء میں قاہرہ گئے جہاں اُن کی جمال الدین افغانی سے ملاقات ہوئی اور بیان کیا جاتا ہے کہ آزادی سوڈان کے مسئلہ پر اُن سے اور شیخ سے بہت کچھ مشورہ اور تبادلۂ خیالات ہوا۔ قاہرہ سے واپس آنے کے بعد مہدی نے جنگِ آزادی کا نقشہ بنانا شروع کیا اور بالآخر ۱۸۸۱ء میں اپنے مہدیِ موعود ہونے کا اعلان کردیا۔ سوڈانی ہزار ہا کی تعداد میں ان کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے اور جب مصری فوجیں اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے بھیجی گئیں تو مہدی کی فوج نے اُن کو پے در پے شکستیں دیں۔ ۱۸۸۳ء میں ہکس پاشا کے دس ہزار سپاہی قتل کردیے گئے۔ اُن کے خاص پیرو دغنہ نے مشرقی سوڈان میں

ہل چل مچا دی۔

جس زمانہ میں مصر میں اعرابی کی شورش پیدا ہو رہی تھی تو سوڈان میں مہدی کے معتقدین شدت کے ساتھ جہاد کر رہے تھے ۱۸۸۲ء میں جب برطانوی فوجیں مصر میں داخل ہوئیں تو اس واقعہ نے مہدی کی فوجوں میں سخت غصہ اور جوش پیدا کر دیا۔ ۱۸۸۳ء میں برطانوی حکومت نے مصری حکومت کو حکم دیا کہ سوڈان کا تصفیہ کر دیا جائے مگر جب مصری جنرل عبدالقادر پاشا کو ہدایت کی گئی کہ وہ سوڈان سے مصری حکام اور فوجوں کو واپس لائیں تو انھوں نے اس حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیا۔ تب جنرل گارڈن کو خرطوم بھیجا گیا اور خدیو نے جنرل موصوف کو سوڈان کا گورنر جنرل بنا دیا۔ خرطوم میں گارڈن کو مہدی کی فوجوں نے گھیر لیا اور وہ وہیں مارے گئے اس کے بعد مہدی کا انتقال ہوگیا۔ مگر دغنہ برابر جہاد کرتا رہا ۱۸۹۶ء میں کچنر خرطوم بھیجے گئے اور ان کے مقابلہ میں دغنہ کو ہٹنا پڑا۔ یہ جنگ ۱۸۹۱ء تک جاری رہی لیکن ۱۹ فروری ۱۹۰۰ء کو دغنہ نے آخری شکست کھائی اور اس کے بعد سے مہدی کی تحریک کا تقریباً خاتمہ ہوگیا۔

یہ واقعہ ہے اور شیخ نے خود بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ مہدی کی تحریک میں شیخ کی تحریک کے اکثر کارکن شریک تھے اور فی الحقیقت یہ تحریک آزادی مصر کی وہی ایک تحریک تھی جس کا مظاہرہ مصر میں اعرابی نے کیا تھا۔ مہدی سوڈان کے معاملات سے شیخ کا جو تعلق عرصہ تک قائم رہا اس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چونکہ مصر کے علما عوام کے جوش کو ٹھنڈا کرنے

کے لیے ہمیشہ اس عقیدہ کی تبلیغ کیا کرتے تھے کہ ظہور مہدی سے پہلے جہاد حرام ہے" اس لیے وقتی مصالح کی بنیاد پر مہدی نے اپنے مہدی ہونے کا اعلان کرنا ضروری سمجھا تھا تاکہ جہاد میں مندرجہ بالا عقیدہ سدِ راہ نہ ہو۔ مجاہدین سے جس عہد نامہ پر دستخط کرائے جاتے تھے اُس کی عبارت حسبِ ذیل تھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"ہم نے اپنے آپ کو خدا اور رسول کے لیے بیع کر دیا ہے۔ ہم خدا کی توحید پر استقامت کے ساتھ ایمان لاتے ہیں۔ خدا کی معبودیت میں کسی چیز کو شریک نہیں کریں گے۔ بہتان نہیں باندھیں گے اور معروف کی اطاعت سے روگردانی نہیں کریں گے۔ ہم نے اپنے کو ترک دنیا کرکے تمہارے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ اور جہاد سے نہیں بھاگیں گے"۔

۲۰۔ شاہ عبدالعظیم۔

یہ خانقاہ طہران سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر ہے۔ طہران کے شمال میں کوہِ دماوند کی چوٹیاں نظر آتی ہیں۔ جنوب کی طرف بہت سے پرانے ٹیلے نظر آتے ہیں جو کسی زمانہ میں کربلا کے قافلوں کے راستہ پر نشانِ راہ کا کام دیتے تھے۔ ان ہی کے قریب سرسبز درختوں کے سایہ میں شاہ عبدالعظیم کی

چھوٹی سی بستی ہے اور اُسی کے قریب قدیم شہر رَے کے آثار موجود ہیں۔ ایک زمانہ میں ایران میں بعض مقامات مجرموں کے لیے جائے پناہ سمجھے جاتے تھے۔ اور کوئی مجرم اگر اُن مقامات میں پناہ لے لے تو گرفتار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ ایک قدیم رسم تھی حتیٰ کہ شاہ کا اصطبل بھی ایک جائے پناہ تھا اور اگر کوئی مجرم شاہ کے گھوڑے کی دم پکڑ لے تو وہ بھی گرفتاری سے محفوظ ہو جاتا تھا۔ اسی طرح یہ مشہور درگاہ تھی جہاں مجرم گرفتار نہیں ہو سکتے تھے۔ اِس پناہ کو حالت "بست" کہا جاتا تھا۔

۲۱۔ مرزا رضا خان کرمانی

ایرانی معتقدین میں سے شیخ کے خاص آدمی تھے۔ شیخ کے ساتھ اُن کی عقیدتمندی کا حال ان کے بیان سے جو گزشتہ صفحات میں درج ہے واضح ہوتا ہے۔ پہلے تمباکو کے ٹھیکہ کے خلاف جو بلوے ہوئے اُن کے سلسلہ میں گرفتار کیے گئے۔ اُن کے والد کا نام ملا حسین عرف بہ ملا حسین بدر تھا۔ تمباکو کے بلوہ میں گرفتاری کے بعد اُن کی تمام جائداد ضبط کر لی گئی اور بعض عمالِ حکومت نے اُن پر سخت مظالم کیے۔ ایک موقعہ پر مرزا کو اس قدر مارا پیٹا گیا کہ اُنھوں نے تنگ آکر اپنے پیٹ میں چاقو مار لیا۔ عرصہ تک جیل خانہ میں بند رہے پھر قسطنطنیہ میں شیخ کے پاس چلے گئے اور وہاں سے آخر دفعہ طہران آکر یکم مئی ۱۸۹۶ء کو ناصرالدین شاہ کو قتل کر ڈالا۔

۲۲- ارنسٹ رینان - (۱۸۲۳ء-۱۸۹۲ء)

مشہور فرانسیسی فلاسفر و مستشرق، ابتدائی تعلیم زیادہ تر مذہبی ہوئی تھی۔ اور طبیعت کا رجحان بھی یہی تھا۔ مگر ۱۸۴۸ء میں انقلاب فرانس کا طبیعت پر بہت اثر ہوا۔ اسی زمانہ میں ایک کتاب مستقبل سائنس Future of Science لکھی۔ ۱۸۴۹ء میں فرانسیسی حکومت نے مختلف سائنٹفک تحقیقاتوں کا کام اُن کے سپرد کیا وہ اکثر Journal deba میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ ۱۸۵۲ء میں انھوں نے اپنی مشہور کتاب Avarroes لکھی جس میں انھوں نے ابن رشد اور اُن کے فلسفہ سے بحث کی۔ اس کتاب کی وجہ سے اُن کو علمی اعزاز دیا گیا۔ اُن کا فلسفہ یہ تھا کہ خوشحالی کے مقابلہ میں کوئی چیز بھی کم قیمت نہیں اکثریت کا زیادہ سے زیادہ فائدہ محض ایک دھوکہ دینے والا اصول ہے اور اُن کا دعویٰ یہ تھا کہ انسان محض خوشحال ہونے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ ہر روز اُس کو یہ محسوس کرنا چاہیئے کہ وہ گزرے ہوئے دن سے کچھ آگے بڑھ کر ایک منتہائے خیال پیدا کرتا ہے بعد کو Origine of Chemistry میں کلدانی اور یونانی زبان کے پروفیسر ہوگئے لیکن پادریوں نے اُن کے تقرر کی اِس بنا ء پر مخالفت کی کہ اُن کے مذہبی عقائد خراب تھے۔ مگر بادشاہ ان سے بہت خوش تھا۔ ۱۸۶۰ء میں وہ ملک کے باہر علمی تحقیقات کرنے کے لیے بھیجدیئے گئے۔ واپس آکر وہ پھر کالج میں پروفیسر ہو گئے۔ لیکن پہلے ہی لیکچر میں انھوں نے مسیح کو ایک عدیم المثال انسان کے الفاظ سے یاد کیا جس سے کیتھولک

پارٹی بہت برافروختہ ہوئی اور اِس لکچر کو قابلِ اعتراض قرار دیکر اُن کو معطل کر دیا گیا۔ اِس کے بعد وہ محض اپنے قلم سے معاش پیدا کرنے لگے۔ انھوں نے قدیم مسیحی مذہب کے نظریات کے پرخچے اُڑا دیے اور اپنے مباحث میں عقل و درایت کو حکم قرار دیا جس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اُن کو اسلام کے خالص اصول توحید کو قبول کرنا پڑا۔

مذہب اور فلسفہ کے متعلق وہ بہت آزاد خیال تھے لیکن اسلام کے متعلق اُن کی رائے بحیثیت مجموعی اچھی نہ تھی۔

تاہم وہ اسلامی عمومیت کے نظم سے بہت متاثر ہوگئے تھے۔ چنانچہ ایک موقعہ پر اُنھوں نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ:
"اپنی زندگی میں جب کبھی میں مسلمانوں کی مسجد میں داخل ہوا ہوں میں نے اپنے اندر اسلام کی طرف ایک خاص کشش محسوس کی ہے بلکہ مجھے اپنے مسلمان نہ ہونے پر افسوس ہوا ہے"

ابن رشد کے فلسفہ سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوے تھے۔ چنانچہ اپنے ایک مضمون میں انھوں نے لکھا ہے:-

ہمارے پاس ابن رشد کو ایک مخلص مسلمان نہ تسلیم کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ اسلام کے متعلق جو کچھ تھوڑی بہت معلومات ہمیں حاصل ہیں اُن کو اسلام کے خالص عقاید اور تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں اور خود اسلام بھی اِن باتوں کو غیر معمولی اور لغو قرار دیتا ہے۔ اسلام کے عقاید تو نہایت صاف ستھرے

اور صحیح خیالات کا مجموعہ ہیں"
اُن کا اور سید جمال الدین کا عرصہ تک علمی مقابلہ ہوتا رہا۔
اُن کا یہ مشہور مقولہ تھا کہ "مذہب اور علم کا اتحاد اتنا ہی ناگزیر ہے جس قدر کہ دنیا کی زندگی جس کے لیے وہ باعثِ افتخار ہیں"
ان کی تصانیف میں Origine of Chemistry اور تاریخ بنی اسرائیل بہت مشہور ہیں۔
۱۲ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو انتقال ہو گیا۔

۲۲- مرزا باقر ایرانی

ایران میں پیدا ہوئے۔ ہندوستان۔ چین۔ بخارا۔ انگلستان اٹلی و فرانس کا سفر کیا۔ بغداد و عراق ہو کر لندن گئے۔ وہاں کچھ دنوں رہنے کے بعد بیروت آئے یہاں شادی کر لی اور تین سال تک مقیم رہے اس کے بعد ترکی حکومت کے خلاف کسی سیاسی سازش میں متہم ہونے کی وجہ سے طہران چلے آئے اور وہیں انتقال کیا۔ عملی سیاسیات میں بہت کم حصہ لیتے تھے مگر یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ مذہبی اختلافات دنیا سے مٹ جانے چاہئیں۔ بغیر اس کے ترقی نہیں ہو سکتی۔
پروفیسر براؤن مرحوم کے استاد تھے۔ براؤن نے اُن کے صاحبزادے مرزا محمد ابن باقر مدیر "مجلۃ المقتدر" کو ایک خط میں لکھا تھا کہ
"میری اُن کی (مرزا باقر کی) پہلی ملاقات ۱۸۸۲ء یا ۱۸۸۳ء میں ہوئی تھی میں نے اُن سے قرآن مجید کا درس لیا اور فارسی زبان میں خود اُن کی منظوم تفسیر اُن ہی سے پڑھی اُن کی دوسری تصنیف

"شمسیہ لندنیہ" ابھی شایع نہیں ہوئی ہی۔ بہت مشکل کتاب ہی۔ اس کے اشعار بہت دقیق ہیں۔ مرحوم کو علوم دینیہ اور السنہ قدیم میں خاص درجہ کمال حاصل تھا۔ عربی۔ یونانی۔ انگریزی۔ فارسی اور ہندی کے عالم و ماہر تھے۔ پرنس ملکم خاں پر اُن کا بہت اثر تھا۔"

جس زمانے میں پیرس سے "عروۃ الوثقیٰ" جاری تھا تو مرزا باقر لندن میں تھے اور وہاں سے عُروۃ الوثقیٰ کے لیے مضامین اور خبریں بھیجا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ تک بلنٹ کے سکریٹری بھی رہے۔

۲۴۔ ملکم خاں

اصفہان کے ارمنی النسل باشندے تھے۔ ابتدائی زندگی میں طہران کے ایک مدرسہ میں مدرس تھے۔

پھر ترقی کرتے کرتے لندن میں ایرانی سفیر مقرر ہوئے۔ اس زمانہ میں جب کہ وہ لندن میں تھے انھوں نے کوشش کی کہ شاہِ ایران کو نظمِ سلطنت کی اصلاح پر آمادہ کریں۔ مگر بجائے اس کے کہ اُن کا مشورہ قبول کیا جاتا وہ معتوب ہو گئے اور انھوں نے سفارت کے فرائض سے سبکدوشی حاصل کرکے ایران میں اصلاح اور آزادی کی تحریکات پیدا کرنی شروع کیں۔ ۱۸۹۰ء میں انھوں نے لندن سے ایک اخبار جاری کیا جس کا نام "قانون" تھا۔ اس اخبار کو خفیہ ذرایع سے ایران میں تقسیم کراتے تھے۔ اسی زمانے میں شیخ سے ملکم خاں کے تعلقات بہت گہرے ہو گئے۔ "قانون" کے صفحات پر شیخ کے مضامین بھی شایع ہوا کرتے تھے جن میں بہت شدت کے ساتھ شاہ ایران پر حملے کئے جاتے تھے۔ ملکم خاں زیادہ ایسے

اصلاحی مضامین لکھتے تھے جن کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ ایرانیوں میں آزاد خیالی پیدا ہو اور وہ توہمات اور پیر پرستی سے نجات پائیں۔ مثلاً قانون کی ایک اشاعت میں اُنھوں نے اس طرح اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی تھی کہ :-

"پیغمبری کی روح ایسے نیکوکار اور قابل لوگوں کے مقاصد میں رہتی ہے جو چاہتے ہیں کہ وطن پرستی کے ذریعہ سے اپنی قوم کو برتر بنائیں ..... بلاشبہ جس شخص نے تار اور ریلوے انجن ایجاد کیا اس کا کام خدا کے نزدیک اُن فقیروں کے اعمال سے زیادہ پسندیدہ ہے جو زہد و اتقا کے ایک غلط تخیل کے ماتحت اپنے جسموں کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔"

ملکم خاں ہی کے زیر اثر سب سے پہلے دو ایرانی فری میسن لاج بھی قائم ہوئے۔

۲۵۔ عثمان دغنہ

مہدی سوڈانی کی جماعت کے بہت نامور مبلغ اور مشرقی سوڈان میں ان کے سپہ سالار تھے۔ انھوں نے مشرقی سوڈان میں آتشِ انقلاب مشتعل کی اور بہت سخت اور طویل محاصرہ کے بعد مصری گورنر توفیق بک کو قتل کرکے شہر سکات پر قبضہ کرلیا مہدی سوڈانی کی انقلابی تحریکات میں دغنہ نے ہمیشہ بہت نمایاں حصہ لیا۔

شہر سواکن میں پیدا ہوئے (۱۸۴۰ء) وہ دیاربکر کے ایک کردی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مہدی کی انقلابی تحریک

کے شروع ہونے سے پہلے وہ تجارتی کاروبار میں مشغول رہتے تھے ۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۱ء تک وہ مشرقی سوڈان میں مہدی کی فوجوں کے سپہ سالار رہے اور ۱۹۰۱ء تک لارڈ کچنر کی فوج کا مقابلہ کرتے رہے۔ اس انقلابی تحریک میں اُن کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ سات برس تک انھوں نے سواکن اور بربر کے درمیان دشمن کا راستہ بند رکھا اور اسلیب کے مقام پر مصری فوج کو سخت شکست دی (۱۸۸۳ء)۔ پھر طاریب پر مصری فوج کو تباہ کر دیا اس کے ایک سال بعد بیکر پاشا کی فوج کو شکست دی۔ ۱۸۹۱ء میں اُن کو اسمتھ پاشا نے شکست دی اور اس کے بعد وہ پہاڑوں میں پناہ گزیں ہوگئے۔ لیکن جب ۱۸۹۷ء میں لارڈ کچنر نے بربر پر قبضہ کرلیا تو عثمان پھر میدان میں آگئے مگر مہدوی فوج کی شکست کے ایک سال بعد (۱۸۹۸ء) انھوں نے پسپا ہوکر بحرِ احمر عبور کرنے اور حجاز جانے کی کوشش کی۔ لیکن ایک مقامی شیخ کی دغابازی کی وجہ سے سواکن میں مصری حکّام کے ہاتھ میں گرفتار ہوگئے۔ اس کے بعد بہت عرصہ تک وہ قید رہے مگر ۱۹۲۴ء میں جب کہ اُن کی عمر بہت زیادہ ہوچکی تھی وہ قید سے آزاد ہوکر مکّہ معظمہ آئے اور پھر وہاں سے واپس جاکر (۱۹۲۶ء) وادی حیفہ میں انتقال کیا۔

سوڈان و مصر کے متعلق شیخ کے جدوجہد کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ اُن سے خاص تعلقات رکھتے تھے اور

مہدی کی تحریک کے سلسلہ میں غالباً اُن کے اور شیخ کے درمیان خفیہ پیام وسلام بھی ہوتے رہے۔

۲۶۔ اعتمادالسلطنتہ

محمد حسین خان شیخ کے خاص احباب میں سے تھے۔ کچھ عرصہ ایران میں وزیر مطابع بھی رہے اور صاحب تصنیف بھی تھے۔ اُن کی کتاب "المعاصر دالعصر" بہت مشہور ہے جو طہران میں ۱۸۸۰ء میں شایع ہوئی۔

۲۷۔ حاجی مرزا حسن شیرازی

ایران کے مشہور مجتہدین میں سے تھے۔ سمارا میں رہتے تھے۔ ایران میں اُن کا بہت اثر تھا۔ ۱۸۹۵ء میں انتقال ہوگیا۔

۲۸۔ حاجی سید علی اکبر شیرازی۔

ایران کے مشہور قوم پرست مجتہد تھے۔ ناصرالدین شاہ کے سخت مخالف تھے اُن کو اُس نے خارج البلد کیا تو شیراز میں سخت بلوے ہوئے۔ اُس وقت اُن کا یہ قصور بتایا گیا تھا کہ وہ یوروپین اقوام کے خلاف تعصب رکھتے ہیں۔ ایران سے خارج البلد ہو کر انھوں نے بصرہ میں اقامت اختیار کی اور وہیں سے شیخ کی تحریک پر حجتہ الاسلام کو خطوط لکھ کر ناصرالدین شاہ کے خلاف علمار کا حملہ شروع کرایا۔

۲۹ شیخ علی قزوینی۔

اوّل انقلاب ایران کے زمانہ میں بہت نمایاں قوم پرست تھے۔ اور پہلی ایرانی مجلس کے زمانہ میں قاضی عدلیہ بنائے گئے۔ جب شاہ نے پہلی مجلس کو شکست کیا تو اُن پر بھی سخت عتاب نازل ہوا۔ اور بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ باغ شاہ میں گرفتار کرلئے گئے

بعد کو قتل کرا دیے گئے۔

۴۰۔ مرزا آقا خاں۔

اصلی نام عبدالحسین تھا۔ مرزا عبدالرحیم کے بیٹے تھے۔ ریاضی، سائنس اور فلسفہ کے بڑے ماہر تھے۔ ترکی، فرانسیسی اور انگریزی خوب جانتے تھے۔ شاہ کے مظالم سے تنگ آکر شیخ احمد روحی کرمانی کے ساتھ قسطنطنیہ چلے گئے۔ وہاں اخبار "اختر" کے نائب مدیر بن گئے۔ عرصہ تک شیخ کی خدمت میں حاضر رہے۔ آخر شاہ نے ترکی حکومت کو رضامند کرکے گرفتار کرالیا۔ اور شیخ احمد کرمانی کے ساتھ تبریز میں قتل کر ڈالے گئے۔

"آئینۂ سکندری" اُن کی ایک مشہور تصنیف ہے۔ شاہنامے کے طور پر ایک "نامۂ بستان" بھی لکھا تھا اُن کے مرنے کے بعد یہ کتاب "سالاریہ" کے نام سے شایع ہوئی "تاریخ بیداری ایران" میں اُس کے بعض دلچسپ حصے نقل کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں شاہِ ایران کو مخاطب کرکے ایران کی تباہی کا نوحہ پڑھا گیا تھا۔ پروفیسر براؤن نے بھی اپنی کتاب "انقلاب ایران" کا دیباچہ اِن ہی اشعار سے شروع کیا ہے:۔

به ایران مباد آں چناں روزِ بد — که کشور به بیگانگاں اوفتد

نه خواہم زمانے که ایں نوعروس — به افتد بزیر جوانانِ روس

به گیتی مباد آں که ایں حور دیس — شود ہم سرِ لردی اِنگلیس

اُن کی تمام نظمیں اِسی قسم کے جذبات سے بھری ہوئی تھیں۔

به گیتی نه جستم بجز راستی — نه گشتم بگردِ کم و کاستی

ہمہ خیر اسلامیاں خواستم | دلم را بہ نیکی بیار استم
ہمیں خواستم تاکہ اسلامیاں | بہ وحدت بہ بندند یکسر میاں
ہمہ دوستی باہم افزوں کنند | ز دل کین دیرینہ بیروں کنند

....

در اسلام آمد بعز حمید | یکے اتحادِ سیاسی پدید
شدہ ترک ایران و ایران ترک | نماند دوی در شہاں سترگ
ہماں نیز دانندگاں عراق | بسلطانِ اعظم کنند اتفاق
ز دلہا زدا نید ایں کینہ زود | بگو یند سنّی و شیعہ کہ بود

....

گزاریم قانونِ بیگانگی | بہ گیریم آئین فرزانگی
ازیں بس ہمہ کفر سازیم پست | بیاریم گیتی سراسر بدست

پھر ناصر الدین شاہ کا ذکر کرتے ہیں۔

ولے از مسلمانیش بود بہر | بہ نیکی مرا شہرہ کردی بہ دھر
چو در خونِ او جوہر شرک بود | نہ توحید اسلام خشمش فزود
پشیسزے بہ از شہرِ یارِ چنیں | کہ نے کیش دارد نہ ائین دیں

....

زکشتن نہ ترسم کہ آزادہ ام | زمادر ہمیں مرگ را زادہ ام
بگوش از سر ذہنم بسے مژدہاست | دلم گنج گوہر قلم اژدہاست

۳۱۔ شیخ احمد روحی کرمانی

شیخ الاسلام مرزا محمد جعفر کے دوسرے بیٹے تھے۔ ۱۸۵۵ء میں پیدا ہوئے۔ بہت قابل مقرر اور عالم و فاضل اور شاعر بھی تھے۔ روحی

تخلص تھا۔ ۱۸۸۲ء میں اپنے دوست مرزا آقا خاں کے ساتھ کرمان سے اصفہان گئے پھر طہران آئے۔ پھر رشت گئے۔ چونکہ ناصر الدین شاہ اُن سے ناخوش تھا اس لئے قسطنطنیہ چلے گئے۔ بہت پُر جوش قوم پرست تھے۔ اور اسی لیے شیخ کے خاص احباب میں سے تھے۔ قسطنطنیہ میں اُنھوں نے تحریک اتحادِ اسلام کے متعلق بہت جد و جہد کی۔ اِسی غرض سے ترکی۔ انگریزی۔ فرانیسی زبان سیکھی اور درس دینے لگے۔ یہی اُن کا وسیلۂ معاش تھا۔ شیخ کی ہدایت کے مطابق انھوں نے اور مرزا حسن خاں خبیر الملک اور مرزا آقا خاں نے کربلا و نجف کے مجتہدین کو شاہ کے خلاف خطوط لکھے۔ شیخ احمد کی مہر میں یہ مصرع کندہ تھے کہ

داعی اتحاد اسلام احمد روحی آمده تامم

ناصر الدین کے اشارہ سے سلطان نے اِن تینوں دوستوں کو نظر بند کر دیا۔ اور یہ قید ہی میں تھے جب مرزا رضا خاں نے طہران جاکر ناصر الدین کا کام تمام کیا۔ اس قتل کے سلسلہ میں مظفر الدین شاہ نے کوشش کرکے سلطان کی اجازت حاصل کی اور اِن تینوں کو گرفتار کراکے ایران بلا لیا۔ اور یہ الزام لگایا کہ یہ تینوں ناصر الدین شاہ کے قتل کے مشورہ میں شریک تھے۔ ۱۷ر جولائی کو تبریز میں یہ قیدی امین السلطنت کے سامنے پیش کیے گئے اور محمد علی مرزا ولی عہد ایران کی موجودگی میں اُن کے سر کی کھال اُتار لی گئی اور اُس میں بھس بھر دیا گیا۔ پھر یہ سر طہران بھیج دیئے گئے۔

شیخ کے یہ تینوں رفیق ایران کے شہدائے آزادی میں شمار کیئے جاتے ہیں۔

۳۲۔ شیخ الرئیس ملائے طالقانی

ایران کے مشاہیر قوم پرستوں میں سے تھے۔ شیخ کی تعلیمات سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ ۱۹۰۷ء کے ایرانی انقلاب تک زندہ رہے۔ شاعر بھی تھے جس وقت ۱۹۰۶ء میں دستور کا اعلان کیا گیا ہے تو اُن کی ایک نظم پڑھی گئی تھی۔ مشہور کتاب "اتحادِ اسلام" کے مصنف تھے۔

۳۳۔ عالی پاشا

محمد امین، ولادت ۱۸۱۵ء (۱۸۱۹ء) رشید پاشا کے بیٹے تھے جو محکمۂ تنظیمات کے رئیس تھے۔ ۱۸۵۵ء میں وزیر اعظم ہوئے۔ اُس زمانہ کی ترکی قوم پرستوں کی جماعت سے بہت ہمدردی رکھتے تھے۔ اُن ہی کی کوشش سے "خط ہمایونی" جاری ہوا تھا۔ اور اُن ہی کی تحریکِ اصلاح کو مدحت پاشا اور مدحت کے بعد آنے والے ترکی احرار نے تقویت دی۔ کچھ عرصہ لندن میں ترکی سفیر بھی رہے۔ پانچ دفعہ وزیر اعظم ہوئے ۱۸۷۱ء میں انتقال ہوا۔

۳۴۔ فواد پاشا

والد کا نام عزت ملا تھا۔ ولادت ۱۸۱۵ء میں ہوئی۔ سلطان عبدالعزیز کی تخت نشینی کے بعد ہائیکورٹ کے صدر مقرر ہوئے۔ پھر وزیر خارجہ ہو گئے بعد کو وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز کیے گئے۔ سیاسی اصلاحات کے بہت بڑے حامی تھے۔ اور مدحت پاشا کے خاص شرکار کار میں سے تھے۔

. . . .



عُروۃُ الوثقیٰ کے چار مقالے

پہلا مقالہ

العُروۃُ الوُثقیٰ لا انفِصَامَ لَہَا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے الٓمّٓ ۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ○ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللہُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْکَاذِبِیْنَ ”کیا ان لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ اتنا کہنے پر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے اور اُن کو آزمایا نہ جائے گا۔ ہم تو اُن لوگوں کو بھی آزما چکے ہیں جو اِن سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ سو اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو جان کر رہے گا جو سچے تھے اور اُن کو بھی جو جھوٹے ہیں“۔ لوگ بلکہ اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے (اور ایمان کی کچھ نشانیاں ہوتی ہیں) پھر یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ انھیں یونہی چھوڑ دیگا اور اُن کے اس دعوے سے کوئی تعرض نہ کرے گا حالانکہ یہ غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ حاکم عدل ہے قبل اس کے کہ لوگوں کے بہترین عمل کی آزمائش کرے یہاں تک کہ خود اُن پر اُن کی حقیقت آشکارا ہو جائے، وہ اُن کے اِس گمان کی عملی جانچ کر لے گا اور لوگ خود بھی جان لیں گے کہ آیا وہ حقیقت میں مومن ہیں یا یہ اُن کے نفس کا گھڑا ہوا دعوے، اُمیدوں کا فریب اور اوہام کا دھوکا ہے کہ وہ اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہیں

حالانکہ وہ کچھ نہیں ہیں۔ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِهِمْ۔ اور ابھی تک ایمان اُن کے دلوں میں داخل نہیں ہوا) آگاہ رہو کہ یہ لوگ اپنے اِس گمان میں غلطی پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ مغرور کو اس کی گمراہی میں ہرگز نہ چھوڑے گا۔ وہ اس کے دعوئے ایمان کی ضرور جانچ کرے گا لِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ (تاکہ اللہ جہاد کرنے والوں اور صبر کرنے والوں کو جان لے) لِأَنْ لَا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ۔ (تاکہ اللہ پر لوگوں کے لیے حجّت باقی نہ رہے)

بے شبہ حکیم مطلق نے کتابیں نازل فرمائیں۔ رسول بھیجے وعدے وعید کیے۔ ڈرایا۔ بشارت دی۔ اُس کا فرمایا ہوا سچ اور اُس کا وعدہ برحق ہے کہ وہ ہر شخص کو سزا دے گا جس نے اپنا عقیدہ ایسے خیال پر قایم کیا ہو جس کا کوئی اثر نہ ہو یا ایسے گمان کو بنائے اعتقاد سمجھا ہو جس سے سعادتِ سرمدی و نعیم ابدی کو کوئی لگاؤ نہ ہو۔

جو شخص اپنے زعم سے مبتلائے فریب ہو اپنے اوہام کی تاریکیوں میں سرگرداں ہو اُس کے لئے ایمان جیسی چیز جو خدا کی راہ میں مشقتوں اور دشواریوں کے برداشت کرنے کا نام ہے آسان نہیں اور ایسا شخص ان منافقوں کے گروہ سے کچھ علیحدہ نہیں جن کے لیے ابدی شقاوت اور دائمی عذاب کا حکم بارگاہِ خداوندی سے صادر ہو چکا ہے۔

ایمان ہر خواہش کو مغلوب کرتا اور ہر آرزو کو دباتا ہے۔ وہی نفس کو بغیر کسی اور رہنما کے اللہ کی رضامندی طلب کرنے کے لیے رجوع کرتا ہے۔ اللہ جو سب سے زیادہ راست گفتار ہے فرماتا ہے:۔ لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يُجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ

وَاللّٰہُ عَلِیْمٌۢ بِالْمُتَّقِیْنَ ○ اِنَّمَا یَسْتَاْذِنُکَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُھُمْ فَھُمْ فِیْ رَیْبِھِمْ یَتَرَدَّدُوْنَ ○ جو لوگ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لاتے ہیں وہ تجھسے اس بات کی اجازت نہیں طلب کرتے کہ وہ اللہ کے راستہ میں اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ جہاد کریں گے۔ اللہ پرہیزگاروں کو جانتا ہے تجھسے تو وہی لوگ اجازت طلب کرتے ہیں جو اللہ اور قیامت پر ایمان نہیں لاتے اور اُن کے دِل مشکوک ہیں اور اِس لیے وہ اپنے شُبہہ میں سرگرداں ہیں)۔

یہ ہے اللہ کا فیصلہ اور حکم اُن لوگوں کے خلاف جو فریضۂ ایمان کے ادا کرنے میں جانوں اور مالوں کے صرف کرنے کی نسبت طالبِ اِذن ہوتے ہیں۔ اُن کے متعلّق صاف ارشاد ہے کہ ایسے لوگ ایمان نہ لائیں گے۔ بیشک خدا کا ارشاد بالکل صحیح ہے۔ اس کی کتابیں درست کہتی ہیں۔ اور رسولوں نے سچ کہا ہے۔ یقیناً عقایدِ راسخہ کی کچھ نشانیاں ہیں۔ جن کا ظہور عزائم و اعمال میں ہوتا ہے اور افکار و واردات میں اُن کی تاثیر نمایاں ہوتی ہے۔ معتقدین جب تک معتقدین کے زمرہ میں رہیں گے اِن نشانیوں سے الگ نہیں رہ سکتے۔ یہی حال ایمان کا اُس کی تمام نشانوں اور صورتوں میں ہے اس کی خاصیتیں۔ صفتیں اور خصوصیتیں بھی اِس سے جُدا نہیں ہوتیں نہ اخلاقِ عالیہ و عاداتِ حسنہ میں اور ایمان میں کوئی تباین ہوتا ہے۔ صدر اسلام میں مومنین اِس صفت میں ممتاز تھے اور جو لوگ عقیدہ میں اُن کے خلاف تھے وہ بھی اُن کے عزم و علو مرتبت کے معترف تھے۔

بیشک اُن ہی لوگوں نے اللہ کی آزمائش و ابتلا کی آگ میں صبر و

پامردی دکھائی یہاں تک کہ اُن کا ایمان ہر کھوٹ اور ملاوٹ سے کندن کی طرح صاف اور خالِص ہو کر چمکنے لگا۔ یہ اُن کے صبر ہی کا انعام تھا۔

اللہ کی آزمائش اور اُس کا امتحان اِس خصوص میں کتنا سخت ہوتا ہے اور اُس کی حکمت کس درجہ دقیق اور اہم ہوتی ہے لِیَمِیزَ اللّٰہُ الخَبِیثَ مِنَ الطَّیِّبِ۔ تاکہ اللہ پاک اور ناپاک کو الگ کر دے)

بیشک اللہ تعالیٰ کی آزمائش میں عادتوں کا ترک۔ مشقتوں کا تحمل اموال کا صرف اور جانوں کا سودا سبھی کچھ شامل ہے۔ ہر خطرہ جو ہلاکت کا باعث ہو اُس سے دور رہنا چاہیئے مگر ایمان اِس سے مستثنیٰ ہے۔ اِس میں ہر مہلکہ نجات اور وہ موت جو تحفظِ ایمان کے سلسلہ میں ہو بقائے ابدی اور ہر وہ مصیبت جو حقوقِ ایمان کے ادا کرنے میں پیش آئے سعادتِ سرمدی ہے۔ مومن اپنا مال مقتضائے ایمان کے موافق صرف کرتا ہے اور فقر و افلاس سے نہیں ڈرتا وَاِنْ کَانَ الشَّیْطَانُ یَعِدُہُ الفقر۔ اگرچہ شیطان اِس سے فقر کا وعدہ کرتا ہو یعنی دھمکی دیتا ہو) ایمان کا حق ادا کرنے میں جو کچھ صرف کیا جائے اُس میں کوئی اسراف نہیں۔ خواہ اُس میں تمام دولت کیوں نہ اُٹھ جائے۔

بلاشبہ اِس زندگی کے ماورا مومنین کے لیے ایک اور بھی زندگی ہے جس کی لذتیں اس زندگی سے مختلف ہیں۔ اِس زندگی میں جو سعادت ہے وہ شیطان کی سجائی ہوئی سعادت سے الگ ہے۔ اس باب میں مومن کا نقطۂ نظر یہی ہے۔ اگر اُس کے دل سے ایمان مس بھی کر گیا ہے تو وہ معاملات کو اسی نظر سے دیکھے گا۔ خواہ غایتِ کمال کو نہ پہنچا ہو۔

ایمان میں اللہ تعالیٰ کی محنت و آزمائش سے بھاگنا ابدی رسوائی کا

باعث ہے گمراہی کے لشکر سے ٹکرانے میں گریز کرنا دائمی شقاوت کا موجب ہے خواہ وہ تصور سے زیادہ پُر خطر کیوں نہ ہو۔ سعادت صرف دینی سعادت کا نام ہے اور دین کی حفاظت جان جوکھم کا معاملہ ہے۔ ایمان کے لیے سخت تکالیف اور دشواری سے ادا ہونے والے فرائض معیّن ہیں اِلَّا عَلَی الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی مگر اُن لوگوں پر جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقوے کے لیے آزمایا ہے۔

فرائض ایمان کے ادا کرنے کا کام مصائب و مکروہات سے گھرا ہوا ہے اور کیوں نہ ہو ایمان کے لیے سب سے پہلے جو چیز واجب ہے وہ انسان کا نفس مال اور شہوات کی قیود سے نکل آنا ہے اور ان سب کو اپنے رب کے احکام کے ماتحت رکھنا ہے۔ کوئی مومن اُس وقت تک ہرگز مومن نہیں ہوسکتا جب تک خدا اور رسولؐ اُسے اپنی جان سے زیادہ عزیز و محبوب نہ ہوں۔

مومن کے نفس کو سب سے پہلے جو احساس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں ایک دوسرے گھر کا سفر کرنے کے لیے مسافر کی حیثیت سے آیا ہے اور وہ گھر اِس دنیا سے بہتر اور زیادہ پائیدار ہے۔ صاحب ایمان کا پہلا قدم جاں نذر کرنا ہے جب کہ داعی ایمان صرف جان کی طرف بلائے۔ اور کوئی دعوت اللہ کے نبیوں کی زبان سے جاری ہونے والی ندائے حق سے زیادہ قوی الحجت اور بلند بانگ نہیں۔

اللہ ایمان کی حفاظت میں کسی عذر کو قبول نہیں کرتا اور نہ کسی علت کو جب تک کہ آدمی کے پاؤں چلتے آنکھیں دیکھتی اور ہاتھ کام کرتے ہیں۔ مومن کے لیے اللہ کا امتحان اُس کے اُن قاعدوں میں

سے ہے جن کی بنا پر صادقین اور منافقین کا امتیاز ہوتا ہے۔ ہر صدی میں اللہ تعالیٰ مومنین کو ایک سخت اور ہیبت و دبدبہ والی قوم کی طرف بلاتا ہے۔ فَإِنْ تُطِيعُوا يُؤْتِكُمُ اللَّهُ أَجْرًا حَسَنًا وَإِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا۔ اگر وہ اطاعت کریں گے تو اللہ انھیں اچھا بدلہ دے گا اور اگر پھر جائیں گے تو دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا۔ اللہ کے انصاف کی میزان قیامت تک کھڑی رہے گی اور نہایت کافی صلہ ملے گا۔ اِس لیے جو لوگ اپنے خیالی اور رسمی ایمان پر قانع ہوں وہ ہرگز یہ گمان نہ کریں کہ اللہ کا عدل، انھیں اور اُن کے گمانوں کو یونہی چھوڑ دے گا كَلَّا إِنَّهُمْ فِي كُلِّ عَامٍ يُفْتَنُونَ۔ ہرگز نہیں وہ تو ہر سال آزمائے جاتے ہیں، جو لوگ اپنے جان و مال کے ڈر سے دین کے معاملہ میں کمی کرتے ہیں۔ اُنھیں سوچنا چاہیے کہ اللہ کے علم میں اُن کی حیثیت و منزلت کیا ہوگی آیا وہ سچوں میں شمار ہوں گے یا جھوٹوں میں۔ داللہ تعالیٰ ایمان داروں کو اُن کی بھلائی کے وسائل دکھائے اور اُن کے مآلِ کاری کی خوشخبری دے۔

دوسرا مقالہ

مشاہدہ گواہ ہے کہ بعض انسانی افراد سے ایسے امور ظہور میں آچکے ہیں جن سے عقلیں دنگ اور فہم و قیاس کی قوتیں حیران ہیں۔ کمزور عقل کے لوگ اِن امور کو دیکھتے اور اُنھیں معجزہ سمجھنے لگتے ہیں۔ اگرچہ اُن کا ظہور زمانۂ نبوت سے تعلق نہیں رکھتا۔ وہ انھیں خوارق عادات کا درجہ دیتے ہیں۔ گو انبیاء و رسل سے اُن کا صدور نہیں ہوا۔ بعض کم عقل انھیں افلاک اور ارواح کواکب کی حرکات کا نتیجہ خیال کرتے ہیں۔ یا ستاروں کی موافق رفتاروں کا۔ بعض ایسے بھی ہیں جو صحیح بات کے سمجھنے اور اسباب کے دریافت کرنے سے قاصر رہ کر اُنھیں اتفاقی امور قرار دیتے ہیں۔

اعمال و اسباب کی وابستگی:۔

مگر جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے حکمت و ہدایت عطا کی ہے وہ خوب جانتا ہے کہ حکیم و خبیر خدا نے ہر حادثہ کو ایک سبب اور ہر فعل کو ایک عمل سے وابستہ کر دیا ہے۔ اور تمام کائنات میں صرف انسان کو عقل اور روحانی مقدرت کا مخصوص انعام عطا کیا ہے تاکہ وہ اِن دونوں کی بدولت عجائب امور کا مظہر اور تکالیف (فرائض) شرعیہ کا سزاوار

بن جائے۔ یہی دو چیزیں ہیں جن کی بنا پر انسان عقلا کے نزدیک مدح و ذم کا مستحق اور خدا کے نزدیک ثواب و عذاب کا مورد بنتا ہے۔

حصول کمال کی فطری استعداد

جس وقت کوئی صاحبِ بصیرت صحیح قیاس کی طرف رجوع کرتا ہے تو اُسے بشری فطرت اور انسانی قوتوں کے تشابہہ میں یہ حقیقت واضح طور پر نظر آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو حصولِ کمال کی استعداد عطا کی ہے اور اس میں وہ خاصّے ودیعت فرمائے ہیں جن کی بدولت خفیف سے تفاوت کے ساتھ کم و بیش تمام انسان فضائل اعمال کا مصدر بن سکتے ہیں۔

حقیقت میں یہ مقام سخت حیرت میں ڈالنے والا ہے کہ جب انسانی خلقت میں کمال کی فطری استعداد ہے۔ ہر فرد میں فخر و امتیاز کے حصول کی پوری رغبت موجود ہے۔ ہر شخص اللہ تعالیٰ کے اِس فضلِ عام کی بدولت بڑے بڑے کام کر کے ممتاز اور مفتخر بننے کا آرزومند نظر آتا ہے۔ اور ایسے نفضل و عطا سے مستفید ہو سکتا ہے۔ جو کسی طالب کو نامراد اور کسی سائل کو ناکام نہیں رہنے دیتا بشرطیکہ ارادہ میں صداقت اور سعی میں خلوص ہو۔ تو انسانی جنس کے ایک بہت بڑی اکثریت کے ہمیشہ پستیوں میں پڑے رہنے اور خداداد استعداد کے باوجود کمال مقصود تک پہنچنے سے قاصر رہنے کی کیا وجہ ہے۔ اس حیرت میں خصوصیت سے اس وقت اور اضافہ ہو جاتا ہے جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ لوگ اللہ کے عدل پر ایمان رکھتے ہیں اس کے وعدہ و وعید کی تصدیق کرتے۔ باقیاتِ صالحات پر

ثواب کے امیدوار ہوتے اور برائیوں کے ارتکاب پر اُس کے عذاب سے خوفزدہ رہتے ہیں اور قیامت جیسے زبردست اور اُس دن اَلْیَوْمَ تُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ۔ جب کہ ہر نفس اپنے کیے کا بدلہ پائے گا) مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ۔ جو ذرہ برابر بھلائی یا ذرہ برابر برائی کرےگا اسے دیکھے اور اس کی سزا و جزا پائے گا) کے برحق ہونے کا بھی اعتراف کرتے ہیں۔

پستی و بے عملی کا اصل سبب:۔

آخر وہ کیا چیز ہی جو نفوس کو عمل سے باز رکھتی ہی۔ اِنسان کن وجوہ سے مذلتوں کے عمیق غار میں پڑے ہوئے ہیں۔ جب مسببات کو اسباب کی طرف رجوع کرکے حقایق کا انکشاف کیا جاتا ہی تو ہمیں اِس کا ایک سبب نظر آتا ہی جو تمام اسباب کی جڑ ہی اور ایک ایسی علت محسوس ہوتی ہی جو تمام خللوں کی اصل ہی اور وہ جبن (بزدلی) ہی۔

جبن ہی وہ چیز ہی جس نے بڑے بڑے ملکوں کے ستونوں کو کھوکھلا کرکے اُنھیں منہدم کر دیا ہی۔ اسی نے اقوام کے رشتے منقطع کرکے اُن کا شیرازۂ نظم منتشر کیا اور اِسی نے بڑے بڑے بادشاہوں کے عزائم میں سستی پیدا کرکے اُن کے تخت اُلٹ دیے۔ عالی رتبہ اشخاص کے دل ضعیف کیے اور اُن کے فلک فرسا محلات کو زمین بوس بنا دیا ہی طالبانِ خیر کے لیے خیر و سلوک کے دروازے بند کراتا اور سب کی نگاہوں سے ہدایت کو معدوم کرتا ہی۔ اسی کی بدولت نفوس ذلت و مسکنت کا بوجھ آسانی سے اٹھاتے ہیں اور

غلامی کا بھاری جوا گردن پر رکھنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ شی ہے جو اہانت کو صبر سے اور ذلت کو استقلال سے برداشت کرنے کی تلقین کرتی ہے اور وہم و گمان سے زیادہ وزنی مصائب کے تحمل پر آمادہ کر دیتی ہے۔ ایسے وزنی مصائب کہ شجاعت و پامردی کی صفت سے آراستہ ہونے کی صورت میں اُن کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بزدلی نظر کو ننگ و عار کا لباس پہناتی ہے۔ بزدل ذلتوں کی ناہمواریوں کو سہل و ہموار اور سختی و شدت کی زندگی کو خوشگوار سمجھنے لگتا ہے۔

نہیں بلکہ وہ ہر گھڑی موت کی تلخی کا مزہ چکھتا ہے پھر بھی ہر حال میں راضی رہتا ہے۔ اس کی نظر صرف دشمنوں کو دیکھتی ہے دوستوں کو نہیں۔ اُس کا نفس صرف سختی کا اور احساس صرف اذیت کا ادراک کر سکتا ہے۔ غرض اِس طرح وہ زندگی بھر ہر چیز کو بغیر کسی شی کے ضائع کرتا رہتا ہے اور گمان یہ کرتا ہے کہ بامراد ہے اور مقصد کے حصول میں کامیاب ہے۔

جبن کی تعریف اور اس کا سبب:۔

جبن نفس کے ہر ایسے واقعہ سے بچنے کی سعی کا نام ہے جو اُس کے مناسب حال نہ ہو۔ اور اُس کا شمار اُن روحانی امراض میں ہے جو وجود کی اُس محافظ قوت کو تباہ کر دیتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حیات طبعی کا ایک رُکن بنایا ہے۔ جبن کے یوں تو بہت سے اسباب ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ مرض صرف موت کے خوف سے پیدا ہوتا ہے۔

موت :-

موت ہر زندہ کا مآل اور ہر ذی روح کا مرجع و مآب ہے۔ موت کے لیے کوئی جانا پہچانا وقت ہے نہ معلومہ ساعت۔ تاہم آغازِ پیدائش کے وقت سے کاہل بڑھاپے کے درمیان ہر گھڑی اس کا کھٹکا لگا رہتا ہے ہر لمحہ اِس کا انتظار کیا جاتا ہے مگر اِس کے آنے کا یقینی وقت سوائے اللہ کی ذات کے کسی کو معلوم نہیں۔

وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَّمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ۔ (آیۃ)

(کوئی نفس نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائے گا نہ کسی کو یہ معلوم ہے کہ وہ کہاں اور کس سرزمین میں مرے گا)۔

جب موت کا خوف بڑھ جاتا ہے اور حتمی انجام کی طرف غافل ہونے اور سعادتِ دنیا و آخرت کی خدا داد استعداد کو فراموش کر دینے کی وجہ سے اِس خوف میں شدت پیدا ہوجاتی ہے تو یہ مہلک مرض نفس میں جڑیں مضبوط کر لیتا ہے اور انسان اللہ کی عطیہ قوتوں کا مصرف بدل دیتا ہے۔

بیشک یہ انسان کی غفلت ہی کا ثمرہ ہے کہ جو چیز زندگی کو بچانے والی ہے یعنی شجاعت و جسارت اُسی کو وہ فنا کا سبب خیال کرنے لگتا ہے۔ نادان ہر قدم پر خطرہ محسوس کرتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ اپنے انسانی آثار پر نظر کرے۔ طالبان ترقّی و عظمت کے فوز مرام اور اُن کی زیر کردہ مشکلات کا تصوّر کر لیے تو ایک ہی نظر میں معلوم ہو سکتا ہے کہ اِن تمام خطرات کی حقیقت وہموں اور شیطانی وسوسوں سے زیادہ نہیں۔ یہی وسوسے اُس پر چھا جاتے

ہیں۔ اسے اللہ کے راستے سے دور ہٹا کر ہر نیکی سے محروم کر دیتے ہیں۔

جبن کے نتائج و ثمرات:۔

جبن زمانہ کی گردشوں اور غولوں کا بچھایا ہوا ایک جال ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے انسانی نفوس کو پھانسا اور اقوام کو ہڑپ کر لیا جائے۔ وہ ایک شیطانی کمند ہے جس سے شیطان خدا کے بندوں کو اسیر کرتا اور اُس کے راستے سے ہٹا دیتا ہے۔ وہ ہر رذالت کی علت اور ہر بُری خصلت کا مبدء و منشا ہے۔ دنیا میں کوئی بدبختی ایسی نہیں جو اس سے نہ پیدا ہوئی ہو۔ کوئی فساد ایسا نہیں جس کے جراثیم اس میں نہ ہوں وہ ہر قسم کے کفر کا باعث و موجب ہے جماعتوں کا درہم برہم کرنا اور مربوط و محکم بنیادوں کو توڑ دینا اس کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ یہ لشکروں کو شکست دیتا جھنڈوں کو واژگوں کرتا اور بادشاہوں کو عظمت و رفعت کے آسمان سے ذلت و رسوائی کی خاک پر پھینک دیتا ہے جو چیز وطنی جنگوں میں خائنوں کو خیانت پر اکساتی ہے کیا اسی کا نام جبن نہیں ہے۔ جو خیال کم حوصلہ اور کمینہ لوگوں کے ہاتھ رشوت لینے کے لیے دراز کراتا ہے کیا اسے جبن نہیں کہتے۔

غور کیجئے تو معلوم ہو جائے گا کہ فقر سے جو خوف پیدا ہوتا ہے وہ بھی حقیقت میں موت ہی کے خوف کا ثمرہ ہوتا ہے اور یہی جبن کی علت ہے۔ اب اُس کا کذب و نفاق اور معیشتِ انسانی میں فساد پیدا کرنے والے تمام امراض سے تعبیر ہونا بالکل واضح ہو گیا۔ حقیقت میں جبن ہر انسانی فطرت رکھنے والے کے لیے ننگ

د عار ہی خصوصاً اُن لوگوں کے لیے جو اللہ رسول اور یوم قیامت پر ایمان رکھتے اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ انھیں اُن کے اعمال کا اچھا بدلہ ملے گا۔

ابنائے ملّتِ اسلام سے تخاطب :-

ابنائے مِلّت اسلام کو چاہیے کہ اپنے دینی حالات کے مقتضا کو ملحوظ رکھتے ہوئے جبن جیسی ناقص صفت سے سب سے زیادہ دور بھاگیں۔ کیونکہ ابنائے ملّت (یعنی مسلمان)، کو اللہ کی رضامندی کے سوا اور کسی چیز کی تلاش نہیں اور یہ (جبن) اللہ کے پسندیدہ فرائض کے ادا کرنے میں سب سے بڑا مانع ہی۔

قرآنِ کریم کی تلاوت کرنے والے خوب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے موت کی محبت کو ایمان کی علامت قرار دیا ہی۔ اور اسی سے دشمنوں کے دلوں کو آزمایا ہی۔ وہ ان لوگوں کے متعلّق جو مؤمن نہیں ہیں فرماتا ہی (اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ۔ کیا تو نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکو نماز قایم کرو زکوٰۃ دو۔ پھر جب اُن کے لیے لڑائی مقرر ہوئی تو اُن میں سے ایک گروہ انسانوں سے اس طرح ڈرنے لگا جس طرح خدا سے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اور اِس گروہ نے کہا کہ اے رب ہمارے تو نے ہمارے لیے لڑائی (کی شرکت) کیوں مقرر کر دی تو نے ہمیں تھوڑی مدّت تک اور کیوں نہ رکھا)

حق کے راستے میں قدم بڑھانا اور اُس کے کلمہ کو بلند کرنے میں اموال و ارواح کو صرف کر دینا مومنین کی پہلی نشانی ہے۔ کتاب الٰہی نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کی ہے کہ نماز قایم کی جائے زکوٰۃ اداکردی جائے اور ہاتھ روکے جائیں ان چیزوں کو تو اُن اُمور میں شمار کیا ہے جن میں مومن کافر اور منافق بظاہر مشترک ہیں۔ بلکہ اس نے ایمان کی واحد دلیل عدلِ الٰہی اوراعلائے کلمتہ حق میں جان نثاری کو قرار دیا ہے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ اسے (جان نثاری کو) ایک بے بدل رکن شمار کیا ہے۔

اسلام اور بزدلی کا اجتماع ناممکن ہے:۔

کوئی یہ نہ گمان کرلے کہ ایک ہی دل میں دینِ اسلام اور جبن دونوں کو جمع کرنا ممکن ہے۔ یہ کیونکر ہوسکتا ہے جب کہ اس دین کا ہر جزو شجاعت و اقدام کا تصور پیش کرتا ہے خدا کے لیے اخلاص اس کا رکنِ اعظم ہے اور اُس کی رضا کے حصول کے لیے اس کے سوا ہر چیز کو چھوڑ دینا سرمایہ سے بڑا فرض قرار دیا گیا ہے۔

مومن تو وہ ہے جو یقین رکھتا ہو کہ موت کا وقت اور تقدیر اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے وہ انھیں جس طرح چاہتا ہے کام میں لاتا ہے اور ادائے فرض میں تاخیر کرنا موت کے وقت کو بڑھا نہیں سکتا نہ اِس میں پیش قدمی کرنا موت کے وقت کو گھٹا سکتا ہے۔ ہر صورت میں موت بغیر ایک لمحہ کی تاخیر کے مقررہ وقت پر آپہنچتی ہے۔

مومن وہی ہے جو اپنے نفس کے لیے دو میں سے ایک نیکی کا متوقع رہتا ہے یا سردار اور باعزت بن کر زندہ رہے یا شہید بن کر مر جائے کہ اُس کی رُوح اعلیٰ علیین میں ملائکہ مقربین کا ساتھ دے سکے۔ جو شخص اِس وہم میں پڑا ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے ایمان اور جبن کو ایک ساتھ جمع کیا جا سکتا ہے وہ شخص اپنے نفس کو دھوکا دے رہا ہے۔ عقل کو فریب میں ڈالے ہوئے ہے۔ اُس کی ہوس اُسے بہلا رہی ہے اور حقیقت میں اس میں ایمان کا شائبہ تک نہیں۔

علما کو نصیحت :-

قرآنِ کریم کی ہر آیت بزدل کے دعوئ ایمان کو جھٹلا رہی ہے اسی لیے ہم ورثہ انبیا (علما) سے توقع کرتے ہیں کہ وہ علانیہ طور پر حق کا اظہار کریں۔ آیاتِ الٰہی کو یاد کریں۔ اُن میں اعلائے کلمتہ اللہ کے لیے قدم بڑھانے کا جو حکم اور اُس کے مقررہ واجبات و فرائض کے ادا کرنے میں سستی و تاخیر کی جو ممانعت ہے اُسے یاد دلائیں۔

گمان غالب ہے کہ اگر علما اِس فریضہ کی ادائی اپنے ذمہ لے لیں یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تکلیف تھوڑے دن گوارا کریں۔ معانی قرآن سب کو سمجھائیں۔ اور مومنین کے نفوس میں اس کی عظمت دوبارہ زندہ کر دیں تو اُس کا اثر اِس قوم میں اتنا مستقل اور پائیدار ہو جائے گا کہ قیامت تک اُس کا

ذکر باقی رہے گا۔

در اصل مومنین نے جو صفات اپنے اسلاف سے ورثہ میں پائی ہیں اور عقائد کے جو آثار اُن کے قلوب میں متمکن ہیں وہ اتنے کافی ہیں کہ اُن کے لیے تھوڑی سی تنبیہ اور ایک ذرا سا اشارہ ہی بہت ہے جس کے نتیجہ میں وہ شیروں کی طرح بپھریں گے۔ اور جو کچھ کھو چکے ہیں اُسے پالیں گے۔ جو موجود ہے اُس کی حفاظت کریں گے اور اللہ کے یہاں مقامِ محمود حاصل کرسکیں گے۔ فقط

٭ ٭ ٭

٭ ٭

٭

تیسرا مقالہ

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

مسلمانوں کے دین میں ایسی قوت و شدت اور اُن کے یقین میں اس درجہ ثبات و استقامت پائی جاتی ہے کہ وہ اس کی بدولت دوسری قوموں پر فخر کرتے ہیں اور اُن کا یہ فخر بالکل بجا ہوتا ہے۔ اُن کا عقیدہ ہی ایسا ہے کہ اُس میں ایک دوسرے سے ربط پیدا ہونے کے مضبوط ترین اسباب مُہیا رہتے ہیں۔ یہ اعتقاد اُن کے نفوس میں نہایت رسوخ کے ساتھ قایم ہو جاتا ہے کہ اللہ اور اُس کے رسول کے لاتے ہوئے احکام پر ایمان رکھنے میں سعادتِ دارین کی کفالت ہے اور جو شخص ایمان سے محروم رہتا ہے وہ دونوں جہان کی سعادتوں سے بے نصیب رہ جاتا ہے۔ وہ کسی شخص کے دین سے منحرف ہو جانے پر اتنا افسوس کرتے ہیں کہ اگر وہ مرجاتا تو اتنا افسوس نہ کرتے۔ یہ حالت صرف علما ہی میں نہیں پائی جاتی عوام میں بھی اسی درجہ کا احساس موجود ہے۔ کوئی شخص خواہ وہ روئے زمین کے کسی حصّہ میں ہو عالم ہو یا جاہل ہو اگر دنیا کے کسی شخص اور کسی قوم کے آدمی کے متعلق بھی یہ سُن لیتا ہے کہ وہ مذہبِ اسلام

سے پھر گیا تو اُسے انتہا درجہ کا قلق اور بے حد صدمہ ہوتا ہے وہ اس خبر پر بے اختیار اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن پڑھتا ہے اور اس واقعہ کو اپنے اور تمام ہم مذہبوں کے لیے بہت بڑی مصیبت خیال کرتا ہے۔ پھر یہی نہیں اگر تاریخ میں بھی اسی قسم کے واقعہ کا ذکر آجاتا ہے اور کوئی مسلمان مطالعہ کرنے والا دوسو برس کے بعد اس کا تذکرہ پڑھتا ہے تب بھی اُس کا دل قابو سے باہر ہو جاتا ہے خون میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ غصہ کے آثار چہرہ سے نمایاں ہو جاتے ہیں اور وہ ہر واقعہ کا ذکر ایک عجیب اور نئی بات کی طرح کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

مسلمان شریعت اور اُس کے صریح دلائل و احکام کے لحاظ سے اپنی ولایت میں داخل ہونے والے لوگوں کی حفاظت کے ذمہ دار اور خدا کے نزدیک جواب دہ ہیں اس باب میں قریب و بعید کا کوئی فرق نہیں نہ اختلاف جنس و قوم کا کوئی اثر ہے ہر شخص ہر جگہ یکساں طور پر مامور ہے۔ یہ چیز ایک فرض عین ہے۔ اگر کوئی قوم اپنے زیر حفاظت اشخاص کی حفاظت نہ کرے گی تو سب کو بہت بڑا گناہ ہوگا۔

مسلمانوں پر جو اُمور اعانت نفوس و حفاظت بلاد کے سلسلہ میں فرض ہیں اُن میں حسبِ ذیل خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ جان و مال صرف کرنا ہر سختی کو جھیلنا خواہ کوئی حادثہ پیش آتے اُس کا دلیرانہ مقابلہ کرنا۔ اِس کام میں مسلمانوں کو اِن لوگوں سے جو کسی اعتبار سے اُن پر غالب ہوں اُس وقت تک صلح کرنا مباح نہیں جب تک وہ اپنا مخصوص ملک اُن سے نہ حاصل کرلیں۔

سیادت و سروری کے حصول میں شریعت نے اس حد تک مبالغہ کیا ہی کہ اگر کوئی مسلمان غیر کے تسلط سے رہائی حاصل کرنے میں عاجز رہے تو اُس پر دارالحرب سے ہجرت کرنا واجب ہی۔ وہ فائدے ہیں جو شریعتِ اسلامیہ میں بالکل ثابت و واضح ہیں۔ اہلِ حق اُن سے خوب واقف ہیں۔ ہوا پرستوں اور غرض کے بندوں کی تاویلات کسی زمانہ میں بھی انھیں تبدیل نہیں کرسکتیں۔

ہر مسلمان اپنے ضمیر سے ایک آواز سنتا اور محسوس کرتا ہی جو اسے شریعت کے مطالبہ کو یاد دلاتی ہی اور فریضہ ایمان کی طرف متوجہ کرتی ہی۔ یہ وہی آواز ہی جو مسلمان کے دینی الہامات میں سے اس کے لیے اب تک باقی ہی اور باقی رہے گی۔ مگر ان سب کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل اس مذہب کے پیرووں میں سے بعض لوگ ایک دوسرے کی مصیبت سے بے پروا اور بے خبر ہیں۔ مثلاً اہلِ بلوچستان اپنی آنکھوں کے سامنے افغانستان کے حالات دیکھتے رہے۔ اُن میں کوئی حرارت و جوش پیدا نہ ہوا اور انھوں نے اپنے افغانی بھائیوں کی حمایت کے لیے ذرا بھی حمیت محسوس نہ کی۔ یا دوسری طرف افغانی بلادِ فارس میں غیروں کی مداخلت کا تماشا دیکھا کیے اور اُن میں بے چینی اور اضطراب و ناگواری کا کوئی اثر نہ دیکھا گیا۔ انگریزی فوجوں نے مصر میں آتے جاتے خوب کشت وخون اور قتل و غارت سے کام لیا مگر اُن کو خونریزی کی سیر دیکھنے اور اُن کے حلقوں سے دردناک صدائیں سننے والے بھائیوں میں زرا غیرت نہ پیدا ہوئی۔

حقیقت میں اِن عقیدوں کا حامل ہونے اور اپنے نفوس ایں جذبۂ حق کا احساس رکھنے کے باوجود مسلمانوں کی یہ حالت نہایت تعجب و حیرت کا باعث ہی اور ہمیں مجبور کرتی ہی کہ اُس کے اسباب بھی بیان کریں۔ اس لیے مختصراً کچھ اسباب بیان کئے جاتے ہیں۔

بلاشبہ عقلی افکار دینی عقاید اور تمام معلومات و مدرکات اور لفظی وجدانیات سب تقدیر الٰہی سے صدور میں آتی ہیں۔ اگرچہ یہ اعمال پر اکساتی ہیں۔ لیکن بعد میں اعمال بھی انھیں قوی و پائیدار بناتے ہیں جہاں تک کہ انہیں ملکہ اور خلق سے تعبیر کیا جاتا ہی اور اُن پر اُن کے مناسب آثار مترتب ہوتے ہیں۔ بالیقین انسان اپنے افکار و عقاید ہی کی بدولت انسان ہی۔ جو چیز اِس کے آئینۂ عقل میں نظر کے مشاہدات اور حواس کے مدرکات سے منعکس ہوتی ہی اس میں نہایت شدید اثر پیدا کرتی ہی۔ اس صورت میں ہر مشاہدہ سے ایک خیال اور ہر خیال سے خواہش میں ایک اثر پیدا ہوتا ہی۔ پھر ہر خواہش سے عمل رونما ہوتا ہی اور عمل سے دوبارہ فکر و خیال کی طرف رجعت ہوتی ہی۔ اس طرح جب تک جسموں میں روحیں باقی رہتی ہیں اعمال و افکار کے درمیان فعل و انفعال کا سلسلہ قایم رہتا ہی۔

عقل کے نزدیک اخوت اور وسائل نسب و قرابت کی بھی ایک صورت معین ہی۔ اگر ضرورت و حاجت حصول منافع میں رشتہ داروں اور وارثوں کے تعاون پر اور دفع ضرر میں اُن کی اعانت و تقویت پر آمادہ نہ کرتی اور اس معاونت پر ایک زمانہ

گزرنے کے بعد قلبی نسبت ایک ایسا ماخذ اختیار کرسکتی جس سے یہ نسبتِ زندگی بھر برانگیختہ ہوتی رہے اور رشتہ کی مدد اور قلب کی بشاشت سے نفس میں انبساط رونما ہوتا رہے تو جو نکبت ونقصان وجدانیات کی طرح محسوس ہوتا رہتا ہے قرابت ورشتہ کو کبھی لاحق نہ ہوتا بلکہ اِس کا معاملہ اتنا شبہ میں ڈال دیتا کہ بعض اہلِ نظر اسے طبعی خیال کرنے لگتے۔

پس اگر صلہ نسب کو اس کے علم واستواری کے بعد چھوڑ دیا جائے اور ضروریاتِ زندگی کسی وقت اِس صلہ کے امکان وتائید کی دعوت نہ دیں یا مقصد اعانت نسب کے علاوہ کسی دوسری شکل سے حاصل ہوسکے تو اِس نسبی رابطہ کا اثر جاتا رہے گا اور عقل میں اس کی صورت صرف روایات ومنقولات کے طور پر باقی رہے گی۔

نسبی رابطہ انسانوں کے درمیان قوی ترین رابطہ ہے جو مثال اس کی بیان کی گئی وہی شان اعتقادات کی ہے جن کا اثر انسانی اجتماع میں ایک دوسرے سے ارتباط کا باعث ہونے کی وجہ سے مسلّم ہے۔

اِس اُصول کے بیان کرنے اور اُس پر نگاہ فراست سے نظر ڈالنے کے بعد اس کا سبب اچھی طرح واضح ہوجائے گا کہ مسلمانوں میں اتنی مذہبی شدّت کے باوجود جمود کیوں ہے اور وہ اپنے عقاید میں سب سے زیادہ مستقل وثابت قدم ہونے کے باوصف کس لیے اپنے بھائیوں کی مدد سے دور ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے مابین اب وہ پہلی سی جامعیت باقی نہیں صرف دینی عقیدہ ہے جو اپنے لوازم یعنی اعمال سے خالی ہے۔

حقیقت میں اِن عقیدوں کا حامل ہونے اور اپنے نفوس میں جذبۂ حق کا احساس رکھنے کے باوجود مسلمانوں کی یہ حالت نہایت تعجب و حیرت کا باعث ہے اور ہمیں مجبور کرتی ہے کہ اُس کے اسباب بھی بیان کریں۔ اس لیے مختصراً کچھ اسباب بیان کئے جاتے ہیں۔

بلاشبہ عقلی افکار دینی عقاید اور تمام معلومات و مدرکات اور لفظی وجدانیات سب تقدیر الٰہی سے صدور میں آتی ہیں۔ اگرچہ یہ اعمال پر اکساتی ہیں۔ لیکن بعد میں اعمال بھی انھیں قوی و پائیدار بناتے ہیں جہاں تک کہ انہیں ملکہ اور خلق سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اُن پر اُن کے مناسب آثار مترتب ہوتے ہیں۔ بالیقین انسان اپنے افکار و عقاید ہی کی بدولت انسان ہے۔ جو چیز اِس کے آئینۂ عقل میں نظر کے مشاہدات اور حواس کے مدرکات سے منعکس ہوتی ہے اس میں نہایت شدید اثر پیدا کرتی ہے۔ اس صورت میں ہر مشاہدہ سے ایک خیال اور ہر خیال سے خواہش میں ایک اثر پیدا ہوتا ہے۔ پھر ہر خواہش سے عمل رونما ہوتا ہے اور عمل سے دوبارہ فکر و خیال کی طرف رجعت ہوتی ہے۔ اس طرح جب تک جسموں میں روحیں باقی رہتی ہیں اعمال و افکار کے درمیان فعل و انفعال کا سلسلہ قایم رہتا ہے۔

عقل کے نزدیک اخوت اور وسائل نسب و قرابت کی بھی ایک صورت معین ہے۔ اگر ضرورت و حاجت حصول منافع میں رشتہ داروں اور وارثوں کے تعاون پر اور دفع ضرر میں اُن کی اعانت و تقویت پر آمادہ نہ کرتی اور اس معاونت پر ایک زمانہ

گزرنے کے بعد قلبی نسبت ایک ایسا ماخذ اختیار کرسکتی جس سے یہ نسبتِ زندگی پھر برانگیختہ ہوتی رہے اور رشتہ کی مدد اور قلب کی بشاشت سے نفس میں انبساط رونما ہوتا رہے تو جو نکبت ونقصان وجدانیات کی طرح محسوس ہوتا رہتا ہے قرابت ورشتہ کو کبھی لاحق نہ ہوتا بلکہ اِس کا معاملہ اتنا شبہ میں ڈال دیتا کہ بعض اہلِ نظر اسے طبعی خیال کرنے لگتے۔

پس اگر صلہ نسب کو اس کے علم و استواری کے بعد چھوڑ دیا جائے اور ضروریاتِ زندگی کسی وقت اِس صلہ کے امکان وتائید کی دعوت نہ دیں یا مقصد اعانت نسب کے علاوہ کسی دوسری شکل سے حاصل ہوسکے تو اِس نسبی رابطہ کا اثر جاتا رہے گا اور عقل میں اس کی صورت صرف روایات ومنقولات کے طور پر باقی رہے گی۔

نسبی رابطہ انسانوں کے درمیان قوی ترین رابطہ ہے جو مثال اس کی بیان کی گئی وہی شان اعتقادات کی ہے جن کا اثر انسانی اجتماع میں ایک دوسرے سے ارتباط کا باعث ہونے کی وجہ سے مسلّم ہے۔

اِس اُصول کے بیان کرنے اور اُس پر نگاہ فراست سے نظر ڈالنے کے بعد اس کا سبب اچھّی طرح واضح ہو جائے گا کہ مسلمانوں میں اتنی مذہبی شدّت کے باوجود جمود کیوں ہے اور وہ اپنے عقاید میں سب سے زیادہ مستقل وثابت قدم ہونے کے باوصف کس لیے اپنے بھائیوں کی مدد سے دور ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے مابین اب وہ پہلی سی جامعیت باقی نہیں صرف دینی عقیدہ ہے جو اپنے لوازم یعنی اعمال سے خالی ہے۔

ان میں باہم تعارف کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور وہ ایک دوسرے سے غیر مستحسن طور پر جدا ہو گئے خود علما جو عقاید کی حفاظت اور لوگوں کی ہدایت پر قایم ہیں باہم راہ رسم اور مراسلت روا نہیں رکھتے پھر عوام کا کیا ذکر ہی۔ ترکی عالم حجازی عالم کے حال سے نابلد ہی۔ ہندی عالم افغانی سلطنت کے احوال سے ناواقف ہی اسی پر دوسروں کو قیاس کر سکتے ہیں۔ بلکہ ایک ہی ملک کے علما میں آپس میں رشتۂ ارتباط اور وجہ اتحاد نہیں پائی جاتی۔ اگر کہیں ہی تو اس کی وجہ عام افراد کے خاص وجوہ مثلاً دوستی یا آپس کی قرابت سے مختلف نہیں۔ غرض ان کی ہیئتِ کلی یہی نظر آتی ہی کہ نہ ان میں کوئی وحدت پائی جاتی ہی نہ کوئی مناسبت۔ ان میں سے ہر ایک اپنی طرف نظر رکھتا ہی اور اپنے ہی مقصد کو سراہتا ہی۔

جیسا افتراق و اختلاف علما میں نظر آتا ہی ویسا ہی مسلمان حاکموں اور بادشاہوں میں دیکھا جاتا ہی۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہی کہ عثمانی (ترکی) بادشاہوں کی کوئی سفارت مراکش میں موجود نہیں نہ مراکش کی سفارت عثمانیوں کے یہاں قایم ہی۔ کیا یہ حیرت کا مقام نہیں ہی کہ دولت عثمانیہ کے صحیح تعلّقات افغانیوں یا مشرق کے اور مسلمان جماعتوں سے نہیں ہیں۔ انہی بے ربطی اور قطع تعلق پیدا کرنے والے امور سے یہ نوبت آگئی ہی کہ اگر یہ کہا جائے کہ مسلمانوں کی ایک قوم سے دوسری قوم میں اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں کوئی علاقہ نہیں ہی تو بالکل صحیح ہوگا۔ صرف ایک تھوڑا سا احساس اس بات کا باقی ہی کہ بعض قومیں ہمارے دین پر

ہیں اور ہمارے جیسا عقیدہ رکھتے ہیں۔ یا کبھی کبھی حج کے زمانہ میں ایک دوسرے سے اتفاقاً مل لیتے ہیں تو کچھ اُس کے خیالات معلوم ہو جاتے ہیں۔

اس نوع کا احساس نہایت تاسف و ملال کا باعث ہے۔ ایک مسلمان اپنی ملت سے بیگانہ اجنبی شخص کے ہاتھوں دوسرے مسلمان کا حق ضائع ہوتا دیکھتا ہے مگر اپنے ضعف کی وجہ سے اس کی مدد کو تیار نہیں ہوتا۔ پہلے ملت اسلام قوی البیان صحیح المزاج زبر دست جسم کی طرح تھی پھر اُس پر ایسے عوارض نازل ہوگئے کہ اُس کے اجزا میں پیوند والتیام کی قوت کمزور ہوگئی اور وہ نوبت آگئی کہ ہر جزو الگ الگ ہوکر جسم کی ہیئت بھی مضمحل ہو جائے۔

ملت اسلامیہ کے روابط میں یہ ضعف و اضمحلال اُسی وقت سے شروع ہو گیا جس وقت خلفائے عباسیہ نے شرف علم فَقَفَّہِ فِی الدِّیْنِ اور مذہب کے اصول و فروع میں اجتہاد کی فضیلت سے قطع نظر کی اور صرف "خلافت" کے نام پر قانع ہو گئے۔ اس طرح انھوں نے علمی مرتبہ کو خلافت کے مرتبہ سے جدا کر دیا اور خلفائے راشدین کے خلاف جو دونوں کے جامع تھے ایک نیا طریقہ اختیار کیا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بکثرت مذاہب پیدا ہوگئے اور تیسری صدی ہجری سے اِس قدر اختلاف شروع ہوگیا کہ کسی دین میں اِس کی مثال نہیں ملتی۔ پھر خلافتِ فاطمیہ اور اطراف اندلس میں خلافتِ امویہ۔ اس طرح اتحادِ ملت کے بجائے افتراق امت کی بنا پڑ گئی اور منصب خلافت گھٹتے گھٹتے بادشاہی بن کر رہ گیا۔ خلافت کی

ہیبت دلوں سے نکل گئی حکومت و سلطنت کے طلبگاروں نے قوت و شوکت کے وسائل سے کام لینا شروع کیا اور منصب خلافت کی رعایت ترک کردی - اختلاف سختی کے ساتھ بڑھ گیا - اس کے بعد چنگیز خاں تیمور لنگ اور اُن کی اولاد کے ظہور اور مسلمانوں پر اُن کے حملوں نے انھیں اتنا تتر بتر کر دیا کہ وہ اپنے آپ ہی کو بھول گئے - اتفاق و اجتماع بالکل رخصت ہوگیا - بادشاہوں اور عالموں سب کے مابین پیوند و ارتباط کے تعلقات قطعاً منقطع ہوگئے - ہر ایک نے اپنے اغراض سامنے رکھے - جماعت اکائیوں میں اور لوگ فرقوں میں تبدیل ہوگئے - ہر ایک نے ایک مبلغ یا داعی کا اتباع اختیار کیا - بادشاہ ہو یا مذہب - ان وجوہ سے وہ عقاید جو وحدت کی دعوت دیتے تھے اُن کے آثار ضعیف ہوگئے - اور عقلوں میں صرف اُن کی ذہنی صورتیں باقی رہ گئیں - جنھیں خیالات احاطہ کیے ہوئے ہیں اُن کو قوتِ حافظہ صرف اس وقت یاد دلاتی ہے جس وقت اُسے اپنی معلومات پیش کرنا ہوں - اب اُن کی نشانیوں میں سوائے حسرت و افسوس کے کچھ باقی نہیں رہا - حسرت و افسوس بھی اُس وقت طاری ہوتا ہے جب بعض مسلمانوں پر مصائب کا نزول ہو چکتا ہے اور ایک مدّت کے بعد اس کی اطلاع پہنچتی ہے - یہ افسوس اسی قسم کا ہے جیسا کہ فوت شدہ چیز پر یا اعزہ و اقارب کی وفات پر رونما ہوتا ہے اور کوئی ایسی تحریک نہیں کرتا جس سے مصیبت کا تدارک ہو سکے -

شارع علیہ السلام کی زبان سے جو حقِ وراثت علما کو حاصل ہی اُس کا حق ادا کرنے کے لیے علما کا فریضہ ہی کہ وہ رابطہ دینی کے احیا کے لیے اپنے اِس اختلاف کا تدارک کریں۔ جو ابنائے دین میں پیدا ہو چکا ہی اور اِس اتفاق کو قایم کریں جس کی طرف دین بلاتا ہی۔ مساجد میں اور اپنے مدارس میں اِس اتفاق پر عہد لیں یہاں تک کہ ہر مسجد اور ہر مدرسہ روحِ وحدت کی منزل اور ہر فرد ایک ہی زنجیر کی کڑی کی طرح بن جائے کہ جب اُس کے ایک سرے کو ہلایا جائے تو اُس کے ہلانے سے دوسرا سرا بھی ہلنے لگے۔ علما۔ خطبا۔ ائمہ۔ واعظین تمام روئے زمین میں ایک دوسرے سے مرتبط و متحد ہو جائیں اور مختلف ممالک میں اپنے مرکز بنالیں کہ مواقع اتحاد پر اُس کی طرف رجوع ہو سکیں۔ عوام کی رہنمائی قرآنِ کریم اور اثر صحیح (حدیث) کے مطابق کریں۔ مختلف مقامات کے مرکزوں کا ایک مرکز کلّی قرار دیں۔ جس پر سب کو جمع کرنے کی سعی کریں یہ مرکز مقاماتِ مقدسہ میں ہو۔ جن میں سب سے اشرف و انسب حرمِ کعبہ ہی۔ اِس طریقہ سے وہ دین کو مضبوط و محفوظ بنا سکیں گے۔ اور دشمنوں کے حملوں سے بچا کر آفات و حوادث کے مواقع پر اُمت کی ضروریات پوری کر سکیں گے۔ اغیار و اجانب کی مداخلت کا خطرہ کم ہو جائے گا اور اشاعتِ علوم اجلائے عقل اور بدعات سے دین کی حفاظت کا مقصد بھی بدرجۂ اتم پورا ہوگا۔ چونکہ روابط کا استحکام علمی مدارج کی تعین اور فرائض کی تقسیم و تجدید سے وابستہ ہی۔ اس لئے اگر کوئی بانی بدعت ظلم و بدعت کا آغاز

کرے تو عوام میں اُس کی ترویج سے پہلے مختلف طبقوں سے مل کر اُس کی بدعت کو مٹایا جاسکتا ہے اور اُس کا تدارک کیا جاسکتا ہے۔ یہ طریقہ اُمّت کی قوّت و اتحاد اور حوادث کے دفعیہ کی قدرت کے لیے جتنا بہتر و مکمل ہے اہلِ بصیرت سے مخفی نہیں۔ مگر ہمیں یہ دیکھ کر انتہائی افسوس ہوتا ہے کہ مسلمان علما و مفکرین کے خیالات اِس وسیلہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ حالانکہ یہ قریب ترین وسیلہ کامیابی ہے۔ غنیمت ہے کہ بعض اربابِ غیرت کا ایک گروہ اِس کی طرف ملتفت نظر آتا ہے۔

ہمیں اہلِ حق اور باحمیت مسلمان بادشاہوں اور عالموں سے توقع ہے۔ کہ وہ اِس گروہ کی تائید کریں گے۔ اور اُن کے افتراق و اختلاف کو دور کرنے والی اور اُن کی جماعتوں میں مرکزیت پیدا کرنے والی صورت بہم پہنچانے سے دریغ نہ کریں گے۔ تجرباتِ اُنھیں کافی سے زیادہ سمجھا چکے ہیں۔ اب اِس کا وقت ہے کہ وہ دور والوں کے پاس اپنے داعی بھیجیں۔ قریب والوں سے مصافحہ کریں۔ ایک دوسرے کے اُن حالات سے واقف ہوں جن سے اُن کے دین و ملّت کا فائدہ متعلّق ہو یا کسی خطر و ضرر کا اندیشہ ہو۔ یقیناً وہ اِس قابلِ عزت طریقہ پر عمل کرکے اپنا فرض ادا کریں گے اور دینی و دنیاوی سعادت کی طلب میں کامیاب ہوں گے۔ اُمیدیں ہمارے سامنے ہیں۔ اور خدا ہی کی طرف ہماری بازگشت ہے۔

چوتھا مقالہ

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ

(اور تم اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں لڑو نہیں ورنہ تم کم ہمت ہو جاؤ گے اور تمہاری ہیبت جاتی رہے گی)

اسلام کی حکومت مغرب اقصےٰ کے مرکز سے تونکان حدودِ چین تک وسیع ہوگئی تھی جس کے درمیان شمال کی طرف قازان اور سراندیپ کے مابین خط استوا کے نیچے بے شمار مسلسل و متصل شہر تھے۔ جن میں مسلمانوں کی سکونت تھی اور اُنھیں ناقابلِ تسخیر غلبہ حاصل تھا۔ بڑے بڑے بادشاہ مسلمان بادشاہ کا لوہا مانتے تھے۔ مسلمانوں نے اپنی شان و شوکت سے کرۂ ارض کو ہلا ڈالا تھا۔ اُن کی فوجیں کبھی شکست نہ کھاتی تھیں۔ اُن کے جھنڈے کبھی سرنگوں نہ ہوتے تھے۔ نہ اُن کی بات کا اُلٹ کر جواب دیا جاتا تھا۔ اُن کے قلعے نہایت مستحکم اور قابلِ دید ہوتے تھے اُن کی چراگاہیں اور سبزہ زار باغ وغیرہ ہموار و وسیع میدانوں میں نہایت سرسبز و شاداب اور طرح طرح کے نباتات اور اشجار سے مالامال نظر آتے تھے جنھیں مسلمانوں کی کاریگری نے عجیب و غریب رنگ دے رکھے تھے اُن کے شہر آباد و مردم خیز تھے۔ اور اُن کی تعمیر ایسی

مضبوط اور قواعدِ مدنیت کے مطابق ہوئی تھی کہ دُنیا کے بڑے سے بڑے شہروں کے باشندوں کی صناعی پر فخر کرتے تھے۔ اِن اسلامی شہروں کو اِن عالی مرتبہ اشخاص کی بدولت افتخار و امتیاز حاصل تھا۔ جو فضیلت و علمیت کے آفتاب و بدرِ کامل اور ہدایت و ادب کے درخشاں ستارے تھے۔ مشرق میں اُن کے حکما میں ابن سینا فارابی اور رازی مرجع علوم بنے ہوئے تھے۔ اور مغرب میں ابن ماجہ ابن رشد اور ابنِ طفیل یا اُن کے مماثل اصحاب کے تفلسف و تفقہ کا ڈنکا بج رہا تھا۔ درمیان میں جو شہر تھے اُن میں قدم قدم پر حکمت طب ہیئت ہندسہ اور تمام علوم عقلیہ کے متبحر فاضل موجود تھے۔ علم و فضل کی یہ افراط علومِ شرعیہ کے علاوہ تھی۔ ورنہ علوم شرعیہ تو اُس زمانہ کے تمام طبقات میں عام تھے۔

ادھر اُن کے عبّاسی خلیفہ نے ایک حکم دیا اُدھر تکفورِ چین (فغفورِ چین) نے سرِ اطاعت خم کیا یہی حال یورپ کے بڑے بڑے بادشاہوں کا تھا۔ کہ ایسے مواقع پر اُن کے بند بند لرز اُٹھتے تھے

اُن کے نامور بادشاہوں میں قرونِ متوسطہ میں محمود غزنوی ملک شاہ سلجوقی صلاح الدین ایّوبی یا مشرق میں تیمور گورگان مغرب میں سلطان محمد فاتح سلطان سلیم اور سلطان سلیمان عثمانی جیسے باجبروت بادشاہ ہو گزرے ہیں۔ جو اگرچہ مر چکے ہیں لیکن ابھی زمانہ اُن کو بھولا نہیں نہ اُن کے آثار محو ہوئے۔

مسلمانوں کے بیڑے اتنے زبردست تھے کہ بحرابیض واحمر اور بحرِ ہند میں کسی کا بیڑا ان کا حریف و ہمسر نہ تھا۔ تھوڑے ہی دن

پہلے تک اِن سمندروں میں اسلامی بیڑے کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ اِن کے حلیف جہاں اِن کی سطوت و دبدبہ کے آگے سر جھکاتے تھے وہیں اُن کے فضل و کمال کے بھی مداح و معترف تھے۔

آج بھی مسلمان اپنے آبا و اجداد سے ورثہ میں پائے ہوئے ملکوں میں بھرے پڑے ہیں۔ اُن کی تعداد دو سو ملین سے کم نہیں ہے۔ ہر ملک میں اُن کے افراد اِن دینی عقاید کے لحاظ سے جو اُن کی گھٹی میں پڑے ہوئے ہیں موت کی طرف قدم بڑھانے میں اپنے ہمسایوں سے زیادہ تیز اور زیادہ بہادر ہیں۔ اِسی لیے وہ تمام انسانوں سے زیادہ زندگی اور اُس کی باطل زیب و زینت کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اور سب سے کم اِس کی پروا کرتے ہیں۔

قرآنِ کریم کی محکم آیات اُن پر اس شان سے نازل ہوئیں کہ اُنھوں نے عقاید کو دلایل کے ساتھ اختیار کرنے کا مطالبہ کیا اور شکوک و اوہام سے بھرے ہوئے۔ عقیدوں کی برائی کی۔ فضایل اور اخلاق اور معقول صفات کی طرف بلایا۔ اُن کے خیالات و افکار میں حق کے جراثیم ودیعت کیے۔ اُن کے نفوس میں فضیلت کے بیج بوئے۔ اِس لیے اُصولِ دین کے لحاظ سے اُن کی عقلیں سب سے زیادہ روشن اُن کے ذہن سب سے زیادہ بیدار اور کمالاتِ انسانی کے حصول میں نہایت قوی الاستعداد ہیں۔ استقامتِ اخلاق میں بھی اُن کا رتبہ برتر ہے۔

چونکہ اپنے آپ کو ایک مخصوص شرف سے مشرف پاتے ہیں اور اِس وعدہ کا احساس رکھتے ہیں جو قرآنِ کریم جیسی سچی کتاب نے

تمام عالم کے مقابلہ میں اُن کے اظہارِ شان کی نسبت کیا ہی خواہ باطل پرستوں کو ناگوار کیوں نہ ہو اس لیے وہ بجز اپنے کسی غیر کا تسلط نہیں مانتے۔ اور اُن میں سے ایک کے خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ اپنے سوا کسی اور صاحبِ سطوت کی اطاعت گوارا کرے خواہ وہ صاحبِ سطوت کتنا ہی زبردست کیوں نہ ہو۔

چونکہ اُن کی اخوت عقاید کے رشتوں سے جکڑی ہوئی ہی اس لیے اُن میں کا ہر ایک یہ گمان رکھتا ہی کہ ابنائے قوم میں سے کسی جماعت کا اجنبیوں کے زیر اثر عاجز و محکوم ہونا خود اُن کے عجز و محکومیت کے مُرادف ہی۔

یہ وہ احساس ہی جس کا شعور وجدانی طور پر ہوتا ہی۔ پھر چونکہ اُن کے نفوس میں اُن کے دین کی تعلیم کے معلومات جڑ پکڑے ہوئے ہیں اور وہ اپنے عنفوانِ اقبال کے دور میں اُن کا بہت بڑا حصّہ حاصل کر چکے ہیں۔ اِس لیئے وہ اپنے آپ کو علم وفضل میں بھی اور لوگوں سے اولی و اعلیٰ خیال کرتے ہیں۔

مگر اِن سب باتوں کے باوجود اب وہ اپنی رفتار میں سست پڑ گئے ہیں۔ بلکہ علموں اور صنعتوں میں دوسروں سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ حالانکہ پہلے یہی دنیا بھر کے اُستاد تھے۔ اُن کے ممالک کی وسعت میں کمی اور اُن کے شیرازہ میں ابتری پیدا ہونے لگی ہی۔ حالانکہ اُن کا مذہب اُن کو حکم دیتا ہی کہ وہ اپنے مخالف کا غلبہ قبول نہ کریں جو استبداد اور خودداری کے ساتھ اُن پر حکومت کرتا ہو۔ بلاشبہ اُن کے دین و استقلال کو نظر لگ گئی ہی اور اب اُن صفات میں

کمی آرہی ہے۔
کیا وہ اللہ کے وعدہ کو بھول گئے ہیں کہ اگر نیک اور صالح رہے تو زمین کے وارث ہوں گے۔ کیا اُنھوں نے اللہ کی اِس ذمہ داری کو کہ وہ تمام شانوں پر انھیں کی شان کو نمایاں کرے گا فراموش کر دیا ہے۔ کیا وہ اِس بات کو بُھلا بیٹھے ہیں کہ اللہ نے اُن کی عظمت بڑھانے کے لیے اُن سے اُن کی جان و مال کو خرید لیا ہے۔ اور جنّت اُن کے لیے مخصوص کر دی ہے۔
ترقیٔ علوم میں کوتاہی اور قوت میں ضعف پیدا ہونے کے متعدد اسباب ہیں۔ جن میں سب سے بڑا سبب طالبانِ حکومت کا اختلاف ہے گو مسلمانوں میں جنسیت صرف مذہب میں ہے تاہم باہمی اختلافات نے ایک ایک قبیلہ میں کئی کئی سردار اور ایک قوم میں کئی بادشاہ پیدا کر دیے۔ جن کی اغراض و غایات ایک دوسرے کے بالکل خلاف ہیں۔ ان سرداروں اور بادشاہوں نے عوام کے خیالات کو اپنے اپنے حریفوں اور دشمنوں کے مقابل مظاہرات پر مبذول کر دیا۔ اور جذبات عالیہ کو غلبہ اور تفوق کے وسائل بہم پہنچانے میں استعمال کیا تاکہ ایک فریق دوسرے فریق کو دبا سکے۔
اِن مقابلوں نے جن سے ایک کا دوسرے پر غلبہ حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے اور جو نزاعوں سے زیادہ مشابہ ہیں اُن کے حاصل کردہ علوم و صنائع کو بھلا دیا اور جو انھوں نے نہ سیکھا تھا اس کی تحصیل میں قصور و کوتاہی پیدا کر دی۔ یہ امور اُن کی ترقی میں حائل ہو گئے اور اُن سے فقر و فاقہ اور افلاس و احتیاج جیسے نتائج برآمد ہوئے ساتھ ہی قوت

میں ضعف اور نظم و انتظام میں خلل پیدا ہو گیا۔ امرا کے اِن باہمی تنازعات نے عام مسلمانوں پر اختلاف و تفریق کا وبال نازل کر دیا جس کی وجہ سے وہ نہ صرف اپنے آپ سے بلکہ اجنبی مداخلت سے بھی غافل ہو گئے۔

یہ ہے امرائے مسلمین کی تباہ حالت۔ اِس حالت میں بمقابلہ سابق کتنا نمایاں نقصان رونما ہے پہلے وہ بڑے بڑے معرکوں اور جنگ کے میدانوں میں مقرر تھے۔ اِن کے سوا کوئی قوم اِن کا مقابلہ نہ کرتی تھی مگر اب مرور زمانہ سے امرا کے نفوس میں فساد پیدا ہو چکا ہے۔ طبائع میں حرص اور طمع باطل گھر کر چکی ہے۔ حرص و ہوا کے ساتھ وہ بھی بدل چکے ہیں۔ لایعنی تعریف عظمت کے حصول اور دوسروں کے لیے بہترین مثال بننے کا شوق اُن کے دلوں سے نکل چکا ہے۔ اب وہ امارت کے القاب اور سلطنت کے ناموں پر قانع ہیں یا اسی قبیل کے خطابات پر راضی ہیں جن سے نام نہاد عزت و تمول کا اظہار ہوتا ہے۔ اس ادنیٰ مقصد کے حصول کے لیے وہ ایسی اجنبیوں کی عادتوں کو اختیار کئے ہوئے ہیں جو قومیت اور مذہب میں اُن کے خلاف ہیں۔ اپنے ہی ابنائے ملّت پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے اُن اغیار سے مدد کی بھیک مانگتے ہیں اور اُس میں ذرا نہیں شرماتے حالانکہ یہ عارضی عزت و تفوق نہایت سریع الزوال نعمت ہے ؂

؂ ؂ ؂

؂ ؂

؂

نسب و وطنیت کے متعلق ایک جُداگانہ بیان

حسبِ ذیل خُلاصہ ایک کتاب کے مسودہ سے حاصل کیا گیا ہے جو سیّد عبدالجبّار شاہ صاحب سابق والیٔ ریاست صوات مرتّب کر رہے ہیں۔

صاحب موصوف سے سیّد جمال الدین افغانی کی وطنیت اور خاندانی حالات کے متعلق کئی بار جو گفتگو ہوئی اُس کا ماحصل یہ سطور ہیں۔

میں نے اِن اوراق کو بطور ضمیمہ شایع کرنا اس لیے ضروری سمجھا کہ اِس سرگزشت کے بعض ایسے پہلو بھی جو میری تحقیقات کے دائرے میں شامل نہیں ہیں، واضح ہو جائیں۔

میں موصوف کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اُنھوں نے میری اِس جدوجہد میں گہری دلچسپی کا اظہار فرمایا۔

وادی کنڑ کے خاندانِ سادات کا حال جس کے مورثِ اعلیٰ سیّد علی ترمذی ہیں، سیّد عبدالجبار شاہ صاحب نے اپنے مسودہ میں اِس طرح بیان کیا ہے:

"قطب الاقطاب حضرت سیّد علی ترمذی قدس سرّہ غوث بونیر بن امیر نظر بہادر سیّد قمر علی مرزا بن سیّد احمد نور۔ بن سیّد یوسف نور

بن سیّد محمد نوربخش ترمذی بن سیّد احمد بیغم بن سیّد احمد بداق بن سیّد احمد مشتاق ۔ بن سید شاہ ابو تراب ۔ بن سید حامد بن سید محمود ۔ بن سید اسحاق ۔ بن سیّد عثمان ۔ بن سید جعفر ۔ بن سید عمر ۔ بن سید محمد ۔ بن سید حسام الدین ۔ بن سید شاہ ناصر خسرو ۔ بن سید جلال گنج العلم بخاری قدس سرہ العزیز بن ابو المؤید ۔ حضرت امیر علی جن کا نسب پانچویں پشت میں حضرت علی نقی امام ادھم ائمہ اہلِ بیت سے ملتا ہے جو فرزند تھے حضرت امام محمد تقی کے اور وہ فرزند حضرت امام علی رضا کے تھے اور وہ حضرت امام موسیٰ کاظم کے فرزند تھے اور وہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے فرزند تھے اور وہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے فرزند تھے اور وہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے فرزند تھے اور وہ حضرت امام ابو عبد اللہ الحسین شہید دشتِ کربلا علیہ السلام کے فرزند تھے اور آپ حضرت امیر المومنین اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالب کرّم اللہ وجہہ اور حضرت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرٰی بنتِ محمد الرسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرزند تھے رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین ۔

حضرت سیّد علی ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کا خود فرمودہ بیان

آپ کے مادون اخوند درویزہ علیہ الرحمۃ نے اِس طور سے لکھا ہے کہ آپ اصلاً ترمذی ہیں اور وطناً قندز کے باشندے اور خواہرزادگانِ سلطان ظہیر الدین میں سے ہیں ۔ فرمایا کرتے تھے کہ "اُن کے والد بزرگوار مرزا سید قمر علی بہ سبب نسبت نسب داری ہمراہِ سلاطین دنیوی منصب اختیار کر چکے تھے ۔ لیکن جدِّ بزرگوار

امام المسلمین سیّد الدنیا والدین سیّد احمد بن سیّد یوسف اپنے آباؤ اجداد کے طریقہ مرضیہ پر نسباً اور سجادۂ سلسلہ کبرویہ پر اذناً مستقیم رہ کر دنیوی امور سے بے تعلق رہے۔ والد کو شہنشاہ کی طرف سے لقب امیر نظر بہادر کا ملا ہوا تھا۔ اور آباؤ اجداد کے طریق زہد و ریاضت کو ترک کیے ہوئے تھے۔ اس لیے جدّ بزرگوار کی نظر انتخاب اُس وراثت آبائی کی سپردگی کی نسبت اپنی تمام اولاد میں سے بچپن سے حضرتِ ترمذی پر مبذول رہتی تھی۔"

اِن روایات اور اسناد کے بموجب جو زیرِ نظر مسودہ میں پیش کی گئی ہیں حضرت سیّد علی ترمذی سے سید جمال الدین افغانی تک سلسلۂ نسب اس طرح قایم ہوتا ہے:-

سیّد علی ترمذی
|
سیّد مصطفٰے
|
سیّد عبد الوہاب
|
سیّد جمال الدین عرف سیّد جمال
|
سیّد ظہیر الدین
|
سیّد زین العابدین
|
سیّد رضی الدین
|
سیّد اعلی
|
سیّد صفدر
|
سیّد جمال الدین افغانی

اس طرح شیخ کے نسب نامہ کی ساتویں پشت میں سیّد جمال الدین کا

نام آتا ہے جو وادیٔ کنڑ میں آباد ہوئے اور جن کے خاندان سادات کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ بقول عبدالجبار شاہ صاحب سلاطین کابل اپنی لڑکیوں کا اُس خاندان سے رشتہ کرنا اپنے لیے باعثِ شرف و افتخار سمجھا کرتے تھے۔ چنانچہ اُس زمانہ میں جس کی کوئی مستند اور مفصّل تاریخ میسر نہیں آتی، کہا جاتا ہے کہ حدودِ چترال سے لے کر ضلع ننگرہار تک کنڑ پر خاندانِ سادات کی خود مختارانہ حکومت قایم تھی اور اُس خاندان کے اِس دور میں بڑے بڑے علما فضلا گزرے ہیں جن میں سے سیّد جمال الدین شیخ الاسلام کا نام آج تک مشہور ہے۔ امیر حبیب اللہ خاں کے زمانہ میں اِس خاندان میں شاہی خاندان کی لڑکیاں بیاہی جاتی رہی ہیں۔ چنانچہ شیخ پادشاہ میر صاحب جان سے جو اخوند صاحب ہڈّہ کے جانشین بھی تھے، امیر حبیب اللہ خان نے اپنی دو لڑکیوں کی شادی کی تھی۔

اِس خاندان کے موجودہ حالات بیان کرتے ہوئے فاضل مؤلف نے اپنے مسودہ میں بعض دلچسپ تفصیلات بیان کی ہیں، مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ :-

"سید جمال الدین افغانی، کا نسبی معاملہ اس قدر روشن اور واضح ہے کہ اُس کا چھپانا یا اُس کے متعلق کسی مغالطہ میں پڑنا ناممکن ہے۔ ابھی اسی زمانہ کا واقعہ ہے جب کہ اُن کی وفات پر صرف (۴۲) سال گزرے ہیں کہ اُن کا عظیم المرتبت خاندان اب بھی وادی کنڑ میں اور بونیر و صوات میں ہزار ہا نفوس پر مشتمل موجود ہے جو سلاطین کابل کے تعلقداران اور شریک رشتہ مانند سید محمود شاہ پاشا اور

میر صاحب جان شیخ پاشا کے ہوتے ہیں۔ وادی کنڑ میں سادات کی آبادی دو جگہ ہے۔ ایک گاؤں سادات کا موضع پشت ہے جو سید مصطفےٰ بن سید علی ترمذی کا گاؤں ہے جس کے متصل دوسرا محلّہ سادات کا سید آباد نام اب بھی موجود ہے جس کو ایران کا سید آباد بنا لیا گیا ہے۔ دوسرا مستقر سادات کا کنڑ کے جنوب مغرب میں اسلام پور نام ہے۔ جس میں میر صاحب جان شیخ پاشا کے خاندان کی شاخ مقیم ہے پشت والا خاندان فرمانروائے ملک تھا اور افغانستان کا لشکر اُن کا ماتحت تھا۔ امرائے کابل کے زیر حکومت یہ لوگ پورے محکوم نہ تھے بلکہ درجۂ مساوات کا رنگ تھا جب ہی تو سید محمود پاشاہ کے ساتھ امیر دوست محمد خاں نے رشتہ دے کر وحدت پیدا کی تھی۔ سید محمود پاشا کا ویران شدہ قلعہ اب بھی پشت میں موجود ہے جو ویران پڑا ہے جس کو اُس مُلک کے لوگ عقل تمام قلعہ کہتے ہیں۔ اور اسی پشت کے مرکز کے ایک محلّہ کا نام سید آباد ہے جس میں سید افغانی کی ولادت ہوئی مگر اُن کے والد کو مانند سید محمود شاہ پاشا کے امرائے کابل کنڑ سے جلا وطن کر کے کابل لے گئے۔

وطنیت اور نسب کی اس بحث میں فاضل مؤلف نے ایک دلچسپ دلیل یہ بھی پیش کی ہے کہ :-

"اسی شجرہ میں سید علی ترمذی سے اوپر اُن کے اجداد کی اٹھارھویں پشت میں ایسا ہی عظیم الشان شخصیت کا مالک سید جلال گنج العلم بخاری بن ابوالموید امیر علی پایا جاتا ہے جس کی ابویت پر حضرت سید علی ترمذی کو ایسا ہی فخر و افتخار تھا جیسا کہ سید علی ترمذی کی اولاد کو سید علی پر

فخر ہی۔ وہ اپنے عہد کا عظیم الشان انسان گزرا ہی جس کا ذکر بے شمار کتبِ تصوف و تذکرات مشائخ کبار میں ہی۔ بلکہ تاریخ فرشتہ میں بھی سید جلال الدین بخاری کا ذکر نہایت مفصل ہی اور ۸۰۰ھ میں اُن کے موجود ہونے کا ذکر ہی۔ اِس سید جلال الدین گنج العلم کی مملکت افغانستان میں دس بارہ مقامات پر نشست گاہیں موجود ہیں جہاں ہر جگہ قبر بنی ہوئی ہی اور ہر جگہ یہ دعویٰ موجود ہی کہ یہاں وہ مدفون ہیں مگر در اصل وہ نشست گاہیں ہیں۔ زمانہ آپ کا ۸۰۰ھ کا تھا۔ آپ کی والدہ سلطان محمود خدا بندہ شاہِ بخارا کی ہمشیرہ تھی۔ پھر آپ کے ماموں نے اپنی بیٹی بھی آپ سے بیاہ دی جس سے آپ کے دو فرزند توران میں رہ گئے۔ آپ پھر افغانستان و ہندوستان وکشمیر وغیرہ ممالک میں چلے آئے۔ اُن دونوں فرزندوں کی اولاد میں سے سید محمد نوربخش ترمذی جد سید علی ترمذی ترمذ میں تھے۔

الغرض بوجہ بُعدِ مملکت دوُر کے لوگ اِس سلسلہ سے تو بے خبر ہیں مگر افغانستان میں کُل اہلِ علم اِس حقیقت سے آگاہ ہیں۔ ایسا ہی مغالطہ مفتی محمد عبدہ کو ترمذی کے نام سے لگا ہی کہ وہ صاحب مصنف جامع ترمذی ہی۔ اِس بارہ میں نہ تو سید افغانی کی طرف ایسی فاش بے علمی منسوب کی جاسکتی ہی اور نہ ہی مفتی عبدہ کی طرف کہ وہ علم حدیث کے اُن اعظم مصنّفین کے نام اور نسب حسب سے بے خبر تھے یا اُن کو معلوم نہ تھا کہ مصنف جامع ترمذی جس کا نام محمد بن عیسیٰ اور جس کو ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ بن موسیٰ حافظ لکھا ہوا ہی، ان سید علی ترمذی سے جُدا ہیں...

معلوم ہوتا ہو کہ بے خبری میں کسی نے مرزا لطف اللہ کی مانند یہ غلطی بھی کر دی ہو۔ میں نے ایک جیّد عالم سے سُنا ہو کہ یہ غلطی جرجی زیدان ایک مسیحی عالم سے ہوئی ہو اور قرینِ قیاس ہو کہ ایسا ہی ہوُا ہو کیونکہ کوئی مسلمان عالم تو ایسی غلطی ایک درسی کتاب کے مصنّف کے متعلق نہیں کرسکتا۔ ثابت یہ ہوتا ہو کہ لطف اللہ سات پشت سادات کنٹر کی صحیح شمار کرکے جو ۱۱۰۰ھ ہجری تک ہو پھر سید علی ترمذی کی روایت سے کود کر ایک دم ۶۰۰ھ ہجری میں سید جلال گنج العلم تک جا پہنچتا ہو۔ حقیقت یہ ہو کہ سید افغانی کا ساتواں جد سید اصیل الدین سید جمال الدین اوّل کا بیٹا تھا جو سید عبد الوہاب بن سید مصطفٰے بن سید علی ترمذی کا فرزند تھا۔

مرزا لطف اللہ نے مقالاتِ جمالی میں مذکورہ غلطیوں سے بڑھ کر ایک غلطی کا ارتکاب کیا ہو کہ سید کے خط کا عکس ایک جگہ دیا ہو جس کی طرزِ تحریر کابلی طرزِ تحریر ہو مگر ایک عربی شعر لکھ کر دستخط کے علاوہ لکھا ہو کہ یہ شعر خود سید کا تصنیف کردہ ہو حالانکہ وہ ایک تاریخی شعر یزید بن معاویہ۔ قاتل اہلِ بیت کا ہو؛

اِس کے بعد موصوف نے اپنے بیان میں بعض دوسرے امکانات کو بھی مسترد نہیں کیا ہو بلکہ اِس امکان کو تسلیم کرتے ہوئے کہ: "شیخ کے والدین نے کنٹر سے جلا وطنی کے بعد اسد آباد جاکر سکونت اختیار کرلی ہوگی"۔ اِس امر پر اصرار کیا ہو کہ "سید صفدر کا اپنے خاندانِ سادات کنٹر سے تعلق منقطع نہیں ہوُا تھا اور سلاطین افغانستان بھی اُن کو اکابر سادات کنٹر میں سے ہی یقیناً جانتے پہچانتے

ہیں۔ ممکن ہے کہ سید کی ولادت ایران میں ہوئی ہو اور بعدِ بلوغ وہ اپنے ملک میں آگئے ہوں ......"

محترم مؤلف نے اپنے مسودہ میں سید علی ترمذی کے خاندانی حالات کے سلسلے میں اُن تعلقات کا بھی ذکر کیا ہے جو اِس خاندان کے زمانۂ قدیم میں افغانستان اور ہندوستان سے قایم تھے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :-

"جدِّ بزرگوار حضرت سید علی ترمذی نے میدانِ پانی پت میں شہنشاہ بابر کی سلطانِ ابراہیم لودی پر فتحیابی کے بعد اُن ہی دنوں میں ترک تعلقات دنیوی کر کے طلب راہِ مولیٰ میں مجاہدات اختیار کیے۔ مذکورہ واقعۂ فتحِ ہند ماہ اپریل ۱۵۲۶ء مطابق ۹۳۲ھ ہجری میں ہوا تھا۔ اِس حساب سے آپ کی ولادت تخمیناً ۹۰۰ھ مطابق ۱۵۰۰ء کے درمیان یعنی ہر دو صدیوں کے ابتدائی دو چار سالوں میں ہوئی ہوگی۔ آپ کا مولد شہر قندز ملک ترکستان و بدخشاں تھا اور ۹۹۲ھ میں آپ نے وفات پائی۔ اِس حساب سے حضرت کی عمر کل دسویں صدی ہجری اور سولھویں صدی عیسوی پر حاوی تھی۔ اور ایک صدی سے آٹھ نو سال ہی کم تھی۔ اس طرح ابتدا اِن حالات کی جن تاریخوں سے ہوئی وہ بھی معلوم ہیں اور قریب ایام کی تاریخیں خود بوجہ قربِ زمانہ معلوم ہیں"

اِس مسودہ میں سید علی ترمذی کے بعد اُن کے جانشینوں کے حالات بھی مثل سیّد مصطفیٰؒ و دیگر اکابر کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ اور شجرہ نسب کو قدم بقدم سید جمال الدین افغانی تک پہنچا دیا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ میرے مسودہ کی طباعت شروع ہوچکی ہے

اس لیے میں سید عبدالجبار شاہ صاحب کے بیان کے ہر پہلو پر بحث نہیں کرسکتا تاہم یہ میں نے ضروری سمجھا کہ اِس بیان کے بعض اجزا کو اِن اوراق کے ساتھ منسلک کردوں۔ ممکن ہے کہ میرے بعد مجھ سے زیادہ وسیع النظر ارباب ذوق اِس بیان کے مختلف گوشوں میں مزید تحقیق و جستجو کے راستے پیدا کرسکیں ؛

؛ ؛ ؛

؛ ؛

؛

کُتب

جن سے ترتیب کتاب کے دوران میں مدد لی گئی

عربی، فارسی و اُردو

احمد میاں اختر (قاضی) — علم اور اسلام۔ طبع معارف پریس۔ اعظم گڈھ ۱۹۳۵ء

ادیب اسحٰق۔ — الدُّرر۔ طبع مصر

اصمعی — آثار جمال الدین افغانی ۔ ۱۹۰۱ء

اعتماد السلطنۃ — المآثر و الآثار

بطرس البستانی — دائرۃ المعارف ۱۸۸۰ء

جرجی زیدان — اشہر مشاہیر الشرق

جمال الدین افغانی — تتمۃ البیان فی تاریخ افغان۔ طبع مصر ۱۹۰۱ء

حسین محی الدین الجبال — مضامین عروۃ الوثقیٰ۔ طبع مصر۔ ۱۹۱۰ء

حیات خاں — تاریخ دینی حیات خان افغان

سعید پاراں — جمال الدین افغانی

سلطان محمد خان — تاریخ سلطان محمد خاں بارکزئی افغانی

شکیب ارسلان — حاضر العالم الاسلامی

رشید رضا (علامہ) — تاریخ الاستاذ الامام (مفتی عبدہ)

عبدالرحمٰن قرقوتی — البیان (قاہرہ)

علی فکری	سُبل النجاح - جلد ۲
فرید وجدی	دائرۃ المعارف - طبع مصر - جلد ۳
لطف اللہ	شرح حال و آثار سید جمال الدین - طبع برلن سنہ ۱۳۰۴ھ
محمد عبدہ (مفتی)	دیباچہ - رد علی الدہرین
محمد علی توفیق بک	رسمدار (استانبول)
محمد محلاتی	گفتار خوش یارقلی - طبع مطبع علویہ نجف سنہ ۱۳۴۰ھ
مصطفٰی عبد الرزاق	دیباچہ مضامین عروۃ الوثقٰی - طبع مصر - سنہ ۱۳۴۶ھ
ناظم الاسلام کرمانی	تاریخ بیداری ایران - جلد اوّل
———	تتمۃ البیان - از صاحب جریدۃ العلم - مصر - سنہ ۱۳۱۸ھ
———	سوانح جمال الدین (برلن)
———	بیوک ادم لر - از جمعیۃ علمی تورک - طبع استانبول
———	خزائنۃ الایام (امریکہ)

* * *
* *
*

جراید و رسائل

عربی، فارسی، اُردُو

اخبار عام - لاہور	اگست سنہ ۱۸۸۴ء
الاہرام - مصر	شمارہ ۳۶۶۷، مورخہ ۲۴ حمل سنہ ۱۳۱۲ھ
ابونظارہ - پیرس	۲۹ر فروری سنہ ۱۸۸۳ء
المقتطف - قاہرہ	۲۵ر دسمبر سنہ ۱۹۲۴ء جلد ۳
الہلال -- مصر	
اودھ اخبار لکھنؤ	سنہ ۱۸۸۴ء
ایرانشہر - برلن	۱۸ر ستمبر سنہ ۱۹۲۳ء
آئینہ - کلکتہ	اکتوبر و نومبر سنہ ۱۹۳۲ء
ترک یوردی قسطنطنیہ	شمارہ ۵-۱-۲-۳ - جلد ۳ - شمارہ ۸ جلد ۶
جہانِ اسلام قسطنطنیہ	
حبل المتین - کلکتہ	
دار السلطنت - کلکتہ	سنہ ۱۸۸۴ء
سراج الاخبار - کابل	
صور اسرافیل - طہران	۷ر جولائی سنہ ۱۹۰۸ء

عُروۃ الوثقیٰ ۔ پیرس	
کابُل ۔ (مجلّہ) کابل	۷ر جولائی سنہ ۱۹۳۱ء
کاوہ ۔ برلن	۱۱ر جنوری سنہ ۱۹۲۱ء تا ۹ ستمبر سنہ ۱۹۲۱ء
مشیرِ قیصر ۔ لکھنؤ	سنہ ۱۸۸۴ء
مصر ۔ اسکندریہ	۵ر جمادی الاول سنہ ۱۲۹۶ھ ہجری
مصور (جریدہ) استنبول	سنہ ۱۹۲۷ء
معارف ۔ اعظم گڑھ	مئی سنہ ۱۹۲۲ء
معلّم ۔ حیدرآباد دکن	
معلّم تشفیق ۔ حیدرآباد دکن	
ملّت ۔ قسطنطنیہ	سنہ ۱۹۲۶ء
وطن ۔ قسطنطنیہ	۳۰ر اگست سنہ ۱۹۲۴ء ۔

٭ ٭ ٭

٭ ٭

٭

اشاریہ

ا

ب

پ

ت

ٹ

ج

چ

ح

خ

د

ڈ

ذ

ر

س

ش

ص

ض

ط

ظ

ع

غ

ف

ق

گ

ن

ھ

ی

